CARE LIST APPROVED PEER REVIEWED & REFEREED JOURNAL ISSN 2320-3781

نقشِ نو

۲۰۲۳ء۔۲۰۲۴ء

سالانہ عالمی اردو جریدہ

(سرسید نمبر)

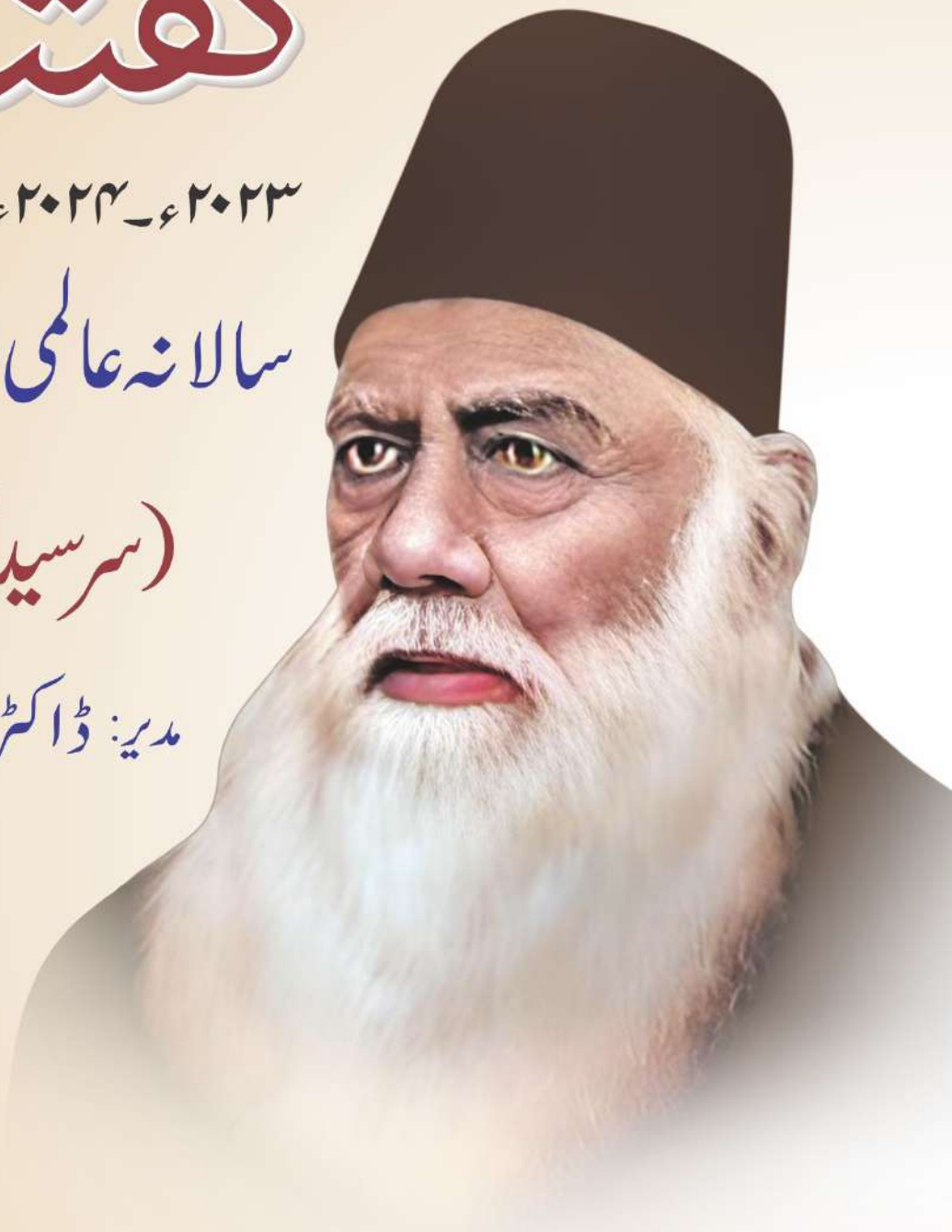

مدیر: ڈاکٹر ناصحہ عثمانی

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگراج

الہ آباد یونیورسٹی

نقشِ نو

(سرسید نمبر)

سالانہ عالمی اردو جریدہ

شمارہ: شش دہم

۲۰۲۳ء۔۲۰۲۴ء

مدیر: ڈاکٹر ناصحہ عثمانی

نائب مدیر: ڈاکٹر زرینہ بیگم

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگ راج

الہ آباد یونیورسٹی، یو۔پی۔انڈیا

'نقشِ نو' سالانہ عالمی اردو جریدہ۔شمارہ شش دہم

یو۔جی۔سی۔CARE لسٹ میں منظور شدہ جریدہ

سرپرست: مسز تزئین احسان اللہ　　**اعزازی مدیر:** پروفیسر عبدالحق

مدیر: ڈاکٹر ناصحہ عثمانی　　**نائب مدیر:** ڈاکٹر زرینہ بیگم

مجلسِ مشاورت:

ڈاکٹر مامون ایمن (نیویارک)　　پروفیسر شبنم حمید (پریاگ راج)

ڈاکٹر عارف نقوی (جرمنی)　　ڈاکٹر ندرت محمود (پریاگ راج)

ڈاکٹر محمد آصف علی (ماریشس)　　ڈاکٹر شبانہ عزیز (پریاگ راج)

پروفیسر اسلم جمشید پوری (میرٹھ)　　ڈاکٹر صدیقہ جابر (پریاگ راج)

پروفیسر احمد محفوظ (دہلی)　　ڈاکٹر فرح ہاشم (پریاگ راج)　　پروفیسر یوسفہ نفیس (پریاگ راج)

کمپیوٹر کمپوزنگ: روزینہ انصاری

ناشر: شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، نوراللہ روڈ، پریاگ راج۔یو۔پی۔انڈیا

فون نمبر: 0532-2978600　**موبائل نمبر:** 7007400501- 9559258741

ای میل: naqshenauurdu@gmail.com

ISSN 2320-3781 Naqsh-E-Nau

قیمت: اندرونِ ملک 200 روپے، بیرون ملک 20 ڈالر (ڈاک خرچ الگ)

'نقشِ نو' کے مشمولات میں ظاہر کردہ نفسِ مضمون سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

(جملہ حقوق بحقِ شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج محفوظ ہیں۔)

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۱۔	حرفے چند	پروفیسر ناصحہ عثمانی	
۲۔	''سرسید مشن'' وقت کی اہم ضرورت	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۵
۳۔	سرسید اور الہ آباد کے تعلیمی رشتے	پروفیسر صالحہ رشید	۹
۴۔	سرسید اور اسباب بغاوتِ ہند	ڈاکٹر زرینہ بیگم	۲۲
۵۔	سرسید احمد خاں	ڈاکٹر شبانہ عزیز	۲۷
۶۔	سرسید احمد خان کی خطوط نگاری	ڈاکٹر ناظم الدین منور	۳۳
۷۔	سرسید احمد خاں کے تعلیمی افکار و خیالات	ڈاکٹر داؤد احمد	۴۶
۸۔	سرسید احمد خان کا تصور تربیت اطفال	ڈاکٹر نیلوفر حفیظ	۵۰
۹۔	سرسید کا نظریہ ''تعلیم نسواں''	ڈاکٹر شیخ عمران	۵۶
۱۰۔	سرسید احمد خان: اردو میں جدید تاریخ نویسی کے بانی	ڈاکٹر نزہت فاطمہ	۶۰
۱۱۔	سرسید کی نثر نگاری	ڈاکٹر عبدالواسع ندوی	۶۵
۱۲۔	مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' تاثراتی جائزہ	ڈاکٹر عارفہ بیگم	۶۸
۱۳۔	سرسید اور اردو صحافت	ڈاکٹر ناہیدہ خاتون	۷۰
۱۴۔	علی گڑھ تحریک سے متاثر افسانوں میں مستورات کی عکاسی	ڈاکٹر وصی احمد اعظم انصاری، عافیہ حمید	۷۴
۱۵۔	ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی بہتری اور ترقی میں سرسید احمد خان کا تعاون	ڈاکٹر تبسم نگار	۷۹
۱۶۔	متحدہ قومیت کا تصور اور سرسید احمد خاں	رخسار پروین	۸۶
۱۷۔	سرسید احمد خان اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق''	ڈاکٹر کہکشاں عرفان	۹۲
۱۸۔	ہندوستانی نشاۃ الثانیہ اور سرسید	محمد فیاض	۹۶
۱۹۔	گردشِ ایام میں سرسیّد کا درخشندہ کردار	محمد ریحان الحق	۱۰۱
۲۰۔	اردو زبان و ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات	نہاں	۱۰۵
۲۱۔	سرسید احمد خان کی انفرادیت	زینت خاتون	۱۱۱
۲۲۔	اشاریہ نقش نو (الہ آباد) (۲۰۰۸۔۲۰۲۲)	ڈاکٹر سید مسعود حسن	۱۱۵

حرفے چند

علم وہ طاقت ورہتھیار ہے جس میں ساری دنیا کو بدل دینے کی صلاحیت ہے اور ہمارے رہنما اور علی گڑھ کالج کے بانی سرسید احمد خاں نے اس علمی انقلاب کو پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی بغاوت کی ناکامی کے بعد رہنمائے ہند یہ سوچنے کے لئے مجبور ہوئے کہ ہمارے ملک وقوم کی فلاح کس میں ہے؟ چنانچہ سرسید اور رفقائے سرسید نے ملک وقوم کی علمی بیداری کا بیڑا اٹھایا اور اپنی تمام تر فکری و قلمی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک اور قوم کی بدحالی کو دور کرنے کی کوشش کی جس کے لئے انہیں نہ صرف قربانیاں دینی پڑیں بلکہ سخت مشقتوں اور رسوائیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن ان کے پائے استقامت ڈگمگائے نہیں کیوں کہ ان کا عظم مستحکم انہیں ٹوٹنے نہیں دیتا تھا۔ آج ان کی کاوشوں کے ثمرے سے تمام دنیا کے لوگ فیض یاب ہوتے ہیں۔

'نقش نو' کا سولہواں شمارہ اس عظیم شخصیت کے نام ہے جس کے ذریعہ ان کی ادبی علمی خدمات کو برسر عام لانے کی حقیر کوشش کی گئی ہے اس مختصر سے شمارے میں ان کی تمام خدمات کا احاطہ تو ناممکن تھا لیکن اگر ہماری نئی نسل کے نوجوان اور محققین کو اس شمارے کے ذریعہ سرسید کے فن اور شخصیت کے کسی پہلو کی باریکیوں کو سمجھنے میں چنداں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو 'نقش نو' کی مجلس ادارت یک گونہ تقویت حاصل کرے گی۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری نئی نسل کے لکھنے والے بھی اپنے مضامین لکھنے میں کافی عرق ریزی کرتے ہیں ان کی حوصلہ افضائی ان کی تحقیقی صلاحیتوں کو مزید باریکیوں کی جانب رواں کرے گی 'نقش نو' کی مجلس ادارت ان تمام لوگوں کی شکر گزار ہیں جن کے قلمی تعاون نے 'نقش نو' کے اس شمارے کو زینت بخشی۔ جناب مسعود حسن صاحب کا خصوصی شکریہ جنہوں نے 'نقش نو' کا اشاریہ تیار کر کے قارئین و محققین کے لئے مزید رہبری فراہم کی۔

شکریہ

ناصحہ عثمانی

مدیر

''سرسید مشن'' وقت کی اہم ضرورت

سرسید احمد خان کا تعلق یوں تو انیسویں صدی سے ہے لیکن انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، ان کی بنا پر آنے والی ہر صدی کے لئے معتبر و مستند بن گئے ہیں۔ سرسید کے کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ وہ صحافی تھے، ادیب تھے، ماہرِ تعلیم، مفکر اور دانشور بھی تھے۔ اسلام کی تعلیمات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اسلام کے سچے پیروکار بھی تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے قوم کی تعلیم کی نہ صرف فکر کی بلکہ عملی جدوجہد بھی کی۔

قوم و ملک کو بیدار کرنے کے لئے سرسید احمد خاں نے علی گڑھ تحریک کی بنیاد رکھی۔ جس نے زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کی۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ افراد خاص کر سرسید کے ساتھی اپنے آپ میں ایک ادارہ تھے۔ سب نے مل کر سرسید کا ساتھ دیا اور ان کی رہنمائی میں قوم کو قعرِ مذلت سے نکال کر تعلیم کی راہوں پر گامزن کیا۔

سرسید احمد خاں کی زندگی میں انگلستان کے سفر کی بڑی اہمیت ہے۔ وہاں جا کر آپ نے انگریز قوم کی ترقی اور خوشحالی دیکھی۔ پوری دنیا پر حکومت کرنے اور سب کو اپنا غلام بنانے کا راز پالیا تھا۔ دورانِ سفر انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری کو ایک خط میں لکھا تھا۔

> ''اس تمام ترقی کا باعث انگلستان میں یہ ہے کہ تمام چیزیں، تمام علوم، تمام فن جو کچھ ہے اسی قوم کی زبان میں ہے جو عموماً یا قریب عموماً کے بولی جاتی ہے۔ انگریزی کو اسی انگلستان میں بعض مقاموں کی زبانیں ایسی گنواری ہیں جن پر انگریزی کا اطلاق کرنا مشکل ہے۔ مگر انگریزی زبان انگلستان میں ایسی ہے جیسی ہندوستان میں علی الخصوص شمال مغربی اضلاع اور صوبہ بہار میں اردو ہے جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام اعلیٰ علوم سے لے کر ادنیٰ تک ان ہی کی زبانوں میں دیے جاویں۔''

[سرسید کا سفرنامہ مسافرانِ لندن، مرتب اصغر عباس، ص ۱۵۸]

وقت کی پابندی، کام کو عبادت ماننا، انصاف، صاف صفائی، تعلیم کی اہمیت، نصب العین، ڈسپلن اور ایمانداری وغیرہ ایسے رازہائے زندگی تھے جن کی بدولت انگریز پوری دنیا پر قابض تھے۔ اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھے۔ اس کے مقابلے ہم ہندوستانی ہر معاملے میں صفر تھے۔ اور ہم ہارے ہوئے جواری کی مانند ہاتھ پر ہاتھ رکھے، تقدیر کے بھروسے بیٹھے تھے۔

انگلستان سے واپسی کے بعد سرسید اپنی قوم کا مستقبل سنوارنے میں لگ گئے۔ انہوں نے تہذیب الاخلاق نامی رسالہ نکالا۔ سائنٹفک سوسائٹی قایم کی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کی۔ ایک جدید مدرسے ''مدینۃ العلوم'' کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر اے ایم یو کی شکل میں ایک تناور درخت کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور قوم و ملک کے لئے فیض کا ایک دریا ثابت ہوا۔

سرسید نے دورانِ سفر، یورپ کے اسکول، کالج، یونیورسٹی، بڑی بڑی عمارتیں، بازار، خوبصورت بسیں، ریل گاڑیاں، اپنے حقوق کے لئے بیدار شہری، تعلیم کے زیور سے آراستہ فیشن ایبل خواتین وغیرہ دیکھیں۔ سرسید اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> ''اگر ہندوستان میں کوئی عورت بالکل برہنہ بازار میں پھرنے لگے تو ہمارے ہم وطنوں کو کیسا تعجب اور کس قدر

پروفیسر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

حیرت ہوگی، بلا مبالغہ یہ مثال ہے کہ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور حلیہ تربیت اور زیور تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو ایسا ہی تعجب ہوتا ہے اور کمال نفرت اور کمال حقارت ان کے خیال میں گزرتی ہے''

[سرسید کا سفرنامہ مسافرانِ لندن، مرتب اصغر عباس، ص ۱۵۲]

سرسید کے خط کے اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ سرسید کے دل میں تعلیم کی کیا اہمیت تھی۔ خاص کر وہ عورتوں کی تعلیم کے لئے بھی فکرمند اور سنجیدہ تھے۔ سرسید نے وقت کی ضرورت اور مصلحت کو سمجھا تھا۔ اس لئے انہوں نے وقتی طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ان پر ہمارے ملک کے بعض مورخ انگریزوں سے مصالحت، کا الزام لگاتے ہیں۔ سرسید اپنی قوم کو اور انگریزوں کو بخوبی جانتے تھے۔ ایک طرف پسپا اور دوسروں کے رحم وکرم پر قسمت کے سہارے ، کسی طرح وقت گذارنے والی قوم تھی۔ دوسری طرف دنیا پر حکومت کرنے والی سب سے طاقتور انگریز قوم تھی۔ اس لئے انہوں نے مصلحت سے کام لیا اور ۱۸۵۷ کے بعد پسپا قوم کی ذہنیت رکھنے والے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی بدحالی کو سمجھا۔ دوسری طرف اپنے اور ملک کے سب سے بڑے دشمن انگریزوں کو سمجھنے اور جاننے کے لئے مصلحتاً قربت بنائی۔ قوم وملک کو بیدار کیا اور ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا، جس کے فارغ طالب علموں اور اساتذہ نے تحریک آزادی میں حصہ لے کر نہ صرف انگریزوں کو ہمیشہ کے لئے ملک بدر کرنے ، بلکہ ہندوستان کو آزاد کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ سرسید اگر دبے کچلے اور ہارے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں سے ٹکرا جاتے تو کیا ہوتا۔۔؟ قوم بدحال اور برباد ہو جاتی۔ ایسی برباد کہ صدیوں تک سر نہ اٹھا پاتی۔ دوسری طرف ہم ان تعلیمی اداروں سے بھی محروم ہو جاتے، جو سرسید تحریک کی دین تھے۔ نجانے ہمارا ملک انگریزوں کے چنگل سے کب آزاد ہوتا۔ یہ بھی ممکنات میں ہے کہ سید کا شمار شہداء اور عظیم مجاہدین میں ہوتا۔ لیکن سرسید جیسا مدبر اور مفکر، جس نے وقت کی ضرورت اور مصلحت کے مطابق کام کیا م، قوم کو نہ ملتا۔

سرسید اور ان کے بیشتر ساتھی ادب اور صحافت میں بھی انقلاب کی نوید ثابت ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کی شروعات کی۔ سرسید سے متنی تنقید کا آغاز ہوا۔ مضمون نویسی، صحافت اور اردو نثر کا عام فہم ہونا بھی سرسید کا کارنامہ ہے۔ حالی سے اردو تنقید کی شروعات ہوئی۔ تو شبلی نے تقابلی تنقید اور مشرقی تنقید کو بنیاد فراہم کی۔ سرسید کے دوسرے ساتھیوں نے تعلیمی مشن کو تحریک کی شکل دی۔

سرسید، ان کے رفقاء اور ابتدائی دور کے فارغین نے اپنا کام تندہی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ تعلیم کو عام کرنے اور قوم وملک کو بیدار کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صرف ایک تعلیمی ادارہ نہ رہی بلکہ ایک رواں دواں دریا بن گئی، جس کے فیض سے لاکھوں کروڑوں لوگ سیراب ہوئے۔ اور یہ ادارہ پوری دنیا میں قوم کی بیداری کا باعث بنا۔ ملک پر کیسے بھی سیاسی وسماجی حالات آئے، اے ایم یو کے طلبہ اور اساتذہ نے، نہ صرف آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کیا بلکہ ملک وقوم کی حفاظت بھی کی۔ پروفیسر افتخار عالم خاں نے سرسید کی قومی یکجہتی کے لئے کی گئی عملی کوششیں اور سرسید کے بیان کو پیش کیا ہے:

''ملک میں قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کی فضا کو برقرار رکھنے کے لئے سرسید، اپنے زمانے میں ہر ممکن تدابیر اختیار کرنے کے حق میں تھے۔ دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کی نو آبادیاتی حکومت نے 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کے نظریے کے تحت فرقہ وارانہ فضا تیار کرنا شروع کر دی تھی۔ عہد وسطیٰ کے مذہبی رواداری کے حامل معاشرے کی بیخ کنی کی جارہی تھی۔ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سب سے حساس معاملہ گائے کی قربانی کا تھا۔ جس کو لے کر جگہ جگہ فسادات ہو رہے تھے۔ سرسید کی مذہبی رواداری کے سلسلے کی مخلص نیت اور صالح فکر کا

اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں انہوں نے اس مسئلہ پر نہایت واضح الفاظ میں اپنی مندرجہ ذیل رائے ظاہر کی تھی:

''ہماری مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی قائم ہوتو گائے کی قربانی نہ کرنا، اسکے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔''

[سرسید تحریک کا سیاسی وسماجی پس منظر، پروفیسر افتخار عالم خاں، ص نمبر ۲۸۹،]

سرسید نے قومی یکجہتی اور اور مذہب کے ساتھ سائنسی فروغ کی ذمہ داری بخوبی ادا کی۔ ہم سب بہی خوانِ سرسید اور محبانِ سرسید کی ذمہ داری ہے کہ ہم سرسید کے خوابوں کو پورا کریں اور ان کے کارناموں کو عوام الناس تک پہنچائیں۔ کچھ لوگ محبان سرسید کو دو خانوں میں تقسیم کر کے ان کی طاقت کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ علیگ اور نان علیگ جیسے دو خانے بنا دیے گئے ہیں۔ علیگ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ سرسید صرف ان کے ہیں۔ سرسید کی ہر طرح کی وراثت پر صرف ان کا حق اور اجارہ ہے۔ اور سرسید کے خوابوں کو تکمیل تک پہچانے کی ذمہ داری صرف ان کی ہے۔ مانا کہ علیگ وہ لوگ کہلاتے ہیں، جنہوں نے علی گڑھ مسلم یونورسٹی کے احاطے میں رہتے ہوئے اقامتی زندگی گذاری اور تعلیم حاصل کی۔ ہر سال ۱۷ اکتوبر کو علیگ حضرات سرسید ڈے مناتے ہیں۔ سرسید ڈے پر اپنے ہاسٹل کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ سرسید کے نام پر ''سرسید ڈنر'' کرتے ہیں۔ جس میں پوری دنیا میں کروڑوں روپے کا صرفہ آتا ہے۔ معاف کریں یہ سرسید کے نام پر ''علیگ ڈے'' ہوتا ہے۔ آج قوم ایک عجیب دوراہے پر کھڑی ہے۔ مسلمانوں کو سیاسی اور سماجی اعتبار سے بونا بنایا جارہا ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کو صفر کیا جارہا ہے۔ مذہبی آزادی بھی سیاسی غلام بن چکی ہے اور قوم عدالت کے فیصلوں کو پر امید نظروں سے دیکھتی ہے۔ ہر طرف افراتفری کا ماحول ہے۔ ہمارے نوجوان بے روزگار ہیں۔ تعلیم کا جو فی صد ہونا چاہئے تھا، اب تک ہم اسے حاصل نہیں کر پائے ہیں۔ ہماری شناخت اور تشخص داؤ پر ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے دشمن عناصر کی نظر میں ہیں۔ ہمارے اداروں کی اقلیتی شناخت پر حملے ہورہے ہیں۔ یہ وہی حالات ہیں، جو علی گڑھ تحریک کے وقت تھے۔ جس نے ہمیں سرسید جیسا جوجھارو، دوراندیش، مصلحت کوش اور سیاسی تدبر رکھنے والا قومی رہنما دیا۔ سرسید نے قوم کے ساتھ ساتھ پورے ملک کو آگے بڑھانے کی فکر کے ساتھ عملی کوشش بھی کی۔

آج ہمارے درمیان کوئی سرسید ہے نہ ان کے قول وعمل پہ جاں نثار کرنے والے ان کے احباب۔ آج ہمارے ناتواں شانوں پر قوم کی اصلاح کی ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ ایسے وقت میں ہم سب محبانِ سرسید جس میں علیگ اور نان علیگ کا کوئی امتیاز نہیں ہل کر سرسید کے مشن کو ایک تحریک کی شکل میں عام کریں۔ سرسید کی زندگی اور ان کے کارناموں کو قوم کے نونہالوں تک پہنچائیں۔ تعلیمی ادارے قایم کریں۔ قومی اتحاد کے بل پر ملک دشمن عناصر سے لوہا لیتے ہوئے قوم وملک کی صحیح رہنمائی کریں۔ یہ موجودہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اور پوری دنیا میں پھیلے محبانِ سرسید کے لئے ایک چیلنج بھی۔ کہ سب مل کر قوم وملک کو موجودہ سیاسی اور سماجی بحران سے باہر نکالیں۔ یہاں میں صغیر افراہیم کی کتاب کا ایک اقتباس نقل کرنا چاہوں، جس میں انہوں نے آج کے حالات کا عہد سرسید کے حالات سے موازنہ کیا ہے اور آج ہمیں کیا کرنا چاہئے، پر بھی اظہار خیال کیا ہے:

''سرسید احمد خاں کی رحلت کے بعد ان گنت دشواریوں کے ہوتے ہوئے، ہمارے بزرگوں نے اپنے اور مصلح قوم کے خوابوں کی تعبیر کیلئے طرح طرح کے جتن کئے۔ وہ جن ناگزیر حالات سے نبرد آزما تھے۔ کم وبیش آج ہم بھی انہی

حالات سے دوچار ہیں۔ہمیں بھی اسی طرح کے چیلنجز کا سامنا ہے بلکہ ہم ان کے مقابل کمزور ہیں۔کیوں کہ ہم صوبائی ، علاقائی ، لسانی ،مسلکی اختلافات کا شکار ہیں۔جب یہ مان لیا گیا کہ عصرِ حاضر میں مسائل ومصائب کی نوعیتیں بدلی ہوئی ہیں پھران کے تدارک کے لئے ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا۔اس نکتہ پر خاص توجہ دینی ہوگی کہ ۱۸۵۷ کی حشر سامانیوں،اندرونی خلفشار اورصدمے سے ابھرنے کے لئے رفقائے سرسید نے کئی منصوبے تیار کئے تھے۔محض کاغذ یا ذہن پر نہیں، بلکہ یکسوئی سے ان نقوش پر دلجمعی سے کام کیا۔اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔''

[عصر حاضر میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت ومعنویت، پروفیسر صغیر افراہیم،ص۳۰۴]

موجودہ وقت میں ہمیں باہمی اتحاد کا مظاہرہ کرنا ہوگا اور سرسید کی زندگی اور قوم وملک کے لئے ان کی خدمات کا نہ صرف جائزہ لینا ہوگا بلکہ اس کو عام کرنے کے لئے عملی جدوجہد بھی کرنی ہوگی۔آج ہماری قوم علی گڑھ کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے کہ وہاں سے پھر کوئی ابر کا ٹکڑا اٹھے گا اور قوم و ملک پر جم کے برسے گا۔اے ایم یو کے طلبہ اور اساتذہ نے ہر مشکل وقت میں قوم وملک کی صحیح رہنمائی کی ہے۔آج پھر وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم سب محبان سرسید کو قوم کی فکر کرنی ہوگی اور سرسید کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے ہوں گے۔جن سے ہمارے بچے مختلف شعبہء حیات،سول سروسز،عدالتی محکموں کے اعلیٰ عہدے،مینجمنٹ کے شعبے،ڈاکٹر۔انجینیر ،وکلا اور اساتذہ،عصری تعلیم یافتہ مدرس اور ریاستی اعلیٰ عہدوں پر جاسکیں۔بچوں کو مختلف عہدوں کے لئے تیار کرنے کو مقابلہ جاتی ادارے بھی قائم کریں۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق شیخ الجامعہ، جناب ضمیر الدین اور کچھ سابق طلبہ نے ادارے قائم کرنے کی ایک تحریک چلائی ہے،جس کی تعریف کرنی چاہئے۔مگر جس طرح سرسید تحریک سے متاثر ہوکر پورے ملک میں تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا تھا،آج اسی طرز کی مہم کی ضرورت ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، زکوٰۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا،جنوب کے تعلیمی ادارے،ملک کے بڑے مدارس یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پوری دنیا میں پھیلے سرسید کے چاہنے والے۔سب مل کر اگر قوم کی تعلیمی ،معاشی اور سماجی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے کام کریں،تو ضرور قوم کا بھلا ہوگا۔اور پوری قوم میں خاص کر نوجوانوں میں سماجی کے ساتھ سیاسی بیداری بھی آئے گی۔جس کے نتیجے کے طور پر آبادی کے تناظر میں ملک کی مختلف ریاستوں کی اسمبلیوں اور ملک کے ایوانِ بالا میں ہمارے ممبران کی ایک اچھی خاصی تعداد ہوگی۔جو اس ملک میں نہ صرف ہمارے ملی مفادات کا تحفظ کرے گی، بلکہ قوم ومذہب پر حملہ آور ہونے والی سیاسی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی۔اگر ایسا ہوا تو سرسید کا مشن بھی کامیاب ہوگا اور تعلیمی اداروں کا مقصد بھی پورا ہوگا۔یہی سرسید اور ان کے مشن کو سچا اور عملی خراج ہوگا۔

☆☆☆

سرسید اور الہ آباد کے تعلیمی رشتے

مصلح قوم سرسید احمد خان بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ذات والا صفات سے ہم سبھی واقف ہیں۔آپ کی پیدائش ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو بمقام دہلی اور وفات ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں واقع ہوئی اور آپ وہیں مدفون ہیں۔لسان العصر اکبر الہ آبادی (۱۶/نومبر ۱۸۴۶ء تا ۱۵/فروری ۱۹۲۱ء) آپ کے ہمزمانہ ہیں اور آپ دونوں نے ہی انیسویں صدی کے اس نصف آخر کا مشاہدہ کیا جس میں ۱۸۵۷ء کا سانحہ فاجعہ پیش آیا۔سامراجی طاقتوں نے اسے غدر کا نام دے کر مسلمانوں کو اس کا پوری طرح ذمہ دار ٹھہرایا۔پھر کیا تھا،مسلمانوں کا قتل عام ہوا،خون کے دریا بہہ گئے،ان کو ان کے گھروں اور علاقوں سے باہر کر دیا گیا اور جائیدادیں چھین کر اس حد تک حاشئے پر دھکیل دیا گیا کہ اگلے بیس تیس برس تک ان میں کسی ردعمل کی سکت ہی نہ رہی۔بقول ظفر اللہ خان قنوطیت کے اس عجیب وغریب ماحول میں ایک مرد مجاہد سید احمد خان نے کمر کسی اور اپنی حکمت عملی سے ایک طرف انگریزوں کے طیش کو کم کرنے کی کوشش کی تو دوسری جانب مسلمانوں کو وہ واحد راستہ دکھایا جو موجودہ دور میں ترقی کے لئے ہم سب کو میسر ہے یعنی جدید تعلیم کا راستہ۔اس کا عملی نمونہ ۱۸۷۵ء میں سرسید کا علی گڑھ میں شروع کیا گیا ایک کالج ہے جو ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ اکبر الہ آبادی جو سرسید کی کارگذاریوں کا بنظر غائر مطالعہ کر رہے تھے انھوں نے خود کو تو مقیم دیر و مرید شیخ و اسیر قانون گردانا مگر سرسید کے فکر و عمل کی ستائش میں یوں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

واہ رے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا　　یہ دماغ و حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں پرسوز جگر کیا کہنا　　ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

اکبر نے سرسید کی صرف زبانی تعریف نہیں کی بلکہ کالج کے لئے مالی تعاون بھی کیا جس کی تصدیق ان کے ایک خط سے ہوتی ہے:

'آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۷/جولائی مع مبلغ دوسو روپیہ اور چندہ مدرسۃ العلوم متعلق بلڈنگ فنڈ پہنچا'

شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اکبر اور سرسید کے مابین مخلصانہ روابط کی تائید کی ہے۔اتنا ہی نہیں اکبر نے سرسید کی وفات پر ان کے تئیں اپنے محسوسات کو خود احتسابی کرتے ہوئے پوری وسیع القلبی سے یوں نذر قلم کر دیا۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں ،سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی ،میں تو کہتا ہوں کہ اے اکبر
خدا بخشے ،بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

سرسید ملازمت پیشہ تھے اور اس سلسلے میں جہاں بھی ان کا تقرر ہوتا وہاں ان کی تعلیمی سرگرمیاں جاری ہو جاتیں۔ان کا قیام اکثر و بیشتر الہ آباد میں بھی ہوا کرتا تھا جس کا سبب تھا ان کے بیٹے سید محمود کا یہاں مقیم ہونا۔لہٰذا اس شہر کی خاک میں بھی ان کے تعلیمی نظریے کا خمیر گندھ گیا اور اس کی پرورش و پرداخت ان کے ہمنواؤں اور مخالفین دونوں نے کی۔الہ آباد کے چند اہم تعلیمی ادارے اس کے بین ثبوت ہیں۔

سرسید ۱۸۳۶ء میں پارسا بیگم عرف مبارک بیگم سے ازدواجی رشتے میں منسلک ہوئے۔ان کے دو بیٹے سید حامد اور سید محمود اور ایک بیٹی امینہ تھی۔بیٹی کا چھوٹی عمر میں ہی انتقال ہو گیا۔سید محمود ۲۴/مئی ۱۸۵۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ۸/مئی ۱۹۰۳ء کو سیتا پور میں آخری سانس لی۔۱۸۸۸ء میں ان کی شادی سرسید کے ماموں زاد بھائی خواجہ شرف الدین کی صاحبزادی مشرف جہاں سے ہوئی۔راس مسعود آپ کے بیٹے یعنی سرسید کے پوتے ہیں۔۱۷/مارچ ۱۸۶۶ء کو الہ آباد ہائی کورٹ شروع ہوا۔سید محمود یہاں تقرری پانے والے پہلے ہندوستانی Jurist اور برطانوی حکومت میں الہ آباد ہائی کورٹ میں بطور جج خدمات انجام دینے والے پہلے مسلمان تھے۔انھوں نے ۱۸۸۲ء سے چار مرتبہ کارگزار جج کی حیثیت سے کام کیا۔۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۳ء تک وہ شمال مغربی صوبوں (North Western Provinces) کے معزز جج (Puisne Judge) مقرر ہوئے۔ایک جج کی حیثیت سے انڈین لاء رپورٹ پر ان

پروفیسر صالحہ رشید، سابق صدر شعبۂ فارسی، الہ آباد یونیورسٹی

کے فیصلوں کا غلبہ رہا۔انھوں نے ہندوستان کے گورنر جنرل اور شمال مغربی صوبوں کے لیفٹیننٹ گورنر دونوں کی قانون ساز کونسلوں کو مجوزہ قوانین پر طویل نوٹ لکھے اور اس طرح قوانین کی تشکیل میں بھی سرگرم عمل رہے۔۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۸ء تک وہ شمال مغربی صوبوں اور اودھ کی قانون ساز کونسل میں تعینات رہے۔انھوں نے اینگلو اورینٹل کالج کے قیام میں بھی اہم کردار ادا کیا جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔سید محمود کے یہاں تک پہنچنے میں ان کی تعلیم کا نمایاں رول ہے۔۱۸۶۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کرنے کے بعد انھیں انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے برٹش گورنمنٹ کا اسکالرشپ ملا اور ۱۸۶۹ء میں انھیں لنکنز انLincoln's Inn انگلینڈ میں داخلہ مل گیا۔اسی دوران انھوں نے کرائسٹ کالج، کیمبرج میں لیٹن، جرمن اور مشرقی زبانوں کا مطالعہ کیا۔۱۸۷۲ء میں ہندوستان واپس آنے پر وہ الہ آباد ہائی کورٹ سے بحیثیت بیرسٹر منسلک ہو گئے اور ۱۸۷۸ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔عربی زبان سے ان کی واقفیت نے انھیں ان کے ہمعصروں میں ممتاز کر دیا تھا۔اس کی بنا پر وہ اسلامی قوانین کو اچھی طرح سمجھ سکتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو سمجھا سکتے تھے۔ان کے جونیر تیج بہادر سپرو نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

His long and detailed judgements were necessary because of the spate of new legislation being enacted that needed to be clarified in a court of law.'

حالانکہ اسلامی مآخذ پر مبنی ان کے فیصلوں سے برٹش ججوں کو پریشانی محسوس ہوتی تھی جس سے کورٹ میں ناچاقی کا ماحول پیدا ہو گیا۔نتیجتاً سید محمود ۱۸۹۳ء میں قبل از وقت سبکدوش ہو کر بطور بیرسٹر لکھنؤ میں سرگرم عمل ہو گئے۔

۱۸۷۲ء میں جیسے ہی سید محمود انگلینڈ سے ہندوستان واپس لوٹے، انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی کی طرز پر ایک خود مختار مسلم کالج کے قیام کا منصوبہ تیار کیا۔خود الہ آباد ہائی کورٹ میں بحیثیت وکیل اور جج خدمات انجام دیتے ہوئے محمڈن اینگلو اورینٹل اسکول کی بنیاد رکھنے میں اپنے والد کی بھرپور مدد کی۔۱۸۸۳ء میں وہ انگلینڈ گئے اور مسٹر تھیوڈور بیک کو اس اسکول کا پرنسپل مقرر کرنے کے لئے ہندوستان لائے۔سید محمود نے انگریزی پڑھانے اور قانون کے پروگرام کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اپنی قانون کی کتابیں یہاں کی لائبریری کو عطیہ کر دیں۔۱۸۸۹ء میں سرسید نے ان کو اسکول کے بورڈ آف ٹرسٹیز کا جوائنٹ سکریٹری نامزد کیا۔۱۸۹۸ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد انھوں نے تاحیات کالج کی ذمہ داری سنبھالی۔وہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں بھی فعال رہے۔اس کے علاوہ ۱۸۸۲ء میں انھیں ہندوستان کے تعلیمی حالات کی تحقیقات کا کمشنر مقرر کیا گیا تھا۔سید محمود بحوالہ ذیل الہ آباد ہائی کورٹ میں اپنی خدمات انجام دینے کے دوران الہ آباد میں ہی مقیم رہے۔ "Mahmud Manzil" The Pioneer, 18 July, 1871., Muir, W. Sir W. David, Swaraj Muir's Confidential Despatches(1ed.), London: Imperial records.,Lelyveld, Bishambhar Nath Pandey. B.R.NandaBhawan and the myths of patriotic nationalism, اور دیگر حوالوں سے لکھا ہے کہ 'اچرچ روڈ پر واقع عمارت جسے آج سوراج بھون کہتے ہیں اصل میں 'محمود منزل' کہلاتی تھی۔شمال مغربی صوبوں کے لفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور کے ایماء پر سرسید کے لئے ۱۸۷۱ء میں ایک مکان تعمیر کیا گیا۔ولیم میور اکثر انتظامی امور میں سید احمد خان سے مشورہ لیتے تھے جس کے لئے الہ آباد میں ان کی موجودگی ضروری تھی۔اس مکان کے لئے شیخ فیاض علی نامی شخص کی بیس ایکڑ کی اراضی کا انتخاب کیا گیا جو گورنمنٹ ہاؤس سے فقط دس منٹ کی مسافت پر واقع تھی۔یہ زمین فیاض علی کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران ہونے والے نقصانات کے عوض ملی تھی۔یہاں ایک بڑی عمارت کی تعمیر کا کام ۱۸۶۸ء میں شروع ہو کر ۱۸۷۱ء میں تمام ہوا۔اسے سید احمد خان کے بیٹے کے نام پر 'محمود منزل' کہا گیا۔بعد میں سید محمود کا اس پر قبضہ تھا۔وہ جب الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس بنے تو یہاں کرایہ دار کی حیثیت سے رہے۔فیاض علی اپنی وفات ۱۸۷۳ء تک فتحپور بشوا میں اپنے ایک بنگلے میں رہتے تھے جو فی زمانہ اللہ پور کے آس پاس کی آبادی ہے۔مؤرخ ڈیوڈ لیلیولڈ David Lelyveld کے مطابق جسٹس محمود نے اس کوٹھی کو ۱۸۸۸ء میں نو ہزار روپئے میں خرید لیا تھا جب کہ ایک دوسرے حوالے کی رو سے اسے شاہ جہاں پور کے جج رائے بہادر پرمانند پاٹھک نے خریدا۔خرید فروخت کے معاملات کچھ بھی رہے ہوں مگر یہ طے ہے کہ سرسید کی بود و باش کا تعلق یہاں سے رہا۔۱۹۰۰ء میں یہ عمارت پنڈت موتی لعل نہرو کے ہاتھ فروخت کر دی گئی جنھوں نے اس کا نام آنند بھون رکھا۔اس آنند بھون نے آزادی کی

مہم میں زبردست رول ادا کیاجب کہ ولیم میور نے اس محل نما گھر کو برطانوی حکومت کے مرکز کے طور پر دیکھا تھا۔ آوریل اے پاویل Avril A. Powell نے ۲۰۱۰ء میں اپنے تحقیقی مقالات کا ایک مجموعہ Woodbridge Boydell Press, England سے شائع کیا جس کا عنوان ہے Scottish Orientalists And India: The Muir Brothers, Religion, Education and Empire. اس کتاب کے نویں مقالے Education And The Idea Of A University میں پاویل نے لکھا ہے:

'Debates between Saiyid Ahmed Khan ,the founder of Muhammadan Anglo-Oriental College in Aligarh and William Muir led to the founding of Muir Central College.Whereas the universities at Calcutta, Bombay and Madras(the first in India)had classes taught in English, "Muir College" opened in 1872 with three departments of equal standing, teaching respectively through the vernaculars, the oriental classics and English.There was Maulawi Zakaullah , Professor of Vernacular Science and Literature, who taught Arabic, Persian, Urdu and Mathematics.one of the students' favourite was Aditya Ram Bhattacharya,professor of Sanskrit.Arthur reid was professor of Law.'

پاویل نے اپنی تحقیق کے دوران شمالی ہندوستان میں مسلمانوں اور مشنریوں کے تعلقات کا مطالعہ کیا۔انھوں نے علی گڑھ میں پروفیسر شیریں موسوی ، پروفیسر اصغر عباس اور پروفیسر مختار الدین احمد اور الہ آباد میں پروفیسر و نے چند پانڈے سے ملاقات کر حقائق جاننے کی کوشش کی۔اس کڑی میں انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر سید عنایت زیدی کا بھی نام لیا ہے۔ پاویل کی یہ کتاب ہندوستان میں برٹش حکومت ،لسانیات ،شمالی ہند، تنازعات، جنگ آزادی، سرسید کے تعلیمی افکار اور الہ آباد پر خاطر خواہ روشنی ڈالتی ہے۔اس لئے سطور ذیل میں اس کتاب میں درج چند اہم باتوں کا ذکر کر دینا لازمی ہے۔

ولیم میور کا زمانہ ۲۷/اپریل ۱۸۱۹ء تا ۱۱/جولائی ۱۹۰۵ء تک تقریباً ایک صدی پر محیط ہے۔سرسید نے بھی یہی دور دیکھا۔ولیم میور اور ان کے بڑے بھائی جان میور مشرقی علوم میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جان میور سنسکرت اسکالر تھے اور ولیم میور نے عربی اور فارسی پڑھی تھی۔میور ۱۸۳۷ء میں شمال مغربی صوبوں کے گورنر کے سکریٹری بن کر بنگال آئے۔۱۸۶۵ء میں وہ انڈین گورنمنٹ کے سکریٹری برائے امور خارجہ مامور ہوئے۔اسی اثناء ۱۸۶۶ء میں اڑیسہ میں قحط پڑا اور ولیم میور کا فرمان جاری ہوتا ہے:

'Every district officer would be held personally responsible that no deaths occured from starvation which could have been avoided by any exsertion or arrangement on his part or that of his subordinate.' یہ فرمان امپیریل گزٹ آف انڈیا ۱۹۰۷ء میں درج ہے جس سے ان کی انتظامی صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔۱۸۶۸ء میں وہ شمال مغربی صوبوں کے لفٹیننٹ گورنر بنائے گئے۔ولیم میور کو تعلیم سے ہمیشہ رغبت رہی۔جس کے نتیجے میں الہ آباد میں میور سنٹرل کالج قائم ہوا جو بعد میں الہ آباد یونیورسٹی کا حصہ بنا اور آج بھی اسے میور سنٹرل کالج کہتے ہیں جس میں اس کی سائنس فیکلٹی اور مسلم بورڈنگ ہاؤس واقع ہیں۔میور نے اسلامی تاریخ پر کام کیا جس پر سرسید سے ان کے شدید اختلافات بھی رہے۔جان میور اور ولیم میور ہندوستان میں ان اساتذہ اور طلباء کے رابطے میں رہے جہاں اورینٹل اور انگلش اسٹڈیز، ساتھ پڑھائی جا رہی تھیں مثلاً بنارس آگرہ اور دہلی جیسے شہروں میں انھوں نے اپنے روابط کچھ سنسکرت اور فارسی مضامین پڑھائے جانے والے تعلیمی اداروں سے قائم کئے۔ان دونوں کی تعیناتی جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے مراکز بمبئی، مدراس اور کلکتہ سے الگ مفصل اضلاع جیسے اعظم گڑھ فتحپور وغیرہ میں ہوئی تو وہاں ان دونوں بھائیوں نے ہندوستانی تہذیب، روایات، دیہی اور تعلیمی مسائل کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔مدرسہ اور گروکل کا چکر

لگایا، پنڈتوں اور علماء سے رابطہ قائم کیا۔ جان ولیم نے بنارس کے پنڈتوں سے اپنے تعلقات بڑھائے۔ وہ انگلینڈ سے سنسکرت پڑھ کر آئے تھے اور ۱۸۴۴ء۔۱۸۴۵ء کے دوران بنارس سنسکرت کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ ان کے لکچر سنسکرت میں ہوتے تھے اور وہ پنڈتوں سے اپنے سنسکرت لکچر کی اصلاح کرواتے تھے۔ پنڈت راجہ رام شاستری کو انھوں نے اپنا منشی بنایا تھا۔ ہیلی بیری کالج جہاں سے ان دونوں بھائیوں نے تعلیم حاصل کی، اس کالج کا کارنامہ یہ رہا کہ اس نے ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے دوران انگریزی اور مقامی زبانوں کے علاوہ سنسکرت عربی اور فارسی زبانیں بھی پڑھائیں۔ اس کے توسط سے طلباء کو ہندوستان کی ثقافت سے بھی آگاہ کر دیا۔ ولیم جان اور ولیم میور نے اپنے مفادات کو سنسکرت اور عربی کے ذریعے ہندومت اور اسلام کے درمیان تقسیم کیا۔ ۱۸۵۷ء تک ان دونوں نے سنسکرت کی مقدس کتابوں اور حضورﷺ کی حیات پر مبنی اپنی کتابیں تیار کر لی تھیں جن میں ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے قابل اعتراض مواد موجود تھا۔ جان نے اپنی کتاب کے شروع میں لکھا۔ 'وہ ہندو جو تنقیدی طور پر اس بنیاد سے واقف ہونا چاہتے ہیں جس پر ان کا آبائی مذہب قائم ہے'۔ جان کے ذہن میں یقیناً ان کے بنارس کے طلباء تھے جنھیں جان نے پندرہ برس قبل سنسکرت، یونانی اور لاطینی کے مشترکہ اصل جیسے موضوعات پر سنسکرت میں لکچر دیا تھا لیکن اب ہندوستان میں انگلش میڈیم یونیورسٹیاں بھی قائم ہوگئی تھیں، لہٰذا ان لکچرز کو انگریزی میں شائع کیا۔ اس لکچر سیریز کے مجموعے کے دوسرے ایڈیشن کے مقدمے میں لکھا 'ان ہندوؤں کی تحقیق میں مدد کرنا جو اپنی قوم کی اصل، تاریخ، اپنے قومی ادب، مذہب اور اداروں کی تنقیدی تحقیق کرنا چاہتے ہیں'۔ ان دونوں کی اشاعتوں سے ویدک اور اسلامی تہذیبوں پر علمی بحثیں چھڑ گئیں۔

اٹھارویں صدی میں مغلوں کی سیاسی طاقت ٹوٹ چکی تھی مگر بہت سے ثقافتی اور مذہبی ادارے جو شاہی سرپرستی میں چل رہے تھے وہ اپنے وجود کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ ۱۸۰۳ء میں مغل خاندان کا کل اقتدار کمپنی کے ہاتھ آجانے کے باوجود یہ خاندان علمی طبقے کے روایتی، ثقافتی، فنی، ادبی اور مذہبی مفادات کی سرپرستی کرتا رہا۔ یہ سلسلہ انیسویں صدی کے وسط تک چلتا رہا۔ میور برادران کے ہندوستان میں ابتدائی دنوں یعنی ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۰ء کے دوران مغل عنصر ہر جگہ موجود تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کی سکیولر طاقتوں نے اپنی اسکالرشپ کی روایتی شکل کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران اودھ پر مسلم حکمرانوں نے خصوصی توجہ دی۔ جس کے قلیل مدتی مقامی طاقت کے عروج نے اس کے دارالخلافہ لکھنؤ کو پورے خطے پر مضبوط اور غیر معمولی ثقافتی اثرات مرتب کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کا بھی حشر ۱۸۵۶ء میں برطانوی حکومت میں الحاق کی صورت میں ہوا۔ دوسری طرف بنارس میں نوتشکیل یافتہ راجہ شپ نے ہندو مذہبی مفادات اور علمیت کے فروغ کے ذرائع فراہم کر دئے۔ ولیم جان نے اپنے رٹائرمنٹ کے بعد ایڈنبرگ جا کر ۱۸۵۳ء میں لکھا کہ مندروں کی سرکاری سرپرستی ختم ہونی چاہئے۔ ۱۷۸۶ء سے ۱۸۲۰ء تک ولیم جونس اور ایچ ٹی کول بروک William Jones &H.T.Colebrooke نے سنسکرت، یونانی، لاطینی اور دیگر یوروپین زبانوں میں مماثلت پر گفتگو کی۔ اسی اثناء یوروپ میں فرانز بوپ Franz Bopp راسمس راس Rasmus Ras جیکب گریم Jacob Grimm شلیگل برادران Schlegel اور کئی عدد جرمن ماہر لسانیات زبانی مماثلت پر کام کر رہے تھے۔ جان میور نے ۱۸۲۰ء میں ہندوستان آنے سے قبل ان سب کو پڑھا ہوگا۔ جان میور ابھی ہیلی بیری میں ہی تھے کہ Dugald Stewart ڈوگالڈ اسٹیوارٹ نے ایڈنبرگ Edinburgh میں ایک متنازعہ بیان دے دیا کہ سنسکرت ایک برہمن hoax (فریب) ہے جس کی بنیاد یونانی ہے۔ Alexander Hamilton الکزانڈر ہیملٹن کی Hindu Literature and Asian History میں پروفیسر شپ پر تعیناتی طلباء کے درمیان لسانی مباحثوں کو ہوا دے گئی۔ زبانوں کی اصل کا متنازعہ مسئلہ عوامی طور پر برطانیہ میں Friedrich Max Muller کے ۱۸۴۰ء میں 'بنگالی اور سنسکرت کے باہمی روابط' عنوان پر دئے گئے لکچر سے زور پکڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے آریاؤں کی ہجرت کا خاکہ بھی پیش کیا اور کہا کہ زبانوں کے تقابلی مطالعے کے تاریخی، عملی اور فلسفیانہ فوائد ہیں۔

۱۸۵۷ء کے کشیدہ حالات میں میور فیملی اور دیگر انگریز افسران نے آگرہ کے قلعے میں پناہ لی جن کی سرسید نے مدد کی تھی۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء کے دوران سرسید احمد خان اور ولیم میور کے کیریر نے پیشہ ورانہ طور پر کئی مراحل طے کئے۔ ولیم کئی سال تک صوبائی بورڈ آف ریوینیو میں تعینات رہے جہاں نجیب آباد کے نوابوں کے بیٹوں کے بغاوت میں ملوث ہونے کے سبب ان کی زمین کی ضبطی میں کچھ ناانصافیاں ہوئیں اور ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ میور دو

سال گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن سکریٹری کے طور پر کلکتہ میں رہے۔ یہاں ان کے کیریر کا ستارہ عروج پر رہا۔ ۱۸۶۸ء میں انھیں شمال مغربی صوبوں کا لفٹیننٹ گورنر بنایا گیا۔ اس دوران سرسید چار سال تک مرادآباد میں عدالتی خدمات انجام دیتے رہے ساتھ ہی امن وامان کی کارگذاریوں میں بھی شامل رہے۔ ۱۸۶۲ء میں ان کا تبادلہ غازیپور اور اس کے دو سال بعد علی گڑھ ہوا۔ ۱۸۶۴ء میں وہ بنارس بھیج دئے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں وہ اپنے دو بیٹوں سید حامد اور سید محمود کو تعلیم کی غرض سے انگلینڈ لے گئے۔ بچوں کے تعلیمی اسکالرشپ اور سرسید کی مخصوص چھٹی میں ولیم میور کی عنایت کا دخل رہا۔ ۱۸۵۷ء میں رونما ہونے والے واقعات اور انگلینڈ کا سفر سرسید کی فکر کے دو محور ہیں۔ ولیم میور اور سرسید دونوں کا ماننا تھا کہ اعلیٰ تعلیم سے پسماندگی دور کی جاسکتی ہے اور شمال مغربی صوبوں میں اعلیٰ تعلیم کی بے انتہا کمی ہے۔ یہی سبب ہے کہ برطانوی سرکار کو یہاں سے بابو نہیں مل پا رہے تھے۔ ولیم میور کا خیال تھا:

'Hindutanis must rouse themselves from their slumber of indifference or their children would remain behind on all the paths of learning and knowledge.'

سرسید نے اپنی غازیپور اور کلکتہ کی تقریروں میں پسماندگی اور اس کے تدارک کو اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنی عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے انگریزی اور جدید علوم سیکھنے ضروری ہیں۔ ۱۸۶۰ء کے آس پاس سرسید اور ولیم دونوں نے مفصل شہروں میں تعلیمی بہتری کی اسکیموں پر کام کرنا شروع کیا۔ ولیم نے تو تعلیمی بیداری کو لے کر ایک ڈسٹرکٹ کا دوسرے سے مقابلہ کرا دیا تھا۔ ان دونوں نے ہی ولیم ہنٹر کے اس مشورے کی تائید کی کہ اعلیٰ تعلیم سے پسماندگی کا تدارک ممکن ہے۔

پاویل میور سنٹرل کالج کی جائے وقوع کو لے کر لکھتا ہے:

'For its first fifteen years the Muir College was able to prove itself a valuable half-way house situated rather precariously between the near monopoly of English in Calcutta University and the uniqueness of the new Punjab University's fully fledged Oriental Department. By the late 1880s the Muir Central College examination results marked it as north India's most academically succesful college outside Calcutta.'

پاویل کی تحقیق بلاشبہ سرسید ولیم میور اور شہر الہ آباد سے ان کی وابستگی پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے علاوہ سرسید نے اپنے رفقاء اعزاء واقربا کو خطوط لکھے ہیں جن سے براہ راست ان کے الہ آباد میں قیام اور مختلف معاملات کی معلومات ہوتی ہے۔ ان کے پوتے سرراس مسعود نے ان خطوط کو جمع کیا۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۱ء میں نظامی پریس بدایوں کے حیدالدین پرنٹر و پبلشر نے شائع کیا۔ اس پر مولوی عبداللہ جان وکیل سہارنپوری نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس کے آخر میں وہ درج کرتے ہیں۔۔عبداللہ جان، لودھیانہ، ۶ رفروری ۱۹۲۲ء۔ مقدمہ کی شروعات اس شعر سے ہوتی ہے ۔

زندہ دارد مرد را آثار مرد نام گل باقی است چون گردد گلاب

اس مجموعہ میں مکتوب الیہ کے نام اور خطوط کی تعداد اس طرح ہے:

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد (۳)، نواب محسن الملک (۲۶)، مولوی مشتاق حسین صاحب نواب وقارالملک (۳۹)، مولوی زین الدین جج مچھلی شہر (۱۰)، خواجہ الطاف حسین حالی (۴)، مولوی چراغ علی المخاطب بہ نواب اعظم یار جنگ (۱)، خان بہادر مولوی ذکاء اللہ (۷)، راجہ جے کشن داس (۱)، نواب عماد الملک (۱۲)، سراج الدین احمد ایڈیٹر سرمور گزٹ (۱۹)، نواب سردار محمد حیات خان (۱)، مولوی عنایت رسول چڑیاکوٹی (۱)، میر واحد علی (۱)، خان خیراللہ خان (۱)، مولوی محمد ابراہیم (۳)، مولانا محمد علی صاحب کانپوری بانی ندوۃ العلما (۱)، مولوی ابوالحسن صدیقی (۱)، منشی حافظ سعید احمد (۱)، محمد سعید خان (۲)، مولوی سید نصرت علی (۳)، منشی احمد خان صوفی (۹)، مولوی عنایت اللہ (۴۳)، مولوی نیاز محمد خان وکیل پنجاب (۴۳)، شیخ میران بخش (۱)، شیخ عمر بخش وکیل ہوشیارپور (۱)، مولوی سید شرف الدین بلخی (۵)، مولوی سید میر حسن (۹)، سید عبدالغنی (۱)۔ سید عبدالغنی کو ۱۴ رنومبر ۱۸۹۲ء کو الہ آباد سے لکھا گیا مجموعے میں

شامل آخری خط ہے۔ پانچواں خط جو محسن الملک کے نام لکھا ہے اس کا چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

'اپنے چچازاد بھائی پر تاکید کرو کہ پڑھنے پر محنت کرے اور بنارس کالج میں بھیج دو۔ آخر سال میں انٹرینس کا امتحان ہوگا اس میں پاس ہو جائے گا۔ اگر چہ اسکالرشپ ہونے کو امتحان کی ضرورت نہیں مگر سر ولیم صاحب کی رائے ہے۔'

خاکسار، سید احمد، ۹/جولائی ۱۸۶۹ء، از لندن، بروز جمعہ (صفحہ ۳۶)

چھٹا خط ۲۳/جولائی ۱۸۶۹ء کو لندن سے نواب محسن الملک کو لکھ رہے ہیں:

'اگر مرا محبوب من مہدی لامذہب یا کافر گوید یا سمیع اللہ یا امداد العلی مرتد داند مرا چہ باک، تو بر من مہربان باش۔

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست (صفحہ ۳۹)

نواب محسن الملک کو: (صفحہ ۴۱۔۴۲)

میور صاحب کی کتاب کے جواب کا سامان نہیں ہو سکا۔۔۔ آج دربار ہے اور میں اسٹار آف انڈیا لینے جاتا ہوں۔

خاکسار، سید احمد، ۶/اگست ۱۸۶۹ء، روز جمعہ، لندن

(صفحہ ۵۲) کتاب پوری نہ ہو لے اور چھپ نہ لے اس وقت تک کسی کو نہ معلوم ہو کہ ولیم میور صاحب کی کتاب کا جواب لکھا جاتا ہے۔ پس اغیار سے اس کو مخفی رکھنا چاہئے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ قبل اتمام کتاب جناب سر ولیم میور صاحب کو اس کا حال معلوم ہو۔

(صفحہ ۵۶) 'نجم الاخبار کا مضمون جو سوسائٹی کے اخبار میں مندرج ہوا تھا میں نے دیکھا اور حیران ہو گیا کہ کون شخص میرا خریدار پیدا ہوا۔ مجھ کو تو اپنے ہموطنوں اور بالتخصیص اپنے ہم مذہبوں سے بجز لعنت کے پھٹ اور جوتی پیزار کے اور کسی چیز کی توقع نہیں ہے اور میں اس کے سننے اور کھانے میں خوش ہوں۔ نہ میرا دل رنجیدہ ہوتا ہے نہ میں ان کو برا جانتا ہوں پھر خلاف توقع یہ کیوں کر ظہور میں آیا۔ منشی نجم الدین میرے دوست ہیں اور غالباً مجھ کو اس قدر لعنت کا مستحق نہیں سمجھتے جس قدر کہ اور لوگ سمجھتے ہیں مگر وہ آرٹیکل ان کا لکھا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً جب وہ دہلی گئے ہوں گے تو وہاں منشی ذکاء اللہ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی ہوگی اور ان کی تقریر و خوش بیانی نے منشی ذکا اللہ صاحب کے دل کو تحریک دی ہوگی اور انھوں نے وہ آرٹیکل لکھا ہوگا۔ بہت سے الفاظ اور طرز تحریر سے انھیں کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔' اس خط میں آگے خطبات احمدیہ اور اس کے مشمولات پر تفصیلی گفتگو موجود ہے۔

(صفحہ ۷۶)۔۔۔ 'کل جو اخبار لندن میں چھپے ہیں ان میں آپ کی گفتگو کا بالکل اور نواب ٹونک کے ہزار روپیہ دینے کا ذکر چھپا ہے۔ افسوس کہ ہزار روپیہ کا اس قدر چرچا ہو گیا اور مولوی سید امداد العلی صاحب نے مضمون 'چندہ دستگیری مسافر لندن' بھی لکھ دیا اور جو کچھ انھوں نے متعدد جلسوں میں اس کی ہنسی اڑائی جس کی صحیح خبر مجھے پہنچی، اس کا بے فائدہ مجھے رنج ہوا۔'

خاکسار سید احمد از لندن، ۱۰/مئی ۱۸۷۰ء

(صفحہ ۷۷۔۷۸) 'راجہ صاحب کا میں نے خط دیکھا۔ جو کچھ انھوں نے لکھا وہ بالکل سچ ہے۔ آپ کا جو غصہ کسی قدر فرو ہوا، میں اس سے بہت خوش ہوا۔ کیسا برا یہ خیال تھا کہ بسبب کسی ابتری خواہ اصلی یا غیر اصلی بدانتظامی کے سبب آپ سوسائٹی سے علحدہ ہو جاتے۔ خیر بہر حال جو گذرا خدا نے خیر کی۔ مگر تعجب ہے کہ آپ کو بابو شیو پرشاد صاحب کے مسلمانوں کی نسبت چند ہی کلمات جو کچھ زیادہ سخت نہ تھے، ایسے برے معلوم ہوئے مگر جو ان کی (یعنی مسلمانوں کی) نیک نامی اور خوبی (یعنی بدی) ہر روز تمام ہندوستان کے اخباروں میں چھپتی رہی ہے اور کوئی نالائق پاجی پن کی حرکت ایسی نہیں ہے کہ جو مسلمانوں کی نسبت نہیں لکھی جاتی اور غیر مسلموں نے جو اپنے سفرناموں میں مسلمانوں کی نالایقیوں کا حال لکھا ہے اس سے آپ کو کیوں رنج نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان حالات سے آپ کو اطلاع نہیں ہوتی۔۔۔ ۲۸/اگست ۱۸۷۰ء کو ان شاء اللہ تعالیٰ میں لندن چھوڑوں گا۔ ایک ہفتہ مصر میں رہوں گا اور ان شاء اللہ تعالیٰ معہ الخیر ۲/اکتوبر ۱۸۷۰ء کو بمبئی میں پہنچوں گا اور چوتھی پانچویں کو ان شاء اللہ تعالیٰ الہ آباد میں آپ کے جمال مبارک کو دیکھوں گا۔

(صفحہ ۷۹)۔۔۔ 'الا جس قدر کہ میں تمھارے ہاں کے مولویوں سے ناراض ہوں، ایسا کسی سے ناراض نہیں، زندہ مولویوں اور بالتخصیص واعظوں کا

تو جانی دشمن ہوں اور گذشتہ مولویوں سے سوائے چند کے رنجیدہ ہوں کسی کو سوائے چند کے لکھنے اور کتاب تصنیف کرنے اور کسی بات کی تحقیق کرنے کا مطلق سلیقہ نہ تھا۔ صرف جنگل میں سے بھلی اور بری لکڑیاں چننے والے تھے۔ خدا ان پر رحم کرے اور ان کی تقلید کرنے والے اندھوں کو خدا ہدایت کرے۔ اگر چہ تم خفا ہو گئے ہو مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ سچے اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زیادہ زہر قاتل ہے۔'

مذکورہ بالا تحریریں نواب محسن الملک کو لکھے گئے خطوط سے نقل ہیں۔ اس مجموعے کے صفحہ ۳۰/ پر نواب محسن الملک کی تفصیلات کچھ اس طرح درج ہیں۔۔ مولوی سید مہدی علی اٹاوہ کے رہنے والے پہلے صوبۂ متحدہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اس کے بعد حیدر آباد دکن میں جا کر پولیٹکل سکریٹری ہوئے۔ وہیں محسن الملک کا خطاب پایا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ ۱۸۹۳ء میں پنشن پائی۔ سرسید کے ہمدم و ہمراز تھے۔ ۱۸۹۰ء میں مدرسۃ العلوم، علی گڑھ کے سکریٹری ہوئے ۔۱۴/ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو انتقال ہوا۔ علی گڑھ میں مدفون ہیں۔

اس مجموعے میں صفحہ ۸۱/ سے ۱۱۵/ تک مولوی مشتاق حسین صاحب نواب وقار الملک بہادر کے نام لکھے گئے خطوط شامل ہیں۔

(صفحہ ۸۸) 'آپ نے مولوی سمیع اللہ خان صاحب سے خط و کتابت کی۔ جن امور کو میں نے نامناسب سمجھا اس کو مولوی محمد اکبر یا مولوی سمیع اللہ خان صاحب سے بیان کیا۔' خاکسار سید احمد، علی گڑھ، ۳۰/ مارچ ۱۸۸۴ء

(صفحہ ۸۹) 'مجھے خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج و فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو و خط فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے سین ٹیفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اردو، ہندی ہو ترجمہ کتب بھی ہندی میں ہو۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔' خاکسار سید احمد، علی گڑھ، ۲۵/ جون ۱۸۸۴ء

(صفحہ ۹۱) 'سجاد حسین کو میں نے ترجمہ کے کام پر ساٹھ روپیہ ماہواری کا قوانین مدارس کے ترجمہ کے لئے نوکر رکھا۔ اس نے نہایت عمدہ ترجمہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد نہایت عمدہ اور چلتا ہوا مترجم ہو جاتا۔ چار پانچ ہی روز اس تقرر پر ہوئے تھے کہ مولوی سمیع اللہ خان اس کو اپنے ساتھ مصر لے جاتے ہیں۔'

(صفحہ ۹۲) 'میں کافر ہوں اگر یہ چاہتا ہوں کہ میری رائے و تدبیر مانی جاوے۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ قوم کی بھلائی پر لوگ متوجہ ہوں اور یہ دکھاتا ہوں کہ تعصب بہت بڑا مانع ہے۔'

(صفحہ ۹۴) 'اگر مجھ کو خدا ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔۔۔ قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ مسلمان، تیلی، جولاہوں، ناخواندہ یا کم علم مسلمانوں کو سزا دینے لگے گا تو بندہ سامنے ہو کر عرض کرے گا کہ جناب باری انصاف فرمایئے کہ ان بیچاروں کا کیا قصور ہے۔'

(صفحہ ۱۰۱)۔۔۔ 'ذرا مجھ کو یہ بات سمجھا تو دو کہ سید محمود کا تقرر خواہ ضروری تھا یا نہ تھا یا قبل از وقت تھا۔ مولوی س۔ خ۔ کو اس قدر شورش کرنے کی کیا وجہ ہے۔ مولوی س۔ خ۔ (سمیع اللہ خان) نے جو کچھ نسبت محمود کے لکھا بلاشبہ آپ کے دل کو تکلیف ہوئی ہوگی۔۔۔ مولوی س۔ خ۔ لکھتے ہیں کہ کون ممبر ہے جو اس بات کو پسند کرے گا کہ بورڈنگ ہاؤس ایک عیسائی کے ہاتھ میں رہے۔ مولوی س۔ خ۔ کا ایک ایک لفظ شرارت اور خبث طینت سے بھرا ہوا ہے۔۔۔ میں نے مولوی س۔ خ۔ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا کہ شاید کوئی شخص جس میں ذرا بھی نفس انسانی ہو نہیں کر سکتا لیکن اب مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی مجلس میں وہ اور میں جمع ہو جاویں گے تو آپ سن لیں گے کہ وہ معاملات پیش آئے جو پاجی سے پاجی اور شہدوں سے شہدوں میں بھی نہیں ہوں اور کیا عجب ہے کہ دونوں فوجداری کی حوالات میں تشریف لے جاویں۔' والسلام، خاکسار سید احمد، علی گڑھ ۷/ اگست ۱۸۸۹ء

(صفحہ ۱۱۲) 'ہمارے کالج میں علاوہ یونین کلب کے مسٹر آرنالڈ پروفیسر نے لائق اور ذی استعداد اور ذی شعور طالب علموں کی اخلاقی تعلیم کے لئے ایک سوسائٹی قائم کی ہے اور اخوان الصفا اس کا نام رکھا ہے۔ افتتاحی اسپیچ جو انھوں نے کی وہ اردو میں بطور رسالہ کے چھاپہ ہوئی ہے۔ تین امر آپ کے غور کے

لائق ہیں۔اول اس کو پڑھو اور انصاف کرو کہ ہم کو الزام دینا کہ ہم نے نالائق یا نا قابل پروفیسر کالج میں جمع کئے ہیں۔کیا یہ صحیح ہے؟ دوم بورڈنگ ہوس میں ان پروفیسروں کو پوری مداخلت دینا اور طالب علموں اور ان پروفیسروں میں دوستانہ، مشفقانہ، مؤدبانہ ربط وضبط بڑھنے دینا کیا ہمارا جرم ہے۔سوم کوئی کالج مسلمانی یا انگریزی اور ہندوستانی ریاستوں کا ایسا بتا سکتے ہو جس میں اس قسم کی تعلیم کے سامان مہیا ہو سکتے ہیں۔جو لوگ ہمارے کالج کے طالب علموں اور ان کے مربیوں کو اغوا کرتے ہیں اور خطوط لکھتے ہیں کہ علی گڑھ کالج چھوڑ کر الہ آباد بورڈنگ ہاوس چلے آؤ کیا وہ قوم کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں۔

خاکسار سید احمد، علی گڑھ، ۳۰/نومبر ۱۸۹۰ء

میں الہ آباد تھا ابھی آیا ہوں حال میں۔'

(صفحہ ۱۱۵) الہ آباد سے مولوی مشتاق حسین کے نام خط ہے جس میں بھوپال اور حیدر آباد جانے اور آسمان منزل کی تعمیر کے لئے مزید چندہ اکٹھا کرنے کی بات لکھی ہے۔یہ خط ۳۱/جولائی ۱۸۹۱ء کو لکھا گیا ہے۔اس کے علاوہ ۲۷/ستمبر اور ۲۳/نومبر ۱۸۹۱ء کے دو خط الہ آباد سے لکھے ہیں نیز خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی کے نام لکھے گئے خطوط ہیں۔یہاں مولوی ذکاء اللہ کے بارے میں ایک نوٹ درج ہے۔'مرحوم ہندوستان کے مشہور مصنفین میں سے تھے۔میور سنٹرل کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے۔۱۹۱۰ء میں وفات پائی'۔یہ خطوط ۱۶/مئی ۱۸۹۲ء، ۲۶/ستمبر ۱۸۹۳ء، ۲۹/جولائی ۱۸۹۵ء، ۵/جولائی ۱۸۹۶ء، ۱۴/جولائی ۱۸۹۶ء، ۸/اور ۱۰/نومبر ۱۸۹۷ء کو علی گڑھ سے لکھے گئے۔

(صفحہ ۱۴۵) جناب مخدوم مکرم معظم من باعث افتخار نواب عماد الملک بہادر

میں کل الہ آباد پہنچا۔آپ نے جو عنایت ومحبت وشفقت بمقام حیدر آباد فرمائی اس کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا اور نہ آپ کا شکر ادا کرنے کی ضرورت ہے۔آپ نے ترجمۂ قرآن مجید کی چند کاپیاں دینی فرمائی تھیں وہ رہ گئیں۔امید کہ دو کاپیاں میرے پاس بمقام علی گڑھ بھیج دیجئے اور سید محمود کے پاس جو کاپی بھیجئے وہ سیدھی ان کے پاس بھیج دیجئے۔عزیزی مہدی حسن طال عمرہٗ کو بہت بہت سلام۔والسلام

خاکسار سید احمد، الہ آباد، ۲۷/ستمبر ۱۸۹۱ء

(صفحہ ۱۴۷) نواب عماد الملک کو لکھے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

'۔۔۔گر خدا کو مسلمانوں کے حق میں کچھ بہتر کرنا ہے تو یہ مدرسہ قائم اور سرسبز رکھے گا ورنہ جو خدا کی مرضی۔اس وقت کالج کلاسوں میں ۲۰۵/طالب علم ہیں۔منجملہ ان کے ۱۶۸/مسلمان ہیں۔اگر شمال مغربی اضلاع کے کل کالجوں کے کالج کلاسس کے مسلمان طالب علموں کو شمار کر لیا جاوے تو بھی ان کی تعداد ہمارے کالج کے مسلمان طالب علموں کے نصف سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

اسکول کلاسوں میں ۳۶۱/طالب علم ہیں جس میں سے ۲۸۹/مسلمان ہیں۔یہ تعداد مسلمانوں کی بھی کچھ کم نہیں ہے۔غرض کہ کل کالج اور اسکول کے طالب علموں کی تعداد ۵۶۶/ہے اور لاء کلاس میں ۹۰/طالب علم ہیں۔پس کل تعداد طالب علموں کی ۶۵۶/ہے۔زیادہ تر تعجب کی یہ بات ہے کہ ۳۳۵/طالب علم بورڈر ہیں اور سب آپس میں ملے ہوئے اور نہایت شاداں اور فرحاں رہتے ہیں۔علاوہ معمولی تعلیم کالج کے یونین کلب ہے جس میں وقتاً فوقتاً انگریزی زبان میں تقریریں اور مباحثہ ہوتا ہے۔پھر ایک لجنۃ الادب ہے جس میں عربی خواں طالب علم اور مدرس اور بعض دیگر احباب شریک ہوتے ہیں اور کل گفتگو اور مباحثہ جو کچھ ہوتا ہے عربی زبان میں ہوتا ہے اور جو عربی زبان میں نہایت عمدہ اور شستہ گفتگو کرتا ہے اس کو انعام دیا جاتا ہے۔'

(صفحہ ۱۴۹) نواب عماد الملک بہادر کو اطلاع دے رہے ہیں کہ آنریبل سر ولیم میور، ایل ایل ڈی، کے سی۔ایس۔آئی۔ہمارے کالج کے وزیٹروں کی فہرست میں شامل ہیں۔یہ خط ۳/مئی ۱۸۹۵ء کو علی گڑھ سے لکھا گیا۔

(صفحہ ۱۸۹) مخدومی منشی احمد خان صاحب صوفی اس خط کو پڑھئے۔جو جواب میں نے بھیجا ہے اس کی نقل ذیل میں ثبت ہے۔والسلام، خاکسار، سید احمد، الہ آباد ۱۰/جنوری ۱۸۹۱ء

(صفحہ ۱۹۵) محمد عنایت اللہ کو ۲۹/اکتوبر ۱۸۹۲ء کو علی گڑھ سے خط لکھ کر ۱۵/نومبر کو الہ آباد آنے کی اطلاع دیتے ہیں۔

(صفحہ ۱۹۵) عزیزی محمد عنایت اللہ

امید ہے کہ تمھاری طبیعت سب طرح اچھی ہوگی۔تم نے جو بیرونی کی لائف لکھی تھی اور وہ پچھلے سال کانفرنس میں پیش نہیں ہوسکی تھی اس سال اس کو پیش کردو۔اس کے پڑھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔صرف تھوڑی سی گفتگو کے بعد پیش کرسکو گے۔بعض حالات دیکھنے کو انگریزی کتاب انڈیا بیرونی کی تم کو ضرورت تھی وہ میں نے رکھ لی۔پس اس رسالے کو پیش کردینے میں کچھ دقت نہیں ہے۔

والسلام، خاکسار، سید احمد، الہ آباد ۲/دسمبر ۱۸۹۲ء

محمد عنایت اللہ کو چار اور خط الہ آباد سے ۶/دسمبر ۱۸۹۲ء، ۱۲/دسمبر ۱۸۹۲ء، ۱۵/جنوری ۱۸۹۳ء اور ۲۵/جنوری ۱۸۹۳ء کو لکھے گئے ہیں۔سرسید نے ۷/اگست ۱۸۸۹ء اور ۳۰/نومبر ۱۸۹۰ء کو جو خطوط لکھے ان میں مولوی س۔خ۔یعنی مولوی سمیع اللہ خان سے انتہائی خفگی کا اظہار کیا ہے۔اس حد تک کہ ان کا پورا نام لکھنا بھی انھیں گوارا نہ تھا۔مولوی سمیع اللہ خان کی پیدائش ۱۸۳۴ء بمقام دہلی اور وفات ۷/اپریل ۱۹۰۸ء کو واقع ہوئی۔آپ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے احاطے میں دفن ہیں۔آپ نے ۱۸۵۷ء میں اپنے اور سرسید کے افراد خانہ کی جان بچا کر انھیں بستی نظام الدین میں حفاظت کے ساتھ پہنچایا تھا۔وہ سرسید کی تعلیمی فکر کے شروعاتی دور کے حامی رہے۔سرسید جس ایجوکیشنل سوسائٹی کے پریسیڈنٹ ہوتے تو مولوی سمیع اللہ اس کے سکریٹری بنائے جاتے۔کئی معاملات میں مولوی سمیع اللہ کو سرسید سے سخت اختلاف بھی رہا۔مثلاً وہ علی گڑھ کالج انتظامیہ کو پوری طرح انگریزوں کے ہاتھ سونپے جانے کے خلاف تھے۔اسی طرح سید محمود کو بورڈ آف ٹرسٹیز کا چیرمین بنائے جانے پر انھوں نے سخت اعتراض کیا۔سرسید اور مولوی سمیع اللہ کے مابین اختلاف ایم اے او کالج کے لئے نقصاندہ ثابت ہوا مگر یہی اختلاف الہ آباد کے لئے مسلم بورڈنگ ہاؤس کی شکل میں ایک بڑی نعمت بن کر سامنے آیا۔مسلم بورڈنگ ہاؤس الہ آباد یونیورسٹی کا ایک ہاسٹل ہے جو عموماً ایم بی ہاؤس کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس کا قیام سرسید کے خط کی تحریر کے مطابق ۱۸۹۰ء میں عمل میں آچکا تھا اور جنگ بہادر مولوی سمیع اللہ خان، سب جج علی گڑھ اس کے بانی ہیں۔یوں تو الہ آباد یونیورسٹی نے ایک اسپیشل ایکٹ کے تحت ۱۹۲۱ء سے آزادانہ طور پر کام کرنا شروع کیا مگر یہاں تک پہنچنے کے لئے اسے تقریباً نصف صدی کا سفر طے کرنا پڑا۔شہر الہ آباد کو انگریزی عہد میں مرکزی حیثیت حاصل رہی لہٰذا انگریزوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے یہاں اسکول قائم کرلئے۔بوایز ہائی اسکول ۱۸۶۴ء میں اور سینٹ جوزف اسکول ۱۸۸۴ء میں شروع کئے جاچکے تھے۔میور آباد نام سے ایک بستی بھی بسادی گئی تھی۔اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ درپیش تھا۔محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔کلکتہ، بامبے اور مدراس یونیورسٹیز اپنے وجود کا لوہا منوا رہی تھیں۔پنجاب یونیورسٹی اور اس کے اورینٹل ڈپارٹمنٹ کا شہرہ چاروں طرف تھا۔ایک بڑی دقت جو سامنے تھی وہ یہ تھی کہ کلکتہ اور پنجاب کے درمیان فاصلہ زیادہ اور اعلیٰ تعلیم کے مراکز کا فقدان تھا۔مشہور مؤرخ آوریل پاویل کے مطابق سرسید احمد خاں اور لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور کے درمیان اس سلسلے میں تبادلہ خیال ہوا جس کے مدّنظر سر ولیم میور نے ۱۸۷۲ء میں ایک سنٹرل کالج کی شروعات کی جو بعد میں میور سنٹرل کالج کہلایا۔جولائی ۱۸۷۲ء میں اس کا پہلا سیشن انڈین پریس کی بلڈنگ میں شروع ہوا۔۱۸۸۰ء تک اس کالج نے شمالی ہندوستان کے سب سے اچھے ادارے کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرلی تھی۔ولیم میور نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام میں بھی خاصی دلچسپی دکھائی تھی۔مولوی سمیع اللہ خان سے بھی ان کے مراسم تھے جو بعد میں الہ آباد کے مسلم بورڈنگ ہاؤس کے قیام میں معاون ثابت ہوئے۔

جولائی ۱۸۷۶ء میں سرسید ملازمت سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ لوٹے۔اس وقت مولوی سمیع اللہ خان پوری لگن کے ساتھ ایم اے او کالج کا ابتدائی مدرسہ چلا رہے تھے۔چنانچہ سر ولیم میور نے ۲۴/مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسہ کا باقاعدہ افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ مولوی سمیع اللہ خان سب آرڈینیٹ جج نے دل و جان سے اس مدرسہ کے لئے محنت کی ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں جو نمایاں ترقی اس نے کی وہ بہت حد تک انھیں کی وجہ سے ہے۔ولیم میور نے اس مدرسہ کی مالی اعانت بھی کی۔اس کی شروعات چار بچوں سے ہوئی جس میں سے ایک مولوی سمیع اللہ خان کے بیٹے حمید اللہ خان بھی تھے۔وہ بعد میں افضل العلماء مولوی محمد حمید اللہ خان نواب سر بلند جنگ بہادر کے نام سے مشہور ہوئے اور چیف جسٹس آف حیدرآباد بھی رہے۔

خواجہ محمد یوسف اور مولوی سمیع اللہ خان مشن سرسید کے شروعاتی دنوں کے سب سے بڑے حامی و مددگار تھے۔خواجہ محمد یوسف علی گڑھ کے زمیندار اور

مشہور وکیل تھے۔انھیں محسوس ہوا کہ انگریزی تعلیم کی خوبیاں اپنائی جانی چاہئیں۔ان کے بڑے بیٹے یحییٰ کی جلد وفات ہوگئی تھی مگر دوسرے بیٹے عبدالمجید خواجہ نے کرائسٹ چرچ لندن سے تعلیم حاصل کی۔وہاں ان کی دوستی جواہر لعل نہرو سے ہوئی۔اس وقت ان کے والد موتی لعل نہرو الہ آباد ہائی کورٹ میں وکیل تھے۔خواجہ محمد یوسف اور موتی لعل نہرو کے ذاتی اور پیشہ ورانہ تعلقات تھے۔انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی میں انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کرنے میں بہت مدد کی۔ان کا مالی تعاون بھی جاری رہا جس کے لئے انھوں نے گھوم گھوم کر چندہ اکٹھا کیا۔ان کے ساتھ ظہور حسین اور زین العابدین اور کچھ چھوٹی نسل کے لوگ جن میں سرسید کے صاحب زادے سید محمود اور مولوی سمیع اللہ خان کے بیٹے حمید اللہ خان شامل ہوتے تھے۔بعد میں حمید اللہ خان کی بیٹی یعنی مولوی سمیع اللہ خان کی پوتی خورشید کی شادی خواجہ یوسف کے بیٹے عبدالمجید خواجہ سے ہوئی اور وہ بیگم خورشید خواجہ کے نام سے معروف ہوئیں۔یہ دونوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں شامل ہیں۔عبدالمجید خواجہ کے تین بیٹے جمال خواجہ، رشید خواجہ، اجمل خواجہ اور چھ بیٹیاں تھیں۔دہلی کے سابق لفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ حمید اللہ خان کے پوتے اور بیگم خورشید خواجہ کے بھتیجے ہیں جب کہ ۱۹۳۵ء میں قائم ہونے والی CIPLA Pharmaceutical کمپنی کے بانی خواجہ عبدالحمید خواجہ یوسف کے بھتیجے ہیں۔

مولوی سمیع اللہ خان منشی محمد عزیز اللہ خان کے صاحبزادے تھے۔اس خاندان کا شمار دہلی کے عمائدین میں ہوتا تھا۔آپ نے مولانا مملوک علی نانوتوی اور دہلی کے دیگر علماء کبار سے تعلیم حاصل کی۔سرسید، مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے بھی انھیں اساتذہ کرام کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں آپ منصف مقرر ہوئے اور ۱۸۷۳ء میں آپ سب جج ہوئے۔اسی دوران آپ نے اینگلو اورینٹل اسکول کی ذمہ داریاں نبھائیں۔۱۸۸۴ء میں لارڈ نارتھ بروک ایک مشن لے کر مصر گئے تو آپ بطور مشیر اور عربی دان ساتھ گئے۔وہاں سے واپسی پر آپ کو خطاب سے نوازا گیا۔اس کے بعد آپ ڈسٹرکٹ جج اور پھر سیشن جج ہوئے۔نومبر ۱۸۹۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔آپ کو CMG یعنی انگریزوں کا چھٹا سب سے اونچا رینک حاصل تھا۔

مولوی سمیع اللہ خان نے عمر کا ایک بڑا حصہ سرسید کی معیت میں گذارا مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ سرسید کی ہر بات سے اتفاق کرتے ہوں۔مثلاً جب سرسید نے الفنسٹن کی کتاب تاریخ ہند کا ترجمہ کیا تو حضور ﷺ کی شان میں جو گستاخانہ لفظ الفنسٹن نے استعمال کیا تھا، وہی لفظ سرسید نے استعمال کر دیا۔اس پر مولوی سمیع اللہ خان نے شدید اعتراض کیا۔دوسرا موقعہ تب آیا جب علی گڑھ کالج کا انتظام بورڈ آف ٹرسٹیز کے ہاتھوں میں جانا تھا۔ابھی تک کالج کا انتظام مینیجنگ کمیٹی کرتی تھی۔جس کے سکریٹری سرسید تھے۔۱۸۸۹ء سرسید نے ایک ٹرسٹی بل کی تجویز رکھی۔اس بل کی ایک دفعہ یہ تھی کہ بورڈ آف ٹرسٹیز کے سکریٹری سرسید ہوں اور جوائنٹ سکریٹری ان کے صاحبزادے سید محمود ہوں، تاکہ سرسید کے بعد وہ سکریٹری ہوسکیں۔مولوی سمیع اللہ خان نے اس دفعہ کی مخالفت کی کیونکہ سرسید کی غیر موجودگی میں انھوں نے بڑی جاں فشانی سے اس ادارے کو چلایا تھا دوسرے سید محمود سے زیادہ تر لوگ ناخوش تھے۔ان سب کے باوجود جب بل پاس ہوگیا تو سمیع اللہ خان رنجیدہ خاطر ہوئے۔قوم کی حالت ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔اسی اثنا ایک منفرد خیال ان کے ذہن میں انگڑائی لینے لگا اور وہ الہ آباد چلے آئے۔یہاں ۱۸۹۰ء میں انھوں نے مسلم بورڈنگ ہاؤس کی بنیاد ڈالی۔مولانا سمیع اللہ خان کشادہ ذہن کے مالک تھے۔مسلمانوں کی تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج کے معاملات سے واقف تھے۔الہ آباد میں میور کالج بڑی عمدگی سے چل رہا تھا۔ولیم میور سے ان کی واقفیت تو تھی ہی، لہٰذا انھوں نے قومی تعلیم کے مسئلے کو حل کرنے کا ایک جداگانہ طریقہ نکالا۔انھیں محسوس ہوا کہ جو ادارے خاص مسلمانوں کے لئے قائم ہیں ان کا تعلیمی معیار پست ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بچوں کا ملنا جلنا دوسری قوم کے بچوں سے نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کا مقابلہ ان سے ہو پاتا ہے۔ان کے سامنے سر فضل حسنین کی کارکردگیاں بھی تھیں جو پندرہ سال انجمن حمایت اسلام لاہور کے سکریٹری رہے اور اسلامیہ کالج لاہور کے روح رواں تھے۔جب وہ پنجاب میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے تو انھوں نے اسلامیہ اسکولوں کی مدد کرنے کی بجائے گورنمنٹ کالج لاہور، میڈیکل کالج لاہور اور دوسرے سرکاری اداروں میں مسلم طلباء کے داخلے کا خاطر خواہ انتظام کیا اور ان کی تعداد مقرر کر دی تاکہ ان کا داخلہ آسانی سے ہو جائے اور وہ دوسری قوم کے بچوں کے ساتھ تعلیم حاصل کریں۔مولوی سمیع اللہ خان نے بھی مسلم بورڈنگ ہاؤس کی صورت میں ایک حل نکالا۔ان کا خیال تھا کہ مسلم طلباء ایک جگہ رہیں گے تو اس سے ان کی قومی روایات محفوظ رہیں گی مگر وہ تعلیم دوسرے اداروں میں جا کر حاصل کریں گے۔ان کے ساتھ کلاس روم میں ہوں گے اور ساتھ بیٹھ کر امتحان دیں گے۔انھیں یہ حل قومی کالج قائم کرنے سے بہتر نظر آیا۔مولوی سمیع اللہ

خان کے اس اقدام کی سب سے زیادہ مخالفت شبلی نے کی۔ٹرسٹی بل کے پاس ہونے کے وقت بھی شبلی سید محمود کی حمایت میں کھڑے ہو گئے تھے۔حالانکہ یہ مولوی سمیع اللہ خان تھے جن کی مردم شناس آنکھوں نے شبلی کو پہچانا اور ایم اے او کالج کے فارسی کے استاد کے لئے سرسید سے ان کی سفارش کی۔شبلی نے مولانا سمیع اللہ خان کے خلاف بہت زہر افشانی کی۔مسلم بورڈنگ کو انھوں نے مسجد ضرار کا نام دے دیا تھا۔حالانکہ کافی عرصہ بعد شبلی نے مولانا سمیع اللہ خان کی دور اندیشی کا اعتراف کیا اور اپنے ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں لکھا کہ اسلامی بورڈنگ بنانا زیادہ مفید ہے جس میں اخلاقی اور مذہبی تربیت ہو۔باقی تعلیم تو کسی بھی اسکول میں حاصل کی جاسکتی ہے۔آج مولوی سمیع اللہ خان ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کے وژن اور سرسید کی تعلیمی فکر کا ثمرہ ہمارے سامنے ہے جس کی بدولت مسلم بورڈنگ ہاؤس کے طلباء ہندوستان کی کسی بھی قوم کے طلباء کے شانہ بہ شانہ قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔

بیگم خورشید خواجہ نے اپنے دادا مولوی سمیع اللہ خان کی فکری نہج پر قدم رکھا اور ان کے تعلیمی مشن کو فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔وہ اپنے والدین یعنی محمد حمید اللہ خان نواب سر بلند بہادر جنگ اور بیگم اختر سر بلند جنگ کی پہلی اولاد تھیں۔انھوں نے بہت شروع ہی میں پردہ ترک کر دیا اور سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگیں۔انھوں نے تعلیم نسواں اور خواتین کی فکری آزادی پر بہت کام کیا۔نہرو خاندان سے اور بالخصوص پدمجا نائڈو اور وجے لکشمی پنڈت سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔پدمجا حیدرآباد میں ان کی ہم جماعت تھیں۔خورشید خواجہ الہ آباد کی پہلی مسلم خاتون تھیں جنھوں نے اپنی بیٹیوں کو سینٹ میریز کانونٹ کی بورڈنگ میں ڈالا۔آنجہانی اندرا گاندھی بھی کچھ وقت کے لئے یہاں کی طالبہ رہیں۔عدم تعاون تحریک کے زمانے میں بیگم خورشید خواجہ عجب تذبذب میں مبتلا ہو گئیں۔ان کے والد محمد حمید اللہ مغربی تہذیب سے متاثر آزاد خیال انسان تھے۔وہ برٹش رول کی حمایت کرتے تھے جب کہ ان کے شوہر گاندھی جی کا ساتھ دے رہے تھے۔انھوں نے اپنے انگریزی طرز کے تمام کپڑے نذر آتش کئے اور کھادی اختیار کر لیا۔بیگم خورشید نے بھی اپنے سارے فیشن والے کپڑے آگ میں ڈالے اور زیور آزادی کی مہم کے اخراجات کے لئے دے دئے۔عبدالمجید خواجہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔انھوں نے عربی فارسی اور اردو کی تعلیم لینے کے بعد ایم اے او کالج لاہور میں داخلہ لیا۔اس کے بعد انھیں ۱۹۰۶ء کیمبرج بھیج دیا گیا اور وہاں سے انھوں نے ہسٹری میں گریجویشن کی۔ کیمبرج میں سر شاہ سلیمان جیسے قانون داں، پنڈت جواہر لعل نہرو ہمارے پہلے وزیر اعظم اور محمد اقبال جیسے فلاسفر اور شاعر ان کے ساتھ تھے۔وہیں ان کی ملاقات ساؤتھ افریقہ میں شہرت رکھنے والے گاندھی سے ہوئی۔۱۹۱۰ء میں وہ ہندوستان واپس آئے اور علی گڑھ ڈسٹرکٹ کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی پھر پٹنہ ہائی کورٹ چلے گئے۔۱۹۱۹ء میں انھوں نے مہاتما گاندھی کی ایک آواز پر پریکٹس چھوڑ دی اور سول نافرمانی تحریک میں شامل ہو گئے۔وہ خلافت تحریک کے بھی رکن رہے اور چھ ماہ کے لئے جیل گئے۔۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام میں مشغول رہے۔۱۹۲۶ء میں انھوں نے الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔اب وہ کچھ گھریلو اور صحت کے مسائل کی بنا پر سیاست میں فعال نہ رہ سکے حالانکہ جامعہ اور انڈین نیشنل کانگریس کو ان کا تعاون آخر عمر تک جاری رہا۔۱۹۳۶ء میں وہ جامعہ کے چانسلر مقرر کئے گئے اور اس عہدے پر تاحیات بنے رہے۔

بیگم خورشید خواجہ، محمد حمید اللہ خان نواب سر بلند جنگ سابق چیف جسٹس حیدرآباد کی بیٹی اور علی گڑھ کی اعلیٰ شخصیات میں سے ایک خواجہ محمد یوسف کی بہو نے الہ آباد کی تنگ گلیوں والے محلے پتھر گلی میں مسلم لڑکیوں کی تعلیم کی خاطر پانچ لڑکیوں کو لے کر ۱۹۳۰ء میں ایک اسکول شروع کر دیا۔اسکول کی ابتدا پتھر گلی ،شاہ گنج واقع سید علی زیدی کے مکان سے ہوئی۔ان کی مدد کو دو اور خواتین بیگم شمس الضحیٰ زیدی اور مسز مادھولال بھی آ گئیں۔لڑکیوں کی تعداد بڑھنے لگی اور جلد ہی اس نے ایک اسکول کی شکل اختیار کر لی۔بیگم خورشید خواجہ نے اپنے والد صاحب کے نام پر اس کا نام حمیدیہ اسکول رکھ دیا۔جولائی ۱۹۳۲ء میں Ms. D. Bewen اس کی پرنسپل بنائی گئیں۔اس کے بعد حمیدیہ اسکول کی مینیجنگ کمیٹی تشکیل دی گئی۔بیگم خورشید خواجہ اس کی پہلی مینیجر بنیں اور ۱۹۴۲ء تک اس عہدے پر فائز رہیں۔اس کے بعد Association For The Education Of Muslim Women At Allahabad کا قیام عمل میں آیا۔سر شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس آف الہ آباد ہائی کورٹ اس اسوسیشن کے پہلے پریسیڈنٹ بنائے گئے۔آپ ۱۶/ مارچ ۱۹۳۲ء سے ۳۰/ ستمبر ۱۹۳۷ء تک الہ آباد ہائی کورٹ کے پہلے انڈین اور سب سے کم عمر کے چیف جسٹس ہوئے۔آپ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔حمیدیہ اسکول کی روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے ایک مخیّر خاتون بیگم محمود جہاں نے اپنا محل نما گھر اسکول انتظامیہ کے حوالے کر دیا۔اسی بلڈنگ میں آج حمیدیہ گرلز انٹر کالج چل رہا

ہے جس میں تقریباً ۲۷۰۰/طالبات تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ابتدائی کئی برسوں تک یہاں پرنسپل کے عہدے پر کرسچن خواتین کا تقرر ہوتا رہا اس خیال سے کہ یہاں کی طالبات کو انگریزی زبان پر دسترس ہو اور اسکولی نظم ونسق بہتر طور پر قائم رہے۔اسے سرسید کے تعلیمی مشن کی توسیع کے طور پر دیکھا جانا چاہئے۔یہاں کی پرنسپلس کی فہرست اس طرح ہے:

1.Ms.D.Bewen, July 1932 to June 1935

2. Mrs. Wesley, July 1935 to January 1936

3. Mrs. Stephens, February 1936 to June 1936

4.Ms. A. Joel, July 1936 to December 1939

5. Mrs. A. Elias, January 1940 to August 1940

6. Mrs. L. Lewis, September 1940 to January 1941

7. Mrs. N. Shamsuddin, February 1941 to September 1941

8. Mrs.A.Elias, October 1941 to June 1942

9. Mrs. Yohan Masih, July 1942 to 15.4.1944

10. Mrs. A. Elias, 16.4.1944 to December 1944

11. Mrs. I. Prett, January 1945 to December 1945

12. Mrs.Sirkar, January 1946 to 12.7.1950

13. Ms. Jamila Khatoon, 13.7.1950 to October 1954

14. Ms.M.V.Singh, 19.1.1955 to 15.9.1961

15. Mrs.Mehrunnia Hasan, 16.9.1961 to 19.10.1964

16.Ms.Uma Srivastav 20.10.1964 to 5.11.1967

17.Mrs.H.Nighat, 6.11.1967 to 30.6.1999

18.Mrs.Abida Hasan, 1.7.1999 to 30.6.2000

19. Mrs.K.N.Sabir, 1.7.2000 to 30.6.2002

20. Ms.Nooru Sabah, 1.7.2002 to 11.7.2002

21. Mrs.Shamim Bano, 12.7.2002 to 31.7.2018

22. Mrs.Talat Iqbal, 1.8.2018 to 31.3.2020

23.Dr.Hamida Bano, 1.4.2020 to present

اسی طرح اسوسیشن کے پہلے پریسیڈنٹ آنریبل چیف جسٹس سر شاہ محمد سلیمان ان کے بعد بتدریج بیگم سلیمان، محترمہ محمود جہاں بیگم، بیگم تارا رشید شروانی اور بیگم راشدہ ایم۔زیڈ۔خان کے نام آتے ہیں۔

ڈاکٹر حمیدہ بانو موجودہ پرنسپل حمیدیہ گرلز انٹر کالج یہیں کی فارغ طالبہ ہیں۔۱۹۷۵ء میں حمیدیہ انٹر کالج ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ڈگری کالج کی صورت اختیار کر گیا اور آج یہ الہ آباد یونیورسٹی سے منسلک ایک مائینارٹی پی جی کالج ہے۔بیگم خورشید خواجہ کے چھوٹے بیٹے جناب اجمل خواجہ نے اس کی بلڈنگ کی توسیع

کے لئے ایک خطیر رقم کا عطیہ دیا۔اس کی موجودہ پرنسپل پروفیسر ناصحہ عثمانی بھی حمیدیہ انٹر کالج کی سابق طالبہ ہیں۔راقم الحروف کو بھی اسی مادر علمی کی آغوش میں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۴ء تک تعلیم وتربیت کے حصول کا شرف حاصل ہوااور بحیثیت صدر شعبہ عربی وفارسی ،الہ آباد یونیورسٹی، یوپی بورڈ کے ۱۹۲۱ء میں صد سالہ جشن کے موقع پر Best Alumnae کے زمرے میں حمیدیہ انٹر کالج کی جانب سے اس کا نام درج ہے۔

الغرض مذکورہ بالا تعلیمی ادارے اوران سے مستفید ہونے والے طلباء بالواسطہ یا بلاواسطہ سرسید کے تعلیمی نظرئے کے مرہون منت ہیں۔آوریل اے پاویل کے بیانات اور سرسید کے خطوط اس کی تصدیق کرتے ہیں۔سر ولیم میور کا سرسید سے مشورہ کر کالج قائم کرنا،اس کا الہ آباد یونیورسٹی میں تبدیل ہو جانا، ولیم میور کی مدد سے مسلم بورڈنگ ہاؤس کا قیام،مولوی سمیع اللہ خان کے افراد خانہ کی تعلیمی دلچسپی کے سبب ایک طرف جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وجود میں آنا اور الہ آباد میں فروغ تعلیم نسواں ،ان تمام کے پیچھے سرسید کا تعلیمی نظریہ کارفرما ہے اور ہم سب اس کے مرہون منت ہیں۔گو آج سرسید اوران کے تعلیمی نظریہ کو فروغ دینے والے حضرات ہمارے درمیان نہیں ہیں مگران کی فکر خوشبو بن کر فضا میں ہر چہار سو بکھری ہوئی ہے اور ہم سے تقاضہ کر رہی ہے کہ قوم کے ہر فرد کے مشام تک اس کے معطر پیغام کو پہنچادیں۔

☆☆☆

سرسید اور اسباب بغاوتِ ہند

مذکورہ موضوع پر محو خیال ہوتے ہوئے ایک سوال ذہن میں جنم لیتا ہے کہ حقیقی معنی میں مفکر قوم، مصلح قوم، مونس وغم خوار قوم اور معمار قوم کسے کہا جائے؟ تو یہی جواب ابھر کر آتا ہے کہ سرسید احمد خاں! اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید کی فکر رسا، روشن خیالی اور پرواز تخیل انسانی کینوس پر درخشندہ ستارے کی طرح تابناک ہے جس کی تابانی کئی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کم نہیں پڑی تعمیر ملت کے لئے اٹھایا ہوا ان کا ہر مثبت قدم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ''اسباب بغاوت ہند'' کو بھی آزادیٔ ہند کا پہلا سنگ میل کہنا غلط نہ ہوگا۔

سرسید کی زندگی کا بغور جائزہ لیں تو ان کی پوری زندگی اخلاص و بلند ہمتی اور آہنی عزم و ارادے کی بدلتی ہوئی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کی الم ناکیوں، ناگفتہ بہ حالات اور فرنگیوں کی جانب سے ہونے والے مظالم و بربریت کا اپنی تخلیقات میں جس طرح ذکر کیا وہ بے مثل ہے۔ سرسید نے جس دور میں ہوش سنبھالا ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی دل خراش داستان بکھری دیکھا اس انقلاب نے ہزار ہا انسانوں کو تہہ تیغ کر دیا، لوگوں کو سولیوں پر لٹکایا گیا، بے گھر کیا گیا، لوگ نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔ جیلوں کو انسانوں سے بھر دیا گیا غرض ظلم و زیادتی کے حدود کو تجاوز کر کے انسانیت کو شرمسار کئے جانے کا عمل جاری تھا۔

سرزمین ہند پر مسلمان ایک فاتح قوم کی حیثیت رکھتے تھے لیکن غیر متحد ہونے اور خلفشار کے سبب ملک بھی ہاتھوں سے جاتا دکھائی دینے لگا، شان و شوکت سربلندی زوال پذیر ہوگئی۔ اقتدار کا خاتمہ ہوا انگریزوں نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا کیوں کہ انھیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ پورا کھیل مسلمانوں کا رچا ہوا ہے اس لئے شک کی بناء پر بھی بہت سے مسلمانوں کو قتل کروایا گیا۔

یہ سب دیکھ کر سرسید بے چین ہو گئے اور مسئلے کا حل تلاش کرنے لگے کہ کس طرح مسلمان فرنگیوں کی درندگی کا نشانہ نہ بن سکیں ان کی قومی ہمدردی اور حب الوطنی کی ایک مثال ہے ''اسباب بغاوت ہند'' جو ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے اسباب و علل کو زمینی سطح پر روبرو کرایا گیا۔ اور انگریزوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش بھی کی گئی کہ اس ہنگامے کے ذمہ دار صرف مسلمان نہیں بلکہ انگریزوں کی پالیسی بھی ہے اس میں کچھ حد تک سرسید کامیاب بھی ہوئے یہ ایک طرح سے ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کی روک تھام کی کامیاب کوشش تھی یہ بات فراموش نہیں کی جاسکتی کہ جس وقت سرسید نے اسباب بغاوت ہند لکھ کر گورنمنٹ میں پیش کیا۔ وہ ایک ایسا نازک وقت تھا کہ اس وقت کسی کو آزادانہ رائے ظاہر کرنے کی جرأت نہ تھی، چنانچہ کسی قدر ان کو اپنی جرأت اور دلیری کا خمیازہ بھگتنا بھی پڑا بعض جلیل القدر انگریز ان کے سخت مخالف ہو گئے جس سے کچھ دنوں بعد وہ مارشل لاء کی زد میں رہے۔

بقول خواجہ الطاف حسین حالؔی

> ''اسباب بغاوت ہند میں جو کچھ سرسید نے لکھا وہ تمام اینگلو انڈینز بلکہ شاید تمام انگلش نیشن کی رائے کے برخلاف تھا اور اسی لئے اس کا مارشل لاء کے دور میں شائع کرنا خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔ باوجود اس کے جس دھڑلے سے اس کا بڑا حصہ منوایا گیا اور جو کام کہ اس نے اعیان سلطنت کے غیض و غضب کی آگ بجھانے میں کیا اور جو عمدہ نتائج اس پر مرتب ہوئے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کس قدر مدلل اور موجہ لکھا گیا تھا اور اس میں کیسے صحیح اصول پر استدلال کیا گیا تھا۔''[1]

سرسید کی قومی ہمدردی خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

> ''میں اپنی قوم کو آسمان کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب یہی رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو میں اس کے حصہ کو جو نیلا نیلا سیاہ اور ڈراؤنی دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پروا نہیں کرتا مگر میں ان

ڈاکٹر زرینہ بیگم، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، پریاگ راج

ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس وقت چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جن کے سبب سے اس تمام سیاہ آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔

اے صاحبو کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو تمہاری قوم میں ایسے ہی چمکتے ہوں جیسے آسمان پر تارے اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی آنکھ میں باعزت بنا سکتے ہو۔''[۲]

سرسید ایک وسیع النظر شخصیت تھے پوری دنیا کے مسلم نقشے پر جب نظر ڈالی تو مسلمانوں کو انتہائی مغلوب اور محکوم حالات میں دیکھا ان کو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے امید کی کوئی بھی کرن نہیں دکھائی دی۔ چنانچہ جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے انھوں نے اس قوم کے زوال کے اسباب پر غور وفکر کرنا شروع کر دیا اور مغلوب انگریزی قوم کی خوبیوں کا باریکی سے مشاہدہ بھی کرنا شروع کیا جن کی بدولت وہ ایک ترقی یافتہ قوم قرار پائی سرسید نے محسوس کیا کہ اس خلیج کی وجہ سے مسلم قوم کا خسارہ ہوگا انھوں نے دونوں کے درمیان ہم آہنگی اور آپسی قربت کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا اس ضمن میں انھوں نے سب سے پہلے ''اسبابِ بغاوت ہند'' کتاب تحریر کی اور اس میں حکومت کی عوام سے متعلق پالیسیوں کا جائزہ لیا گیا۔ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کا دل صاف کیا جائے اور ان کو صحیح حالات سے آگاہ بھی کیا جائے۔

سرسید نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے موٹے طور پر ۵ اور کئی ضمنی اسباب بیان کئے وہ ۱۵ اسباب کچھ اس طرح تھے۔

۱۔ تجاویز حکومت سے متعلق رعایا کی غلط فہمی۔

۲۔ ہندوستانی سیاسی نظام اور یہاں کے عوام کے رسم ورواج کے برخلاف اصول وقانون اور سیاسی نظام کا نفاذ۔

۳۔ رعایا کے رسم ورواج عادات واطوار ان کی بدحالی اور مصائب سے حکومت کی ناواقفیت۔

۴۔ فوج میں بدنظمی، بے اطمینانی اور ہندو مسلم اتحاد اور۔

۵۔ اچھی حکومت کے لئے حاکم اور رعایا میں عمدہ روابط جیسے لازمی امور کا ترک کر دینا اور قانون ساز کونسل میں ہندستانیوں کی عدم شرکت۔

ان سارے اسباب پر سرسید نے تفصیلی بحث کی۔ ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ صرف مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا واحد ذمہ دار قرار نہ دیا جائے۔

''اسباب بغاوت ہند'' کا بغور مطالعہ کرنے پر یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سرسید نے جو کچھ اس مختصر کتاب میں لکھا اس سے کہیں زیادہ دوررس نتائج ان کے ذہن میں چھپے ہوئے تھے جن کا اظہار وہ اس کتاب میں مصلحتاً نہیں کر پائے کیوں کہ انھیں ڈر تھا کہ اگر بغاوت کامیاب بھی ہو جاتی تو بھی ہندوستان میں یکجہتی باقی نہیں رہتی ان کے دماغ میں ڈیڑھ سو برس پہلے کا ہندوستان بھی تھا اور انھوں نے پوری سیاسی بصیرت کے ساتھ زوال وانحطاط کے ہر پہلو پر غور وخوض کیا امراء وسلاطین کی صلاحیتوں کو پرکھا، مسلم معاشرے اور عہد مغلیہ کے بکھراؤ کو الگ الگ متعین کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلم معاشرے کے زوال کا سبب مذہبی شعار سے بے اعتنائی اور علوم وفنون سے بے تعلقی ہے۔ انھوں نے مسلم سوسائٹی کے ہر طبقے سے خطاب کر کے اس کی بے راہ روی پر اس کو آگاہ کیا اور جہاں تک معاشی خرابیوں کا تعلق ہے اس میں تقریباً ہر طبقہ یکساں طور پر گرفتار ہے۔ امیروں سے خطاب کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''اے امیرو دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے، ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی اور طرف منعطف نہیں ہوتی۔''[۳]

دوسری جگہ عوام سے بھی اس طرح مخاطب نظر آتے ہیں:

''اے آدم کے بچوں! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی جس سے سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے۔ اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے، ایسی بیوی جو اس کے رہن

سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے۔ چاہئے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔''[۴]

اور آگے ایک جگہ مشائخ کو اس طرح خطاب کرتے ہیں:

''ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تا کہ ان سے ٹکے وصول کریں۔''

مذکورہ باتوں کے ساتھ یہ بھی واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی کو بغاوت اور جنگ آزادی کا نام دینے میں بڑا باریک سا فرق ہے بغاوت کہنے کی صورت میں ہم اس لڑائی کو صحیح تسلیم نہیں کرتے جب کہ جنگ آزادی کا نام دے کر ہم اس کے حمایتی نظر آنے لگتے ہیں سرسید نے واضح طور پر لکھا ہے کہ حکومت کی غلط پالیسی ہی اس بغاوت کا سب سے بڑا سبب تھی۔ انگریزوں کی بے راہ روی سے ہی ۱۸۵۷ء کا واقعہ رونما ہوا۔ ہم سب واقف ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی پہلی جنگ تھی اور مورخین بھی اس کو سنگ بنیاد قرار دیتے ہیں کیوں کہ اس لڑائی کے بعد ہندوستانی پورے طور پر انگریزوں کے زیر اثر آ گئے تھے انگریز مسلمانوں سے بے انتہا بدظن تھے عام لوگوں کے علاوہ خود بہادر شاہ ظفر کے ساتھ جو ظلم کیا گیا ان کے بیٹوں کا سر قلم کر کے تھال میں سجا کر ان کو پیش کیا گیا اور ایسے میں اگر کوئی آواز اٹھتی بھی تھی تو لمحوں میں خاموش کر دیا جاتا تھا ہر طرف سکوت کی کیفیت طاری تھی اس تناظر میں سرسید کا ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر انگریز حکومت کی خامیاں اجاگر کرنا کوئی معمولی عمل نہیں تھا۔ لیکن ایک اور مقصد بھی پوشیدہ طور پر سرسید کے ذہن میں کام کر رہا تھا کیوں کہ اتنے عرصہ میں سرسید نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ جو ترقی انگریزوں کے زیر اثر ہندوستان میں ہو رہی تھی وہ بعد میں سو سال تک ممکن نہیں اور واقعی کتنے حکمراں ہندوستان آئے لیکن کیا ترقی کا ایسا نظام قائم کر سکے؟ یقیناً نہیں کر سکے شاید اسی لئے سرسید کہیں نہ کہیں یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندوستانی انگریز حکومت کے وفادار رہیں کیوں کہ سرسید کا مطمح نظر مسلمانوں کو عملی سیاست سے زیادہ میدان تعلیم میں نمایاں دیکھنا تھا۔ ایسے حالات میں کچھ لوگوں نے سرسید کو انگریزوں کا ہمدرد ہونے کا بھی الزام لگا دیا کیوں کہ اس وقت جب انگریز حکومت کے خلاف منھ کھولنا بھی جرم تھا تو ایک مکمل کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کے شائع ہونے پر کیا رد عمل ہو سکتا تھا کیا اس کتاب میں انگریزوں کی خیر خواہی کے راز پنہاں تھے؟ ورنہ سرسید کے خلاف بھی سخت کاروائی ہو سکتی تھی لیکن سرسید جانتے تھے کہ انگریز ان کی باتوں کو برا نہیں مانیں گے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اس کتاب سے انگریزوں کا بھی بھلا ہوگا اس کا اظہار انھوں نے اپنے دوست اور ماسٹر رام چندر کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس سے بھی کیا تھا جب وہ اس کتاب کے شائع ہونے پر اپنے خدشات ظاہر کرتے ہیں:

''میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔''[۵]

''اسباب بغاوت ہند'' سے اکثر انگریز حکمراں خوش نہیں تھے اس کے باوجود بعض حق پسندوں نے انگریزوں کو مشورہ دیا کہ سرسید نے جو باتیں لکھی یا کہی ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا چنانچہ بہت سی تجاویز کو انگریزوں نے فوراً قبول کر لیا مثلاً سرسید نے جس وجہ کو ''اسباب بغاوت ہند'' میں بغاوت کا اصل سبب قرار دیا وہ یہ کہ ہندوستانیوں کا قانون کونسل میں شریک نہ کیا جانا۔ حکومت نے فوراً یہ شکایت دور کر دی اور مہاراجہ نرندر سنگھ (رئیس پٹیالہ) راجہ دیونرائن سنگھ (رئیس بنارس) راجہ ڈنکر راؤ (دیوان ریاست گوالیار) کو اس میں شریک کیا گیا۔ یہ ضرور کہ اس وقت ہندوستانیوں کا کونسل میں شریک کیا جانا محض برائے نام تھا۔ سرسید کے خیال میں یہی چند باتوں پر عمل کیا جانا کافی نہیں تھا کیوں کہ وہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں اقتدار دیکھنا چاہتے تھے فرماتے ہیں کہ:

''چند ہندوستانیوں کا لیجس لیٹیو کونسل میں داخل ہونا ہندوستانیوں کی ترقی کا فروغ ہے میری اس پیش گوئی کو بھی یاد رکھو کہ وہ دن دور نہیں جب ہر ضلع میں سے ایک شخص کا کونسل میں داخل ہونا ضروری ہوگا.....تم دیکھو گے کہ ہندوستانیوں کو علوم وفنون اور تربیت و لیاقت میں ترقی کرنے کی کس قدر ضرورت ہے۔''[۶]

مسٹر سسل بیڈن فارن سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا سے سرسید کی ملاقات ہوئی اس نے سرسید سے علیحدہ مل کر نہایت رنجش ظاہر کی اور کہا کہ تم اگر

گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لئے ''اسباب بغاوت ہند'' لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے رعایا کے خیالات ظاہر کرتے اس پر سرسید نے جواب دیا:

''میں نے اس کتاب کی ۵۰۰ جلدیں چھپوائیں تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانچ سو جلدیں ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے میں جانتا تھا کہ آج کل بسبب غیظ وغضب کے حاکموں کی رائے صائب نہیں رہی اور اس لئے وہ سیدھی باتوں کو بھی الٹی سمجھتے ہیں، اس لئے جس طرح میں نے اس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا صرف ایک کتاب گورنمنٹ کو بھیجی ہے اگر اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپئے دوں گا۔'' ۷

مسٹر بیڈن نے اس کی تصدیق کر اطمینان کیا اور اس کے بعد ہمیشہ سرسید کے دوست اور حامی و مددگار رہے۔

بغاوت کے اسباب کے مدنظر سرسید نے انگریزوں سے دوستی کو ملک وقوم کے لئے بہت بہتر سمجھا کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی بالخصوص مسلمان مغربی علوم وفنون اور سائنس کی تعلیم حاصل کریں وہ ہندوستانیوں کو باوقار دیکھنے کے خواہاں تھے۔ تاکہ جدید تعلیم، تعلیم نسواں اور فلسفہ وسائنس کے ذریعہ اپنی عظمت رفتہ کو پھر سے واپس حاصل کیا جا سکے حالانکہ سرسید جس وقت یہ بات کر رہے تھے ہمارا ملک غلام ملک تھا بقول اقبالؔ ۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ایسے وقت میں سرسید کے ذوق یقیں اور جسارت وحکمت نے وہ کر دکھایا جس کی توقع نہیں تھی انگریزوں نے سرسید کو ''سر'' کا خطاب بھی دیا اور اپنا دل بھی سرسید کے تئیں نرم کر لیا کیوں کہ اس کتاب سے انھوں نے انگریزوں سے جھگڑا مول نہیں لیا بلکہ اس یقین کے ساتھ تحریر کیا کہ دانش مند انگریز ان کی باتوں پر سنجیدہ ہو کر غور کریں گے۔ دراصل سرسید انگریزوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ہندوستانی باشندوں کے ساتھ انگریزوں کا جو سوتیلا رویہ ہے یقیناً وہی بغاوت کا خاص سبب ہے اور کچھ حد تک انگریزوں کا ذہن مسلمانوں کی طرف سے صاف ہو گیا پھر بھی سرسید مطمئن نہیں تھے وہ مسلمانوں کو ان کی جہالت اور غلط عقائد سے نکال کر جدید علوم ومغربی سائنس کے قریب لانا چاہتے تھے۔

سرسید نے خواب غفلت میں پڑے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سب ہندوستانیوں کو یہ کہہ کر بیدار کیا:

''اے میرے عزیز ہم وطنو! قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح عمدہ ہو، تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو! کیا جو طریقہ تعلیم وتربیت کا بات چیت کا وضع و لباس کا، سیر سپاٹے کا، شغل واشغال کا، تمہاری اولاد کے لئے ہے، اس سے ان کی شخصی چال چلن، اخلاق و عادات، نیکی وسچائی میں ترقی ہو سکتی ہے۔'' ۸

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''سرسید نے اپنی پوری قوت جدید تعلیم کی طرف مرکوز کر دی اور اپنی قوم کو ہمنوا بنانے کی کوشش کی وہ اپنی قوم کو کسی دوسری طرف متوجہ ہونے نہیں دینا چاہتے تھے کیوں کہ یہ ایک دشوار کام تھا اور مسلمانوں کی ہچکچاہٹ دور کرنا اور مشکل تھا.....سرسید کی سرگرمیاں بظاہر اعتدال پسند نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کے قدم انقلابی سمت میں اٹھ رہے تھے۔'' ۹

اسباب بغاوت ہند کے صفحہ نمبر ۶۴ پر درج تحریر بھی قابلِ غور ہے:

''میں تم سے سچی بات کہتا ہوں۔قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہونے کی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔''

غرض کہ اسباب بغاوت ہند کے ذریعہ سرسید نے نہ صرف ہندوستانیوں کی نمائندگی کی بلکہ غدر کے بعد غدر کی تمام تر ذمہ داری حکمرانوں نے جس طرح مسلمانوں کے سر ڈال دی تھی اس کی وکالت بھی دلیری کے ساتھ کیا۔

سرسید نے جدید علوم کے ساتھ مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں قرآن تو دوسرے ہاتھ میں سائنس اور سر پر لا الہ الا اللہ کے تاج کا تصور بھی کیا مغربی علوم کے ساتھ مسلمانوں کے امراض کا علاج کرتے ہوئے صراط مستقیم پر چلنے کی بھی تلقین شامل حال رکھا چنانچہ غدر کے بعد جہاں بھی رہے مدرسے اور اسکول قائم کرتے رہے۔۱۸۶۲ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی بنائی جس کا مقصد انگریزی کی اعلیٰ کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنا تھا''برٹش انڈین ایسوسی ایشن'' جیسی سیاسی تنظیم کا مقصد بھی ہندوستانیوں کے خیالات وحقوق کو مغربی حکومت کے سامنے رکھنا تھا علی گڑھ سے ۱۸۶۶ء میں''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' جاری کیا جانا بھی ہندوستانیوں کے جذبات وخیالات کو حکومت سے روبرو کرانے کی اہم کڑی تھی۔ان کے پاس تعلیم کا ایک بڑا ویژن تھا اور قوم کو قعر مذلت سے نکال کر اوج ثریا اور تابناک ماضی کی طرف لانے کا لائحہ عمل تھا جس میں وہ تا عمر سرگرداں رہے اور ۱۹۲۰ء میں بالآخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ان کا حسین خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔انھوں نے قومی زندگی کو سنوارنے کے لئے تمام تر آسائشوں سے دریغ کرتے ہوئے اپنی منظّم کوششوں اور عظیم ترین قربانیوں سے ملک وقوم کی بہتری کے لئے مخالفت کی کبھی پروا نہیں کی۔

بلا شک یہ کہنا پڑتا ہے کہ سرسید محض ایک شخص نہیں بلکہ ایک کارواں تھے جو اقوام کے عروج واقبال اور زوال وادبار کی تاریخ میں گوہر نایاب کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی تصنیف''اسباب بغاوت ہند'' آزادئ ہند کا پہلا سنگ میل!

حواشی:

۱ حیات جاوید، از الطاف حسین حالی، ص۹۱

۲ اسباب بغاوت ہند بعنوان''آسمان پر تارے''ص۱۰

۳ مقدمہ اسباب بغاوت ہند، ص۳۱

۴ مقدمہ اسباب بغاوت ہند، ص۳۲

۵ حیات جاوید، ص۹۵

۶ تقریر افتتاح وکٹوریہ اسکول غازی پور، اسباب بغاوت ہند، ص۶۱

۷ حیات جاوید، ص۷۸۔۷۹

۸ مضمون''اپنی مدد آپ''تہذیب الاخلاق جلد ہشتم، یکم شعبان ۱۲۹۲ھ

۹ خودنوشت پنڈت جواہر لال نہرو، ص۴۶۱، انگلش سے ترجمہ ایڈیشن ۱۹۶۲، بحوالہ اسباب بغاوت ہند

سرسید احمد خاں

شہرت یافتہ لوگوں میں سے ایک مشرق کی سرزمیں پر جو شہرت پانے کے قابل وہ سرسید احمد خاں ہے جیسے جیسے زمانہ گزرے گا انکی عظمت اور شہرت کا چرچہ پہلے سے اور زیادہ انکے ہم وطنوں کے سامنے بلند ہوتا جائے گا۔ سرسید احمد خان ہندوستان کی بنیادی اصلاح کے بانی اور ہندوستان کی اصلاح کرنے والے عظیم محسن ومربی ہیں۔ ہندوستان کے بزرگ ترین مسلمانوں میں سب سے بزرگ ترین شخص میں سے ایک ہیں۔ یہ بزرگ مئی ۵/ذی الحجہ ۱۲۳۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور محمد تقی خان کے بیٹے تھے انکے اباواجداد عرب سے ہرات آئے تھے اور پھر اکبر بادشاہ کی حکومت کے زمانہ میں رہیں اور وہاں سے ہندوستان کی حکومت میں چلے گئے تھے۔ ۱۹ سال کی عمر میں باپ کی جانب سے سرسیہ احمد خاں یتیم ہو گئے اور ایک سال کے بعد ہندوستان کی حکومت کی خدمت میں داخل ہو گئے آپ کا پہلا انتخاب دہلی کورٹ کے کرائیم برانچ کے شعبہ میں منشی کی حثیت سے ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں اگرہ کے اطراف میں فتح پور سیکری میں ترقی پا کر منصف کے عہدے پر فائز ہوئے اور کچھ سال کے بعد ایک کتاب خاص طور پر دہلی کے آثار قدیمہ پر موسوم آثار الصّنا دید کے نام سے تالیف کی تھی۔ آثار الصنا دید سید احمد خاں نے مطالعہ آثار قدیمہ کے ذریعے سلطنتوں کے عروج وزوال کا جائزہ لیا۔ انھوں نے ایسے رسائل لکھوائے اور خود بھی لکھے جن سے تاریخ کے مخفی پہلو منکشف ہوئے آگرہ اور دہلی کے کھنڈروں نے ان کے ذوق تاریخ کو نمایاں کیا جس کے متعلق مولانا شبلی نے لکھا کہ

''چوں کہ حقایق اور واقعات کی طرف ابتدا سے میلان تھا اس لئے دلّی کی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت اور کوشش سے اس کام کو انجام دے کر ۱۸۴۷ء میں ایک مبسوط کتاب لکھی جو آثار الصنا دید کے نام سے مشہور ہے۔''

آثار الصنا دید اردو میں باستاں شناسی کی پہلی کتاب ہے جس میں اس دور کے مشہور مصّوروں کی بنائی ہوئی آثار قدیمہ کی ایک سو تیس رنگین تصاویر بھی شامل ہیں جن میں نوئے نقشے فیض علی خاں کے تیار کردہ اور بقیہ چالیس مرزا شاہ رخ بیگ کا عمل ہیں۔ سید احمد خاں نے ان دونوں کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا کہ

''فیض علی خاں، مانی ان کا قلم بند وصدف دار اور بہزاد ان کی طرح کا چربہ نگار شمع ان کی تصویر کے بزم افروز اور آتش ان کے نقشہ کی عالم سوز از بسکہ مزاج صلاح وتقویٰ کی طرف بہت مایل ہے جاندار کی تصویر سے تائب ہو کر فقط نقشہ مکانات پر قناعت کی سبحان اللہ اس کام کو اس طرح سرانجام دیا اور اس امر کو ایسا بانصرام پہونچایا کہ بیان اوسکا احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ مرزا شاہ رخ بیگ فن تصویر میں نہایت کامل اور اقراں وامثال سے اس کام میں گوی سبقت لے گئے ... کل نقشے اس کتاب کے فیض علی خاں موصوف اور ان کی استعانت سے مرتب ہوئے ہیں کام ان نقشوں کا نمونہ ان کی صنعت کا ہے۔''

کتاب کے شروع میں نواب ضیاء الدین خاں لوہارو کی فارسی منظوم تقریظ ہے جس میں سید احمد خاں کے علمی تجسس اور تحقیقی کاوش کا ذکر ہے۔ دیباچہ میں مصنف نے سر ٹامس مٹکاف ریزیڈنٹ نے دہلی کے نام اٹھتر اشعار کی مثنوی میں ان کی علم پروری اور قدر دانی کا شکریہ ادا کیا ہے۔ تقریظ اور دیباچہ دونوں مطلیٰ ہیں یہ تصنیف چار ابواب اور ۵۸۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

شہر کے باہر کی عمارتوں کے حال میں۔ ۲۳۸ صفحات

قلعہ معلیٰ کی عمارت کے حال میں۔ ۴۴ صفحات

خاص شہر شاہجہاں آباد کی مارتوں کے حال میں۔ ۷۱ صفحات

دلی اور دلّی کے لوگوں کے بیان میں۔ ۳۲۰ صفحات

ابتدائی تین ابواب میں دہلی اور نواح دہلی کی مختلف عمارتوں کی تفصیل ہے چوتھے باب میں پہلے تو دلّی کے متفرق ناموں، اس کی آب وہوا اور یہاں کی زبان اردو کے ارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔ پھر یہاں کے باشندوں کی بابت لکھا:

''اگر چہ لوگ یہ خیال ظاہر کریں گے کہ میں نے جو اس شہر کے لوگوں کا حال لکھا ہے وہ بہ نظر حبّ الوطن ہوگا لیکن جن لوگوں کے مزاج میں انصاف

ڈاکٹر شبانہ عزیز، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگ راج

ہے وہ میری اس ساری کتاب کو دیکھ کہ جان لیں گے کہ میں نے جو حال لکھا ہے وہ افراط اور تفریط سے خالی ہے۔ حقیقت میں یہاں کے لوگ ایسے ہیں کہ شاید کسی اقلیم کے نہ ہوں گے۔ ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ ہے ہر ایک کو علم و ہنر سے شوق اور دن رات لکھنے پڑھنے ہی سے ذوق ہے،،

اس کے بعد ایک سوستر ہ معاصر مشاہیر کا بیان ہے جن کے متعلق مصنف نے اعتراف کیا کہ:

''اب میں تھوڑا سا بزرگاں معاصرین علیہ الرحمہ کا جن کی فیض خدمت میں مشرف ہوا ہوں یا اس زمانے میں اُن کے وجود یا جود سے عالم کو رونق تھی حال لکھتا ہوں''

اس باب میں پیران طریقت، مدیران وقت اور حکماء کے ساتھ ساتھ ادیبوں اور شاعروں میں بالخصوص ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، شیفتہؔ اور شاہ نصیرؔ کی شخصیت اور فن شعر سے تفصیلی بحث کی ہے جس سے اردو میں جدید تنقید نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔

مثلاً وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''مرزا اسداللہ غالب۔ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں۔۔۔۔ آپ کا جواہر خانہ نفایس سخن حد شمار سے افزوں اور ظرف حصر سے پیروں ہے ایک دیوان قصاید و غزلیات کا تیس جزو سے زیادہ مرتب اور منطبع ہوا ہے اور اسی طرح سے نثر اور ایک کتاب پنج آہنگ نام نہایت فواید جلیلہ پر مشتمل قریب چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتائج فکر پر مبنی ہے۔ '' ص ۱۳۸۔۱۳۹

''مومن خان مومنؔ معنی تازہ سے قالب الفاظ میں جان ڈالنے اور انفاس عیسوی سے پژمردہ کو تازہ تر از گل اور سیراب تر از مُل کرنا ایک شیوہ ہے۔ دیوان ریختہ کا مشتمل ہے۔ اصناف سخن اور شعبہ فن پر غزلیات سے لے کر تا مخمسات و مسدسات اور فرد سے لے کر تا رباعیات و قطعات ہیں۔۔۔۔۔ چھ مثنوی اور قصائد متعدد اور انشائے نثر باعبارات متین و مضامین رنگین ہے۔'' ص ۱۹۱-۱۹۲

''شیخ ابراہیم ذوقؔ کے یہاں اس قدر جامعیت کہ فصاحت عبارت اور متانت تراکیب اور حدت معنی اور غرابت تشبیہ اور حسن استعارہ اور خوش اسلوبی کنایہ اور لطف تلمیح اور پاکی الفاظ اور پست قافیہ اور نشست ردیف، نظم و نسق کلام اور حسن آغاز و انجام ایک جا (ے) میں جمع ہے۔ اگر چہ اصناف سخن خصوصاً غزلیات اور قصائدہ سے دفتر دفتر ہے، ص ۲۱۵

سیدؔ احمد خاں کو تاریخ اور ثقافت سے ایسا لگاؤ تھا کہ خطرات مول لے کر خود اونچی اونچی عمارات پر لکھے ہوئے دیوناگری اور قدیم رسم الخط کے کتنے پڑھے اور بڑی مشکل سے ان کے چربے اتارے پھر یہ تحقیق بھی کی کہ کونسی عمارت کس بادشاہ نے کب بنوائی تھی؟ چنانچہ ساتھ ساتھ تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے جاتے اور معتبر اشخاص سے مدد بھی لیتے تھے۔ اس انہاک کی روداد ''حیات جاوید'' میں ملتی ہے:

''قطب صاحب کی لاٹ کے بعضے کتنے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلّیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے مجازی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر چھینکے میں بیٹھ کر ہر ایک کتبہ کا چربہ اتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔''

جب آثار الصنادید چھپ کر آئی تو اسی سال ۱۸۴۷ء میں دلّی کے کلکٹر آسٹین رابرٹس انگلستان جا رہے تھے اس کا ایک نسخہ اپنے ساتھ لے گئے اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں پیش کیا اس کے کورٹ آف ڈائریکٹرز کی فرمایش پر انھوں نے اس کا انگریزی ترجمہ شروع کیا مگر انتظامی مصروفیات کی بناء پر پورا نہ کر سکے۔

سید احمد خاں کی طبیعت میں خوب سے خوب تر کی خواہش رہی اتنی محنت کے باوجود انھیں احساس ہوا کہ کتاب میں مزید اضافوں کی گنجایش ہے اور اس کی زبان بھی دقیق و مرصع ہے۔ دہلی کے سیشن جج ایڈورڈ ٹامسؔ جو آثار قدیمہ کی تحقیق میں دلچسپی رکھتے تھے انھوں نے بھی اس طرف توجہ دلائی اور دوسرا ایڈیشن نکالنے پر آمادہ کیا چنانچہ چھ برس کی چھان بین کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں سلیس اور رواں زبان میں نکلا جس میں عمارتوں کے کتبے بجنسہٖ نقل ہیں:

ان کے تقابلی مطالعے سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

دوسرے ایڈیشن کے اول باب میں ہندوستان کی آبادی اور پرانی عملداریوں کا ذکر ہے جو پہلے ایڈیشن میں نہیں۔

۔دوسرے ایڈیشن کے باب دوم میں دہلی کے تمام قلعوں کا مکمل بیان ابتداء سے آخر تک دیا ہے۔ پہلے میں صرف شاہجہاں آباد کے قلعہ کا حال ہے۔

۔دوسرے ایڈیشن میں ان پرانے مکانات کی تفصیلات ملتی ہیں جن کی بابت پہلے معلومات نہ ہوسکی تھیں اور اگر بیان میں کوئی غلطی رہ گئی تھی تو اس کی بھی تصحیح کر دی گئی۔

۔دوسرے میں عمارات کا حال زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے جب کہ پہلے میں غیر منظّم اور متفرق انداز میں ہے۔

۔دوسرے ایڈیشن میں تاریخی شواہد اور اسناد کے ساتھ ساتھ حواشی اور حوالوں کی کمی کو پورا کر دیا گیا ہے۔

۔سرسیّد احمد خاں نے اگرچہ تاریخی عمارتوں کے کتبے پڑھنے کے بعد ان کے چربے اتارے تھے لیکن شاید پورے طور پر تیار نہ ہوسکنے کی وجہ سے پہلے ایڈیشن میں نہ چھپ سکے۔ دوسری اشاعت میں یہ سب شامل کر دیے گئے ہیں۔

۔دوسرے ایڈیشن کا اختتامیہ ''اردو زبان کے بیان میں'' ہے جب کہ پہلے ایڈیشن کے چوتھے باب میں اہل دلّی کا مفصل حال درج تھا۔ اس زمانے میں وہابی تحریک زور پکڑ چکی تھی اور وہابیوں پر سیاسی الزامات عاید تھے اور ''مورد عتاب تھے چنانچہ اس کی زد میں دلّی کے بہت سے علماء اور مشاہیر آ گئے تھے اس لئے سیّد احمد خاں نے مصلحتاً ۱۸۵۴ء کے دوسرے ایڈیشن میں اس باب کو نکال دیا اور اختتام اردو زبان کی ابتداء اور اس کی بتدریج ترقی پر کیا چنانچہ یہ حصہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء پر غور و فکر کا رجحان اس کی اشاعت کے بعد ہی پیدا ہوا۔ سیّد احمد خاں کے انتقال کے بعد ''آثار الصنادید'' مرتبہ محمد رحمت اللہ رعد (۱۹۰۴ء) شایع ہوئی۔ اس میں مرتب نے طبع اول (۱۸۴۷ء) سے ایک سو تیس عمارتوں کے نقشے بنوائے اور دوسری طباعت سے کتبوں کے چربے اور صحیح حالات تاریخی حوالوں کے ساتھ نقل کروا کے یکجا کر دیے ہیں۔

لیکن یہ اس لحاظ سے نامکمل ہے کہ پہلی اشاعت کا چوتھا باب متعلقہ ''دلّی اور دلّی کے لوگوں کے بیان میں'' شامل نہیں کیا گیا۔ جگہ جگہ صفحات خالی چھوڑ دیے ہیں جس کی وجہ سے تسلسل برقرار نہیں رہا اور ترتیب میں بھی ہم آہنگی نہیں اس کے علاوہ فہرست مضامین بھی درج نہیں۔

''آثار الصنادید'' کے آخر میں تین تقاریظ اسد اللہ خاں غالبؔ، امام بخش صہبائیؔ اور مولانا صدر الدین آزردہؔ کی شامل ہیں۔ غالبؔ نے اپنی تقریظ میں سیّد احمد خاں کی ذہانت، محنت اور علمی ذوق کی تعریف کی ہے مگر اس پر حیرت ظاہر کی کہ وہ نئے زمانے کے بجائے پرانے وقتوں کے حالات و واقعات کی چھان بین پر کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں؟ اور وہ عصر جدید کی ترقی و ایجادات سے بے خبر اور ماضی پرست ہیں۔

امام بخش صہبائیؔ نے ان کی علمی لگن اور وقت نظر کی تعریف کی اور اپنی تعریف میں آزردہ نے ''آثار الصنادید'' جیسی تاریخی تحقیق کی معنویت پر زور دیا اور سید احمد خان کو قبول عام سے سرفراز ہونے کی دعا دی۔

دمیدہ بہ نقش عمارات جاں زاعجاز او شہر دہلی رواں
خدا یا تو ایں شمع پایندہ دار جہاں را چو پروانہ گروندہ دار

فرانسیسی مستشرق گارسین دتاسیؔ نے اس کا فرانسیسی ترجمہ ایک سو چورانوے بڑے صفحات میں لیتھو شاہی پریس پیرس سے ۱۸۶۰ء میں شایع کیا۔ اس نے قارئین کی دلچسپی کے مدنظر صرف وہی حصے ترجمہ کئے جو آثار قدیمہ سے متعلق تھے۔ اپنے سالانہ خطبہ میں اس نے کہا کہ:

''ہمارے پیش نظر وہ نسخہ ہے جو کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے اس میں سابقہ ایڈیشن کی مکمل نظر ثانی کی گئی۔''

پھر اس نے یہ بھی ذکر کیا کہ ترجمہ کا ایک نسخہ ہندوستان کو روانہ کر دیا گیا ہے۔ اس فرانسیسی ترجمہ کو پڑھنے کے بعد سید احمد خان کی علمی خدمت کے اعتراف پر انھیں رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، کا اعزازی رکن مقرر کیا گیا۔ ''آثار الصنادید'' کا انگریزی ترجمہ ۱۹۷۹ء میں آرناتھ نے کیا۔

سید احمد خاں کے نظریہ تاریخ پر ''آثار الصنادید'' سے پوری روشنی پڑتی ہے کہ انھوں نے مشاہیر علماء وصوفیا کے ساتھ ساتھ کاریگروں اور مخصوص پیشہ وروں کا بھی حال لکھا یعنی وہ تاریخ کو صرف بادشاہوں کے حال تک محدود کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہر طبقہ کی نمائندگی ضروری سمجھتے تھے۔ان کے اس وسیع تصور میں عوام وخواص دونوں شامل تھے۔

اس کتاب کے ذریعہ سے انکے علمی مقام کی شہرت ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے زمانہ میں سرسید احمد خان بجنور میں معاون قاضی تھے اور آپ اس شورش کے طرف مذبور نہیں تھے۔کیونکہ ہندوستان کے لئے جب تک وہ علم سے بہ خبر نہ ہو جائے تعلیم وتربیت بیک درمیان جب تک پوری طرح نہ پھیل جائے تب تک انگریزوں کے ہاتھوں سے آزادی اور نجات ممکن نہیں تھی۔اور انھیں یقین تھا کہ یہ غدر بجائے فائدہ کے نقصان پہنچائے گی۔شورش کے لیڈروں کو نصیحت کی گئی لیکن ان کو کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ ان کا دماغ سرسید احمد خان کی طرف سے پھر گیا۔سرسید احمد خان کی جانب سے لوگوں کو بھڑکایا۔اور ان لیڈروں نے انکو ڈرایا اس کے باوجود بھی انھوں نے کتنے بہت سے یوروپین کی جان بچائی اور انکو سلامتی کے ساتھ میرٹھ بھیج دیا شورش ختم ہونے کے بعد انگریزی حکومت نے انھیں انعام دیا۔دوسو روپیہ کا ایک ماہانہ وظیفہ جو ان کے خاندان میں میراث کے طور پر انکے خاندان میں برقرار تھا۔انکے لئے مقرر کر دیا اور انھیں ہندوستانی ستارے کا طمغہ بھی دیا۔

کچھ دنوں کے بعد انھوں نے ایک کتاب اردو زبان میں ہندوستانی غدر کے اسباب اور اسکی شرح پر لکھی جسکا انگریزی زبان میں بھی ترجمہ ہے اس کتاب مشارالیہ ہندوستان میں انگریزی کے اعمال کی تنقید کی ہے اور اسباب کو جو کہ ہندوستانیوں کے غدر کا سبب بیان کیا۔اور اس کے ذریعہ انکی حقیقی وطن پرستی انگریزوں کے دئے ہوئے وظائف اور انکے طمغات سے بے اعتنائی برتتے ہوئے آپ نے اپنے وطن کے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کی اس ذریعہ سے آپ رکن یہ وطن پرستی سب پر ظاہر ہوگئی۔لیکن سرسید احمد خاں نے اس کتاب میں صرف انگیزوں کی نہیں بلکہ اپنے ہم وطنوں کی غلطیوں کو بھی بیان کیا ہے اور سب سے زیادہ انھوں نے اپنی دلیلوں کی بنیاد کو اپنی جاہل عوام کے سامنے اور قوم کے سامنے تعلیم کا عدم انتشار بنا کر کافی مقدار میں (اچھی طرح پھیلنے کو) انکے درمیان رکھا۔اور بڑی فصاحت سے بتایا کہ ہر چیز سے زیادہ ضروری اور ہر کام سے پہلے ہندوستان جس چیز سے زیادہ محتاج ہے وہ عام لوگوں میں تعلیم کا نہ ہونا۔اور اس وجہ سے سرسید احمد خاں نے خود کو اور اپنی پوری قوت کو پوری طور پر قوم کی اس خدمت کے لئے وقف کر دیا۔اور اسی وقت سے اس طرف انھوں نے سرکاری محکمہ میں خدمت کرنے کے باوجود اپنی پوری قوت کو اپنے ہم وطنوں کے درمیان تعلیم کے انتشار کے لئے صرف کیا باون سال کی عمر میں سرسید احمد خاں نے انگلستان کا سفر کیا اور اپنے دو بیٹوں کو لے گئے۔اور انھیں وہاں چھوڑ دیا تاکہ وہ یورپین تعلیم حاصل کر سکیں اور اس شدید ذہنی تعلیم کی وجہ سے انکے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کی تعلیم اور تربیت کے لئے جذبۂ پیدا ہو گیا تھا۔

یورپ کے سفر میں سرسید احمد خان کے لائے وجود میں ایک عجب تاثیر چھوڑا ایک بار آپ کے دل میں بجلی کی مانند روشن ہو گیا۔اور انکے قوم کی حقیقی صورت، حالت اور اسکی کمی نظروں کے سامنے اچانک واضع ہوگی اور واضع طور پر انھوں نے دیکھا تو ہندوستانیوں کے پچھڑ جانے کا سبب ذہنی جہالت کا غلبہ اور اسکا بھی خاص سبب اندھا تعصب تھا۔جسکی وجہ ہندوستان انگریزوں کے تمام فرنگیوں سے اور انکے تمام علوم اور تمدن سے پرہیز کرتے تھے انکے علوم طبیعی فلسفہ کو اپنے ذہن کے خلاف شمار کر کے اپنے ابا واجداد کے قدیم راستوں کو یہ لوگ مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔سب سے پہلے میں سرسید احمد خاں نے جہالت اور تعصب کے اس طلسم کو توڑنے کے لئے ہمت باندھی تھی۔اور چونکہ آپ نے سید محمود کو جو کہ انگلستان کے شہروں میں سے ایک ہیں۔وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا اس سبب سے خود بھی گئے انکی انتہائی خواہش ہوئی کی ایک یونیورسٹی ہندوستان میں قائم ہو اور اسکے لئے کوششیں کرنی شروع کر دی۔

سرسید احمد خاں نے یوروپ جانے سے پہلے ترجمہ کرنے والی ایک انجمن بنائی تھی۔جسکا مقصد ہندوستانیوں سے انگریزی علوم کو قریب کرنا تھا۔اس انجمن نے بہت سی اہم انگریزی کتابوں کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کر کے عام لوگوں کے بیچ پیش کیا اوپر بتائی گئی انجمن کی انگیزی

حکومت نے تعریف کی ۔سید احمد خان کوسونے کا ایک طلاع اس خدمت کےعوض میں دیا گیا سرسید یوروپ سے لوٹنے کے بعد انکے خیال میں ایک یونیورسٹی کا خاکہ بن چکا تھا۔شروع میں ایک روز نامہ سماجی ڈھانچے کوٹھیک کرنے کے لئے نکالا اس روز نامہ میں انھوں نےعقلی اورتفصیلی مضامین کے ذریعہ اورشرعی ودینی دلیلیں دے کران لوگوں کےغلطی کی خلاف جو سائنس کوحرام سمجھتے تھے۔سرسید احمد خاں نے جہاد کیا۔اوراس جہاد کے راستے میں مستقبل سال تک ترقی رہے۔واضع ہے کہ جاہل متعصب رہنماؤں نے پہلے ان کوگمراہ قرار دیتے ہوئے انکی بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔لیکن زیادہ دن نہیں گزرا کہ اسلام کا سچّا عقیدہ ان پرروشن ہوگیا۔انھوں نے جان لیا کہ انکی ضرورت صرف مسلمانوں کی اصلاح کرنا ہے۔

سرسید احمد کا پورا ارادہ تھا۔ایک یونیورسٹی بنانے کا اوراس کام کے لئے اس راستے میں بڑی۔بڑی مشکلیں اور روکاوٹیں آئیں۔ لیکن وہ اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹے۔شروع شروع میں اس مقصد کے لئے ایک انجمن اس نام سے قائم کرنے کا ارادہ بنارس میں کیا لیکن بعد میں جب سرسید احمد خاں کا علی گڑھ میں تبادلہ ہوا تو انھوں نے ارادہ کیا کہ کالج دینی کھولا جائے کیونکہ یہ جگہ تقریباً ہندوستان کے اسلامی اصولوں کا مرکز ہے۔

مدرسہ کو قائم کرنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا سب سے بڑی مشکل لوگوں کا تعصب اورقابل رہ نما خاص طور سے سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔جدید تبدیلی اوراصلاح کو بدعت جانتے تھے لیکن پھر بھی زیادہ روپیہ جمع نہیں ہوسکا انگیزوں نے بھی بہت مدد کی اس کام کو اگے بڑھانے میں سرسید احمد خاں اورانکے ساتھی زیادہ انتظام نہ کرسکے ایک چھوٹا سا مدرسہ علی گڑھ میں شروع کیا Mohammadan Anglo Orientle College یہ مدرسہ مئی ۱۸۷۵ء میں شروع کیا۔اوریہی پہلا قدم تھا۔جواس کام کی شروعات تھی اورقوت فعل کی شکل میں آئی۔اوراپنی قوم کےلوگوں کے اعتماد کا باعث بنا زیادہ وقت نہیں گزرا کافی مقدار میں مالی مدد ہوئی اوروہ یونیورسٹی جسکا بنانا عظیم مقصد تھا قائم ہوگئی جوسرسید احمد خاں کا عظیم مقصد تھا اور ۱۸۷۷ء کے شروعات میں اس یونیورسٹی کی سنگ بنیاد رکھا جوآج بھی قائم ہے۔یہ یونیورسٹی شروع میں انگریزی اداروں کے تحت چلتی تھی۔لیکن بعد میں سرسید احمد خاں نے اپنی ملازمت سے استعفاہ دے دیا۔۱۸۷۶ء میں اس طرف پوری طرح سے اپنے پورے وقت کواس یونیورسٹی کی ترقی کے لئے صرف کیا۔اوروہ تعلیم تالیف اورخطابت کے کام میں مشغول ہوگئے یہاں تک کہ ۱۸۹۸ء میں وفات پائی۔

سید احمد خاں ایک مشرف اور بزرگ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اپکے باپ دادا نے ہندوستان کے بادشاہ عالم گیر کے زمانے میں ۱۸۱۱ء میں جوادودلہ کا لقب دیا اورآپ کے نانا خواجہ فریدالدین احمد ہندوستان میں ایک اہم مقام رکھتے تھے اور لارڈ ویلسلی کی طرف سے سفیر بنا کر ایران بھیجے گئے تھے اوراپ کو مدیرالدولہ امین الملک خاں بہادر کا لقب دیا گیا تھا۔اورخود سید احمد خاں نے ہندوستان کی حکومت میں ایک اہم مقام حاصل کرلیا تھا۔۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۲ء تک انڈین پارٹی کے ممبر رہے تھے۔۱۸۸۸ء میں اس کے ممبر رہے پر ایک ہندوستانی طبقے سے اپکو نوازہ گیا۔

مگر انکے معنوی مقام اورانکی عظمت ہندوستان اوراسکی تاریخ میں ان کا ظاہری مقامات سے سینکڑوں گناہ زیادہ تھا اورانکے منصب اورطمغات کی بدولت انھوں نے یہ شہرت اورمرتبہ حاصل نہیں کیا۔ہندوستان کی اصلاح تحریک کے سبب یہ بڑے بزرگ ہوئے ہیں اوراس ملک کے مسلمانوں کی ترقی کا باعث ہوئے ہیں مرحوم نے انتہاری صبر اورکوشش سے قدم اٹھایا اپنی قوم کی خدمت کے راستے میں اوراپنے تعلیمی مقصد کو اگے بڑھانے کے لئے جیسے وہ قوم اورحکومت کی خدمت میں بزرگ ترین سمجھتے تھے اور ہندوستان کی حقیقی آزادی اورنجات کا سرمایہ سمجھتے تھے جہاد کیا وہ خود ہندستان کے وصولی کرنے میں جمع کرنے کےغرض سے کئی یونیورسٹی گئے اورقریب ۴۰ ہزار ہندوستانی روپیہ اس ذریعہ سے جمع کئے گئے جس شہر میں بھی آپ گئے شہر کے لوگوں نے آپ کی بہت عزت کی اوراورآپ کی دعوت ترتیب کی۔لیکن آپ نے کہا میں کھانے پینے کی غرض سے یہاں نہیں آیا ہوں۔بلکہ میں اپنے وطن کی مدد کے لئے آیا ہوں یونیورسٹی کوروپے کی ضرورت ہے جو کچھ بھی آپ لوگ میری خاطر تواضوں میں

خرچ کرنا چاہتے ہیں مجھے نقد دیدیجیے تا کہ میں اسے کالج کے لئے خرچ کرسکوں اس بلند مرتبہ اور دور اندیش انسان نے سیاسی رہنماؤں سے زیادہ بہتر طریقہ ملک کی حقیقی صورت حال دیکھ کر اور ترقی کے صحیح ذریعہ کو دیکھا تھا۔ اپ نے اپنی تمام عمر یونیورسٹی کی تعلیم وتربیت کے راہ میں صرف کیا۔ اور اپنی آخری ۲۷ سال رات و دن اس یونیورسٹی کے مقصد کو آگے اور اس جگہ پہنچا دیا کہ آج علی گڑھ یونیورسٹی ہندوستان کا سرمایہ ہے ہندوستان اور دنیا کے ہزار مسلمانون میں ۱۰ لوگ آپ کو ضرور مل جائیں گے جو علی گڑھ کے پڑھے ہوئے ہوں گے اور در حقیقت معنوی طور پر سید احمد خاں کا احسان مند ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی ہے جس میں ہندی اور انگریزی زبان مشرقی زبان پڑھایا جاتا ہے اس کے علاوہ عربی و فارسی وسنسکرت کے ساتھ علم تاریخ اور ریاضی وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے اس یونیورسٹی میں فرنگی استاد اور اس سے کہیں زیادہ ملک کے استاد ہیں۔ا

سرسید احمد خاں اپنی وطن پرستی اور اپنے ملک میں تعلیم کے انتشار اور ترقی کی کوشش کے علاوہ جو انکی سب سے بڑی مہربانی ہے جس نے انکو مشرق کا سب سے بڑا شہرت یافتہ انسان بنا دیا وہ خود بھی عالم اور مصنف تھے انکے بہت مقالات اور مولفات نشر ہو چکے ہیں انکی ایک کتاب ہندوستان کے غدر کے بارے میں اسکا انگریزی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ اسکے علاوہ اپکی ایک دوسری کتاب جو توازۃ کی شرح ہے اور دوسری قرآن کی تفسیر یہ مذہبی لکھی ہے اور اجتماعی اور تعلیم پر لکھی اس میں سے ایک رسالہ حضرت رسول اللہؐ کی سیرت پر ہے۔ یہ تھی مختصر سیرت مشرق کے ایک بزرگ ہستی کی تاریخ زندگی جس نے فتوحات شمشیر کے ذریعے نہیں کی نہ کوئی سیاسی لیڈر تھا۔ نہ وزیر تھا نہ امیر تھا نہ کوئی سیاسی فرقہ وارانہ رہنما تھا۔ لیکن جو خدمت انھوں نے اپنے ملک کے جاہل عوام اور بدبخت اور متعصب عوام کے لئے کی تھی اسکی خدمات 100 سالوں میں ایران کے کسی شخص سے ایسی خدمت کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔

سرسید انیسویں صدی کے زندہ جاوید مسلم رہنما قوم کے سب سے بڑے غم گسار اور صلاح وتعلیم کے شیدائی تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی علمی اخلاقی اور معاشرتی پستی دور کرنے اور ان کی اصلاح کے لئے علی گڑھ مسلم اورینٹل کالج قائم کیا تھا اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم سے مسلمانوں کو روشناس کرایا تھا۔

حواشی:

۱۔ ثریا حسین گارسین دتاسی، اردو خدمات کا علمی کارنامے، اتر پردیش اردو اکیڈیمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء صفحہ ۱۵۷

۲۔ آرنا تھ دہلی کے آثار قدیمہ (مونیومنٹس آف دہلی، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی ۱۹۷۹ء

۳۔ سید احمد خان- آثار الصنادید مطبع سید الاخبار باھتمام سید عبدالغفور دہلی ۱۸۴۷ء صفحہ ۱۴

۴۔ ایضاً صفحہ ۱۵

۵۔ الطاف حسین حالی ''حیات جاوید'' ناشر محمد رحمت اللہ رعد۔ نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء صفہ ۵۵

۶۔ شبلی نعمانی۔ مقالات شبلی مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۰ء صفہ ۵۸

۷۔ آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن مطبع سید الاخبار باہتمام عبدالغفور دہلی ۱۸۴۷ء کل چار سو صفحات۔

دوسرا ایڈیشن مطبع سلطانی، قلمہ معلیٰ دہلی ۱۸۵۴ء

تیسرا۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۹ء

سرسید احمد خان کی خطوط نگاری

خط لکھنا اور پڑھنا ایک سماجی عمل ہے۔ خط ایک ایسی تحریری گفتگو ہے جو اشخاص کے درمیان ہوتی ہے جب عوام ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے تو خط کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتے ہیں یہ ہی رابطہ کی ایک شکل مکتوب، خط ہے۔ خط ملاقات کا بدل بن جاتا ہے اسی لیے خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے۔ خط اس وقت مکمل ہوتا جب خط لکھنے والا (مکتوب نگار) کا نام اور پتا ہو اور دوسرے جس کو خط لکھا گیا (مکتوب الیہ) کا نام اور پتا ہو تیسرے خط (مکتوب) میں کچھ تحریر (پیغام، اشارہ، تصویر یا ایسا کچھ ہو جو مکتوب الیہ کو سمجھ میں آسکے) ہو تب ہی خط مکمل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ خط کو لطیف جذبات کی ترجمانی کہتے ہیں:

''خط ملاقات ہی کا نمائندہ ہوتا ہے جو بہ زبان و بے زبانی، ان سب جذباتِ لطیف اور واردات نازک کی ترجمانی کرتا ہے، جو ملاقات سے وابستہ ہوتے ہیں اور عجب بات یہ ہے کہ خط میں ہم کلامی کے باوجود کامل تخلیہ موجود ہوتا ہے، خط اصولاً باہمی بات چیت کا بدل ہوتے ہیں اس لیے ان میں گفتگو کی ضروری صفات ہونے چاہیے۔'' (میرا من سے عبدالحق تک، ص ۳۵۸)

عبدالحق نے خط کو صداقت اور خلوص کا ترجمان کہا ہے:

''مکتوبات دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا تحفہ ہے۔ اس میں وہ صداقت و خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔''

(مکتوباتِ حالی، ص ۱۰)

پروفیسر خورشید اسلام خط کو حسنِ اتفاق کہتے ہیں:

''خط حسنِ اتفاق کا نام ہے۔ وہ ادبی کارنامے ہوتے ہیں۔ خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بُنے جاتے ہیں۔ وہ خطوط میں استدلال کا زور، فلسفہ پر باقاعدہ بحثیں ہوں، بالارادہ فن کاری ہو، خطوط نہیں ہوتے۔''

(تنقیدیں، ص ۹)

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں:

''خط لکھا نہیں جاتا بلکہ لکھ جاتا ہے اور لکھنے والے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ لکھے۔''

خط کی ابتدا کب ہوئی اور کیسے ہوئی اس کا تعین وقت ناممکن ہے البتہ یہ کہا جاسکتا ہے جب سے تحریر کی ابتدا ہوئی ہے وہاں سے ہی خط کی ابتدا ہوئی ہے۔ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس بات کا پتا چلتا ہے کہ بادشاہِ وقت اپنا پیغام دوسری سلطنتوں کے بادشاہوں تک پہنچانے کے لیے خطوط کا استعمال کرتے تھے۔ ابتدا میں خطوط کپڑے پر، چمڑے پر، پتوں پر تحریر کرتے تھے۔ قاصد بادشاہِ وقت کا پیغام خط کی شکل میں پہنچاتے تھے۔ اس کے علاوہ وسیع سلطنت میں موجود صوبوں کے وزرا اور امرا تک بادشاہ کا فرمان (خط) قاصد لے کر جاتے تھے۔ اس طرح سلطنت میں موجود وزرا اور امرا اپنے مراسلوں (خطوط) کے ذریعہ بادشاہ کو وقفہ وقفہ سے حالات سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ بادشاہوں کے دربار میں خط و کتابت کے لیے قابل افراد کا تقرر کیا جاتا تھا۔ وہ زبان اور آدابِ تحریر (خط) سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ پیغام (خط) پہنچانے کے لیے الگ عملہ ہوتا تھا جن کو قاصد یا ہرکارہ کہا جاتا تھا۔ یہ اپنی تیز رفتار سواریوں (زیادہ تر گھوڑوں) کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ درمیان میں قاصدوں کے آرام کے لیے ریسٹ ہاؤز (آرام گھر) تعمیر کیے جاتے تھے۔ منزل تک پہنچنے کے لیے دورانِ سفر سوار اور سواری تبدیل ہوتے تھے تاکہ تازہ دم ہو کر کم وقت میں اپنے مقصد کو پورا کیا جائے اور اپنی منزل تک پہنچا جائے۔

زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ خطوط رسانی کا نظام رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے ایک وزارت و محکمہ کی شکل اختیار کر گیا۔ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں خطوط رسانی کی تقسیم اور تمام امور کی تکمیل کے لیے مرکزی حکومت کے تحت وزارت و محکمہ کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر ناظم الدین منور، شعبہ اردو، ساتاواہانہ یونیورسٹی، کریم نگر صوبہ تلنگانہ

مکتوب نگاری اردو ادب میں ایک اہم صنف کی حیثیت رکھتی ہے یہ ایک غیر افسانوی ادب کا حصہ ہے۔ خطوط و مکاتیب نثری ادب کا وہ حصہ ہیں جن کے ذریعہ ہم کسی شخصیت کے پورے خدوخال سے واقف ہو سکتے ہیں۔

عام طور پر خطوط کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اوّل: شخصی یا نجی خطوط، دوم: سرکاری خطوط، سوم: تجارتی خطوط، چہارم: اخباری خطوط، پنجم: اہل علم، مفکرین، دانشوران اور ادیبوں کے خطوط۔

مکتوب اگر دو ادبی شخصیتوں یا دانشوروں کے درمیان یا ایک ادیب یا دانشور ہو جب کوئی خط تحریر کیا جاتا ہے وہ خط نہیں ہوتا بلکہ ادب کا فن پارہ، کسی بھی موضوع کے متعلق سند، محققین کے لیے ماخذ و حوالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان خطوط کے ذریعہ ہم کو اس دور کے ادبی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی حالات سے واقفیت ہوتی ہے۔ مکتوب میں ادیب و دانشور کی شخصیت دکھائی دیتی ہے۔ خط مکتوب نگار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بعض مشاہیرن ادب و دانش کے مکتوبات اردو ادب کی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔

اردو ادب میں خطوط نگاری کے ابتدائی نقش رجب علی بیگ سرور، غلام غوث بے خبر، سرسید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی اور امیر مینائی کے ہاں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ادب میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ غبار خاطر، اسداللہ خاں غالب۔ خطوط غالب، علامہ محمد اقبال۔ خطوط اقبال، علامہ شبلی نعمانی۔ مکاتیب شبلی، صفیہ اختر۔ زیر لب، فیض احمد فیض۔ صلیبیں مرے دریچے میں اور مہدی افادی۔ مکاتیب مہدی خطوط کے مجموعے بہت شہرت رکھتے ہیں۔

مشاہیرن ادب و دانش کے خطوط کو ترتیب دینے والے (مرتبین) میں اہم نام محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ سرسید کے خطوط، ڈاکٹر خلیق انجم۔ غالب کے خطوط، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ خطوط اقبال، محمد اکبرالدین صدیقی۔ خطوط عبدالحق، پروفیسر آل احمد سرور۔ رشید احمد صدیقی کے خطوط، سید سلیمان ندوی۔ مکاتیب شبلی، ڈاکٹر سید عبداللہ۔ میر امن سے عبدالحق تک، خواجہ حسن نظامی۔ اتالیق خطوط نویسی اور شمس الرحمٰن۔ اردو خطوط قابل ذکر ہیں۔ ان تمام سے قطع نظر ہم دانشوران و ادیبوں کے خطوط میں خصوصاً سرسید احمد خان کے خطوط کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

سرسید احمد خاں بہ یک وقت دانشور، مفکر، ادیب، مورخ، صحافی، مفسر، ماہر تعلیم، مغربی علوم کے علمبردار، فلسفی، بہترین منتظم اور عظیم رہنما ہیں۔ سرسید اردو زبان و ادب کے بڑے خدمت گزار ہیں سرسید نے سادہ اور سلیس نثر کو اپنی تحریر کے ذریعہ فروغ دیا۔ سرسید کے نثری ذخیرے میں خطبات، مقالات و مضامین تقاریر و بیانات اور مکاتیب وغیرہ شامل ہیں۔ سرسید مسلم نشاۃ الثانیہ کے علمبردار ہیں۔ مسلمانوں میں بیداری علم کی تحریک پیدا کی مسلمانوں کو جمود سے نکال کر ایک متحرک قوم بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی۔ وہ ایک بہترین مفکر، اعلیٰ خیال مصنف اور جلیل القدر مصلح تھے۔ سرسید برصغیر کی تاریخ کا وہ باب ہیں جہاں سے ایک سنہرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اردو زبان و ادب کے محسن، مصلح قوم اور جدید اردو نثر کے بانی ہیں تنویر عالم، سرسید کی ہمہ جہت شخصیت کا اس طرح تعارف کراتے ہیں:

> ''مکتوب نگاری اردو ادب میں ایک اہم صنف کی حیثیت رکھتی ہے، خطوط و مکاتیب نثری ادب کا وہ حصہ ہیں جن کے ذریعہ ہم کسی کی شخصیت کے پورے خدوخال سے واقف ہو سکتے ہیں، سرسید اسلامی و ادبی تاریخ کا وہ سنگ میل ہیں جہاں سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اردو زبان و ادب کے محسن، مصلح قوم، رہنما و قائد اور جدید اردو نثر کے موجد کو ہم سرسید کے نام سے جانتے ہیں، کون سی ایسی خدمت ہے جو سرسید نے انجام نہ دی ہو اور کون سا علم و ادب کا میدان ہے جس میں سرسید نے کوئی تحریر نہ لکھی ہو، چونکہ سرسید علمی، دینی، تاریخی، ادبی، اخلاقی، اصلاحی، تعلیمی، سماجی اور تہذیبی جیسے تمام میدانوں سے وابستہ تھے اس لیے آپ کی خط و کتابت ہر طبقہ کے لوگوں سے ہوئی تھی اس وقت افہام و تفہیم، سوالات و جوابات، اعتراضات و جوابات، مسائل اور ان کے حل، ضروریات اور اپنے منصوبوں کا خاکہ، خیالات و آرا کے اظہار اور دوسروں کو اس سے واقف کرانے کے لیے خطوط و مکاتیب کا سہارا لیا جاتا تھا۔''

(گلستانِ سرسید، مرتبہ: شعبہ اردو ساتاواہانا یونیورسٹی، ص ۲۷۳)

سرسید ایک انقلاب آفریں شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے اپنے فکر وعمل سے قوم کے فرسودہ خیالات اور جمود میں طغیانی پیدا کر دی۔ان کے دوررس نگاہوں نے شاہرائے زندگی پر مشعل کا کام انجام دیا۔سرسید نے ہند کی نشاۃ الثانیہ میں گراں بہا خدمات انجام دئے۔سرسید نے قوم وملت کی اصلاح و ترقی کا ارادہ اس وقت کیا جب انگریز پوری طرح ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے۔قوم وملت مغلوب ہو چکی تھی اس وقت مسلمان پسماندگی کی زندگی گزار رہے تھے۔سرسید قوم میں موجود انتشاری کی کیفیت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ایسے حالات میں سرسید نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اصلاح کی اگر کوشش نہیں کی گئی تو مسلمان اور پسماندہ ہو جائیں گے۔ایسی نازک صورتحال کے وقت سرسید نے بے خوفی اور صداقت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔اس وقت کے اہل علم ودانش کی ایک کثیر تعداد نے ان کا ساتھ دیا۔اس کے علاوہ ان کے مخالفین کی بھی کثیر تعداد تھی۔معاصر اہلِ علم ودانش نے اس میدان میں ان کے افکار کے تحت اپنی خدمات جاری رکھیں۔ان معاصرین کی کاوشوں سے ایک نئی جدوجہد کا آغاز ہوا۔

جب حالات پرخطر ہوں اور معاشرہ میں تنگ نظری ہو،صحافت کی سچائی اور صداقت کی بنیادوں پر قائم رہنا مشکل تھا۔سرسید نے اپنے اصلاحی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے جدید تعلیم کو موثر ہتھیار بنایا۔سرسید نے عوام تک اپنے خیالات کی رسائی کے لیے سائنٹفک سوسائٹی کو قائم کیا۔علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا۔اخبارات کی اشاعت عمل میں لائی۔جن سے وابستہ ہو کر اپنے مقاصد کی تکمیل کی جائے۔اصلاحی مقاصد کو عام کرنے کے لیے سرسید نے اخبار اور رسائل نکالے،مضامین لکھے اور اپنے ہم خیال افراد کو اپنی تحریک میں شامل کیا۔سرسید اور ان کے رفقا نے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں ایسے مضامین لکھے جن کا مقصد قوم وملت کی رہبری ورہنمائی تھی۔ان کی یہ فکریں جدید وقت کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ تھیں۔ان کے مضامین کا ہر لفظ قوم وملت کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دیتا ہے اور زوال پذیر قوم وملت کو خواب غفلت سے بیدار کی طرف رہبری کرتا ہے۔انہیں عزت ووقار کی زندگی کی طرف رہنمائی کی۔ان رسائل میں تصوف،شاعری،مضامین،کہانیاں،حکایات،مذہبیات سے متعلق مضامین اور خطوط وغیرہ شائع کیے جاتے تھے۔سرسید کو معلمِ شفیق بھی کہا جاتا ہے۔سرسید اچھی تحریر کی خصوصیات اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ”مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا،رنگین عبارت سے جو تشبیہات واستعارات خیال سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔“
>
> (عبدالحق،مطالعہ سرسید احمد خان،ص۱۲)

مکتوبات سرسید،سرسید کی ہمہ جہت شخصیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ان مکتوبات میں سرسید مفسرِ قرآن،عاشقِ رسول،مدبر،مفکر،دانشور،ماہر ادب،ماہر تعلیم،مذہبی عالم،مجتہد،ماہر اقتصادیات،مدیر،بے باک صحافی،مصنف،ادیب،منتظم،ماہر سیاست،نبض شناس،وقت شناس،رہبر اور قوم وملت کے لیے اپنے سینہ میں درد بھرا ہوا دل رکھنے والی شخصیت نظر آتے ہیں۔مکتوبات سرسید کے مطالعہ سے سرسید کی بصیرت معلوم ہوتی ہے۔

سرسید خطوط میں مختصر وطویل القاب کا استعمال کرتے ہیں۔مثلاً:مخدوم ومکرم من باعث افتخار قوم نواب عماد الملک بہادر،جناب والا،مناقب مخدوم و مکرم جناب محمد علی حسن وغیرہ۔سرسید خطوط میں تاریخ اور مقام کو ضرور تحریر کرتے۔دعائیہ کلمات اور عربی الفاظ کا استعمال بہت خوبی کے ساتھ کرتے تھے۔سرسید کے خطوط میں انشا کی لطافت،صفائی و برجستگی اور حقیقت پسندی سے کہیں کہیں ان کے بیان میں رنگینی و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔سرسید چونکہ اُس وقت کے ہندوستانی قوم بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی حالت دیکھ کر نہایت مایوسی اور بے دلی کے شکار ہو گئے تھے۔وہ قوم وملت کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔اُس وقت کے مسلمانوں کے حالات کو وہ اپنے دوست محسن الملک کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ”افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوب جاتے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں۔ہائے افسوس!ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگرمچھ کے منھ میں ہاتھ دیتے ہیں۔مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے،اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔“
>
> (مکتوبات سرسید،ص۹۰)

آگرہ اوراودھ کے لفٹننٹ گورنر ولیم میور نے ایک کتاب ''لائف آف محمد اینڈ دی ہسٹری آف اسلام ٹو دی ارا آف ہجری'' چار جلدوں میں لکھ کر شائع کی۔ میور کی اس کتاب میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر اعتراضات کیے گئے۔ سرسید، میور کے اس اعتراضات کا جواب دینا اپنے تئیں فرض سمجھتے تھے۔ پروفیسر اصغر عباس اس کتاب کی اشاعت اور سرسید کی بے چینی واضطراب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ممالک آگرہ و اودھ کے لفٹننٹ گورنر ولیم میور (۱۹۰۵۔۱۸۱۹) نے ممتاز مناظرہ باز اور مشنری سی۔ جی۔ پی فنڈر (۱۸۶۵۔۱۸۰۳) کے ایما پر دی لائف آف محمد اینڈ دی ہسٹری آف اسلام ٹو دی ارا آف ہجری چار جلدوں میں شائع کی اس میں رسول اللہ ﷺ کی حیات اور تعلیمات کو جس طرح پیش کیا گیا تھا اس پر سرسید نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ اس کتاب کے بارے میں نصرانیوں میں یہ مشہور تھا کہ 'اس نے اسلام کے استحصال میں تسمہ نہیں لگا رکھا' حالی جب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ساتھ ۱۸۶۷ء کے علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کے سالانہ جلسہ میں پہلی بار سرسید سے ملے تو انہوں نے میور کی کتاب کے سلسلے میں ان کے اضطراب اور بے چینی کا حال خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔''

(خطبات احمدیہ، شروع کی بات، سرسید اکیڈمی علی گڑھ، ص ۱)

سرسید مغربی علوم، مغربی تعلیمی نظام اور تعلیمی اداروں سے واقفیت کے لیے اپنے بیٹے سید محمود کے ہمراہ اپریل ۱۸۶۹ء میں انگلستان کا سفر کیا۔ سرسید کے اس سفر کا تعلیمی مقصد اور میور کی کتاب کا جواب لکھنا تھا۔ سرسید کے مذہبی اور تعلیمی افکار پر ثریا حسین اس طرح روشنی ڈالتی ہیں:

''سرسید ایک عرصہ سے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے ایک معیاری تعلیمی ادارے کے قیام کی فکر میں تھے مگر اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے سے پہلے وہ خود انگلستان کے نظام تعلیم اور وہاں کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے نصاب سے واقفیت ضروری سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب لکھنا بھی ان کے پیش نظر تھا جس کے لیے مطلوبہ کتابیں اور ماخذات صرف لندن کے کتب خانوں سے دستیاب ہو سکتے تھے۔ انگلستان کا یہ سفر ان کی اصلاحی اور تعلیمی سرگرمیوں کی ایک اہم کڑی ثابت ہوا۔''

(سرسید اور ان کا عہد، ص ۲۷۱)

سرسید کا سفرنامہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء سے شروع ہوتا ہے جب وہ بروز جمعرات اسٹیمر جہاز کے ذریعہ بنارس سے لندن کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ سرسید پانی کے جہاز سے ۲ رمئی کو لندن پہنچے اور وہاں کے محلات، کلیساؤں، پارکوں اور دیگر عمارات اور مقامات کا دورہ کیا۔ وہاں کے مرد و خواتین کے تعلیمی نظام سے بے حد متاثر ہوئے اور ہندوستان میں بھی تعلیم نسواں کے حق میں بات کرنے لگے۔ ایک مصری لڑکی کی تعلیمی قابلیت کو اپنے خط میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''روم اور مصر دونوں میں روز بروز تعلیم کی ترقی ہے۔ عورتیں بھی بہت زیادہ پڑھی لکھی ہوتی جاتی ہیں۔ مصر کی ایک مسلمان لڑکی کا میں نے حال سنا کہ عربی زبان جو کہ اس کی اصلی زبان ہے اور جس میں وہ نہایت فصاحت سے لکھتی پڑھتی ہے۔ فرنچ زبان میں بھی نہایت خوب بولتی ہے اور لیٹن اس قدر جانتی ہے کہ جو مضمون یا شعر اس کے سامنے رکھا جائے اس کو پڑھ لیتی ہے اور مضمون سمجھ لیتی ہے۔''

(سرسید مسافران لندن، ص ۱۷۶)

قیامِ لندن کے دوران مختلف زبانوں کی کتابوں سے استفادہ کیا اور علمی و تحقیق سطح پر اس کا جواب خود عیسائی عالموں کے اقوال کی سند پر دیا۔ اسی دوران سرسید ولیم میور کی پر تعصّباتی نظریہ سے بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ سرسید لندن سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرتؐ کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا ہے اور

ان کی ناانصافیاں اور تعصّبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا ہے اور مصمم ارادہ کیا کہ کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو۔''

(رسالہ اردو، عبدالحق، ص ۵۵۱)

اور اس سلسلے میں سرسید کو جب معاشی مشکلات درپیش آنے لگی تو ایک خط میں محسن الملک کو لکھتے ہیں:

''کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرا ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو۔''

(خطوط سرسید، ص ۶۱)

سرسید نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں موجود کتابوں کا مطالعہ کیا۔ مصر، فرانس اور جرمنی میں چھپنے والی عربی سیرت کی کتابیں وہاں سے منگائیں اور کچھ کتابیں لندن کے بازار سے نہایت گراں قیمت پر خریدیں۔ بہت ہی صبر آزما حالات سے گزر کر سرسید نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ بڑی محنت و جستجو کے بعد خطبات احمدیہ لکھی اور لندن ہی سے ۱۸۶۹ء میں اس کتاب کو شائع کیا۔ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرایا گیا۔ پروفیسر اصغر عباس کے مطابق ان خطبوں کا انگریزی ترجمہ اپنے بیٹے سید محمود سے کرا کر ''سیریز آف ایسیز آن دی لائف آف محمدؐ'' کے عنوان سے ۱۸۷۰ء میں لندن سے شائع کروا کر تقسیم کیا گیا۔

خطبات احمدیہ کل بارہ خطبات پر مشتمل ہے۔ یہ تمام میور اور دیگر مستشرقین کے اسلام پر لگائے گئے الزامات کا مدلل جواب ہے۔ سرسید کی تمام تصانیف میں خطبات احمدیہ ہی ایسی کتاب ہے جس کے لکھنے کا مقصد عقیدت رسول اور ان سے بے پناہ جذبہ محبت ہے۔ خطبات احمدیہ کی تصنیف میں سرسید کا عشق رسول اور حمیت اسلامی نظر آتی ہے۔ خطبات احمدیہ کی یہ تصنیف پر انگریزوں کا کیا ردعمل تھا اس کی عکاسی الطاف حسین حالی اس طرح کرتے ہیں:

''مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ میں جا کر یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب لکھ کر شائع کی ہو۔ سرسید کہتے تھے کہ ۱۸۷۰ء میں جب خطبات احمدیہ لندن میں چھپ کر شائع ہوئی تو اس پر لندن کے ایک اخبار میں ایک انگریز نے لکھا تھا کہ عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہئے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انہیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔''

(حیات جاوید، ص ۴۲۲)

سرسید کی عشقِ محمدی سے سرشار زندگی کا ڈاکٹر محمد کلیم اس طرح تذکرہ کرتے ہیں:

''سرسید کی پوری زندگی عشق نبویؐ سے معمور ہے ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز و اختتام سیرت نبوی سے ہی ہوا۔ خطبات احمدیہ ان کی محبت رسول کی کھلی ہوئی دلیل ہے سرسید نے جب تصنیف و تالیف کی ابتدا کی تو سب سے پہلے جلاء القلوب بذکر المحبوب تصنیف کی اور جب بستر مرگ پر تھے تب بھی امہات المومنین کی تصنیف و تالیف میں مشغول تھے۔ سرسید ایک سچے عاشق رسول اور ملک و قوم کے ہمدرد تھے ان کی تصنیف و تالیف میں تین کتابیں سیرت نبویؐ سے متعلق ہیں ''خطبات احمدیہ'' ان کی تمام تالیفات و تصنیفات میں گل سرسبز کی حیثیت رکھتی ہے اور سرسید کی تحقیقی و علمی قابلیت اور عشق رسول کی بین دلیل ہے۔''

(گلستان سرسید، ص ۱۲۵)

سرسید نے اپنے سفرِ لندن کو کارآمد بنانے کے لیے دوران سفر مشاہدات پر غور و خوص کیا، نتائج اخذ کیے اور اپنے خیالات کو خطوط کی شکل میں لکھ کر

ہندوستان روانہ کیا۔ سرسید نے لندن سے اپنے رفقا اور اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اشاعت کے لیے کئی خطوط لکھے۔ سرسید نے قیامِ لندن کے دوران محسن الملک اور اپنے رفقا کو شخصی خطوط لکھے اور سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری راجہ جے کشن داس کے خطوط میں مطالعات اور مشاہدات لندن کا تفصیلی ذکر کیا اور کہا کہ خطوط کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا جائے تا کہ ان کے مشاہدات سے اہل وطن بواقف ہوں۔ لندن سے لکھا ہوا سرسید کا خط علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ۱۳؍جنوری ۱۸۷۱ء کو شائع ہوا۔ سرسید نے جب پہلی مرتبہ کیمبرج یونیورسٹی میں قدم رکھا تو ان کے دلی جذبات کی ترجمانی اس خط میں تحریر کی ہے جس کا اقتباس اس طرح سے ہے:

''ایک روز میں اپنے لڑکے سید محمود اور اپنے دوست سید عبداللہ پروفیسر کے ساتھ ریل پر سوار ہو کر کیمبرج کو گیا۔ جب کبھی میں اپنے وطن یعنی ہندوستان کے کسی علمی جلسے کی سیر کے واسطے جاتا تھا تو ہمیشہ میرا نہایت جی لگتا تھا۔ پس جب میں اس موقع پر کیمبرج کے قریب پہنچا جو علوم فنون کا مصدر ہے تو اس کی قدامت اور اس عالمگیر شہرت کے لحاظ سے جو اس شہر کو بہت سے ایسے مشہور و معروف آدمیوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے جن کو عقل و دانش اور کوشش کے سبب سے دنیا میں علم کی روشنی پھیلی ہے اور اس کی شعاعوں سے جہالت، غلطی اور تعصب کی رفع ہوئی ہے، میرے دل پر ایک رعب اور حیرت کی سی حالت طاری ہوئی۔ کیمبرج اس نام سے اس لیے مشہور ہے کہ کیمیا گرنٹ تو وہاں ایک دریا ہے اور ایک پل اس پر بندھا ہوا ہے جس کو انگریزی میں برج کہتے ہیں چنانچہ تاریخ میں بھی اس کیمبرج یا گرینٹ برج دونوں طرح بیان کیا ہے اور وہ بہت سی صدیوں سے وہ اس مشہور و معروف یونیورسٹی ہونے کے سبب سے ممتاز ہے۔''

(تہذیب الاخلاق، ص ۷، اگست ۲۰۲۲)

سرسید کیمبرج یونیورسٹی کے مطالعاتی سفر کے بعد اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''کیمبرج کی یونیورسٹی کی سیر سے جو اس قدر دانشمندی، فیاضی، جاں فشانی اور محنت کے ثبوت میری نظر سے گزرے ان کو دیکھنے سے مجھ کو نہایت حیرت ہوئی اور میں نے اپنے دل میں بہ آرزوئے تمام یہ دعا مانگی کہ میرے وطن ہندوستان میں جو ہندوستانیوں کی طبیعتوں میں ہنوز ہمسری اور ترقی کا جوش نہیں ہے وہ بہت جلد برانگیختہ ہوتا کہ اس کو بھی آئندہ کسی زمانہ میں جو نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہنوز بہت دور ہے علوم و فنون میں مشرقی ملکوں میں ایسی ہی شہرت اور عظمت حاصل ہو جیسی کہ انگلستان کو مغربی ملکوں میں حاصل ہے۔''

(تہذیب الاخلاق، ص ۸، اگست ۲۰۲۲)

لندن میں قیام کے دوران بھی سرسید سائنٹفک سوسائٹی کے فروغ کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے تھے اسی فکر میں مہدی علی خان کو خط لکھتے ہیں:

''کہ مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی و کوشش کا واسطے شکست کر دینے سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں۔''

سرسید نے لندن سے ایک خط محسن الملک کو لکھا کہ واپسی تک ان کے خطوط کو ترتیب دیا جائے جن باتوں کی وضاحت مطلوب ہو انہیں پوچھ کر شامل کر لیا جائے اور مزید اضافے کیے جائیں۔ سرسید کی وطن واپسی اور ان کی مصروفیات کی وجہ سے مجوزہ سفر نامہ (خطوط کا مجموعہ) کتابی شکل میں شائع نہیں ہو سکا، جو حصہ ترتیب دیا گیا وہ تقریباً ۱۰۰ صفحات پر مشتمل تھا، جو ۱۸۰۰ء میں تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا۔ دورانِ قیام سرسید نے وہاں کی تعلیمی ترقی کا قریب سے مشاہدہ و مطالعہ کیا۔ لندن میں طویل قیام کے بعد اکتوبر ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس ہوئے۔

سرسید کی تحریروں میں دورانِ سفر پیش آئے مشاہدات کو بنیاد بنا کر شیخ اسمٰعیل پانی پتی نے جولائی ۱۹۶۰ء میں چھ ضمیموں کے اضافے کے ساتھ سرسید

کے سفرنامہ 'مسافران لندن' کو ترتیب دیا۔ پہلا ضمیمہ سکریٹری سائنٹفک سوسائٹی کے ۱۵/اکتوبر ۱۸۶۹ء کو لکھے گئے ایک طویل خط پر مشتمل ہے۔ دوسرا حیات جاوید سے اخذ کیا گیا ہے۔ تیسرا ضمیمہ محسن الملک کو لندن سے لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔ چوتھا ضمیمہ بینتھم کلب کا حال، پانچواں ضمیمہ ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کی تقریب پر اور چھٹواں ضمیمہ سرسید کے نام ۱۷/جولائی ۱۸۶۹ء کو لکھے گئے گارساں دتاسی کے خط پر مشتمل ہے۔ اس طرح سرسید کے خطوط پر مشتمل یہ سفرنامہ کی تکمیل ہوئی۔ سرسید کے اس سفرنامہ سے انگلستان کی زندگی، وہاں کا جغرافیہ، تہذیب وتمدن، تعلیمی نظام اور انگریزوں کی ترقی کے اسباب معلوم ہوتے ہیں۔

سفرنامہ مسافران لندن (خطوط کا مجموعہ) پر مجموعی تاثر بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ابرا الباقی لکھتے ہیں:

''سرسید کے سفرنامہ لندن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفرنامے سے زیادہ سرسید کے افکار کا مجموعہ ہے جسے سفرنامہ کی شکل دی گئی ہے۔ اردو کے سفرناموں پر نظر ڈالی جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر ادیبوں نے سفرنامہ لکھنے کی غرض سے سفر کیے اور اپنے افکار سے زیادہ سفر کے حالات کے بیان پر توجہ دی جبکہ سرسید نے اپنے سفر کی غرض وغایت کے پیش نظر انگلستان کی زندگی اور وہاں کے لوگوں کی ترقی سے ہندوستانیوں کے لیے فکر انگیز باتیں پیش کیں۔ یہ کتاب سفر کے احوال پیش کرتی ہے اس لیے اسے سفرنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔''

(گلستانِ سرسید، ص ۱۵۶)

مسدس کے مطالعہ کے بعد سرسید خوشی سے سرشار دلی جذبات کے ساتھ حالی کو اس طرح خط لکھتے ہیں، یہ وہی شاہکار خط ہے جس میں سرسید کے تاریخی الفاظ (جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں) ہیں جو ادبِ عالیہ کا حصہ بن گئے ہیں:

''جناب مخدوم ومکرم من عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہو لی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہو لی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہو۔ کس صفائی، خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایہ ناز شعر وشاعری ہے بالکل مبرا ہے کیوں کہ ایسی خوبی وخوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں سے ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جاسکتے۔ حق یہ ہے جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف ان ہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔

بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنی میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔ آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔ نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھے مطلع فرمائیے یہ بھی لکھئے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب موجود ہے۔''

خاکسار آپ کا احسان مند

سید احمد

شملہ پارک ہوٹل

۱۰ جون ۱۸۷۹ء

سرسید اپنے فرزند سید حامد کے انتقال کے بعد صبر کی تلقین کرتے ہیں کہ حکم خداوندی کو ہر حال میں قبول کرنا چاہیے، لکھتے ہیں:

''سید حامد کے انتقال سے جو الم ہوا ہے، اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ ان کے قرض کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کیوں کر ادا ہوسکتا ہے۔ تم نے جو تعداد قرضہ لکھی ہے، تفصیل وار اس کی فہرست لکھو کہ کس کس کا ہے اور نیز ٹھیک اندازہ لکھو کہ ان کی بیوی کے اخراجات کے لیے ماہواری کیا دینا چاہیے مگر نہایت کفایت اور ضرورت سے کام ہونا چاہیے، جواب جلد بھیجو۔''

(مکتوبات سرسید دوم شیخ اسماعیل پانی پت، ص ۱۴)

سرسید اپنے فرزند کے انتقال کے بعد ان کی بیوی بچوں کی کفالت کے لیے درکار رقم کی معلومات کے لیے اپنی پوتی احمدی بیگم کے نام خط اس طرح لکھتے ہیں:

''تمہارا خط پہنچا۔ تم نے تو دو خط بلانے کے لیے بھیجے تھے مگر ہماری بوا صاحب نے کوئی خط نہیں بھیجا، نہ ملانے کا پیغام بھیجا، اس لیے میں بھی نہیں آیا۔ اب اس خط میں تم نے ان کی طرف سے بھی بلاوے کا پیغام بھیجا ہے، اب میں آؤں گا۔ پلنگوں کو نواڑ سے بنوا رکھنا اور اگر گرمی ہو تو باہر کے مکان میں جو سونے کا کمرہ ہے، اس میں ایک پنکھا بنوا کر رکھنا۔ جب سب چیزیں تیار ہو جاوے تو مجھے خبر کرو، میں چلا آؤں گا۔''

(مکتوبات سرسید (جلد دوم)، شیخ اسماعیل پانی پتی، ص ۱۷)

اس خط میں سرسید اپنی پوتی کے لیے ایک دوست نما دادا ہیں۔ ایک طرف احمدی بیگم سے گھر آنے کا وعدہ کرتے ہیں تو دوسری جانب بوا صاحبہ کی دستخط کے حوالے سے پوتی کو بہلانے کا بھی کام کرتے ہیں۔

سرسید کے مکتوبات کے طرزِ تحریر کے بارے میں زبیر عالم اس طرح اپنا خیال پیش کرتے ہیں:

''مکتوبات سرسید اس عبقری شخصیت کی روداد حیات کو بیان کرتے ہیں۔ ان مکتوبات میں سرسید ایک طرف مدبر نظر آتے ہیں تو دوسری جانب ماہر تعلیم۔ ایک طرف اس وقت کے تناظر میں اپنے سیاسی موقف کو دلائل کے ساتھ واضح کرتے ہیں تو اس کے برعکس خاندانی مسائل کو بھی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام تک پہنچاتے ہیں۔ خانگی زندگی میں وہ احمدی بیگم کے لیے ایک شفیق اور دلجوئی کرنے والے دادا کے روپ میں نظر آتے ہیں تو اپنے دونوں فرزندوں کے لیے دور اندیش والد کی ذمے داریاں بھی بخوبی نبھاتے ہیں۔ اسی طرح مدرسۃ العلوم کی امداد کے واسطے یہ انسان مغرب و مشرق تا جنوب و شمال ہر کونے میں فقیروں کی طرح صدا لگاتا پھرتا ہے۔ اس عمل میں وہ کسی مقام پر ذلیل کیا جاتا ہے تو کسی مقام پر سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔''

(گلستانِ سرسید، ص ۲۷۳)

انجمنِ پنجاب کا قیام ۲۱ر جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں ہوا۔ پہلے صدر پنڈت من پھول نے پہلے اجلاس میں انجمن کے مقاصد کو اس طرح بیان کیا کہ کلکتہ اور لکھنؤ کی طرح لاہور میں بھی ایک ایسی انجمن قائم کی جائے جس میں تنقید مطالب مفیدہ پنجاب و ترقی علم و ہنر کے تحریراً و تقریراً عمل میں آکر بذریعہ چھاپا منتشر ہوا کرے۔ اس انجمن کے کسی نے ۲۴ اور کسی نے ۳۵ ارکین لکھا ہے ہر ہفتہ اس انجمن کا جلسہ خاص اور جلسہ عام ہوا کرتا تھا۔ بہت جلد اس انجمن کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اس انجمن کے جلسہ عام میں تعلیمی، اخلاقی، ادبی، سماجی، تہذیبی، انتظامی اور اصلاحی موضوعات پر اظہار خیال کی دعوت دی جاتی اور مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ مقررین کو انعامات اور سند سے نوازا جاتا تھا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۱ر فروری ۱۸۶۵ء کو اپنا پہلا مضمون 'در باب رفع افلاس' جلسہ عام میں پیش کیا اس طرح یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ آزاد کی

علمی جستجو کو دیکھ کر انجمن کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ آزاد نے اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ انجمن میں نئی روح پھونک دی۔ ایک سال میں آزاد نے مختلف موضوعات جس میں ادب، تاریخ زبان، شعروادیب عوامی مسائل پر ۳۶ لیکچر، مضامین اور تبصرے جلسہ عام میں پیش کئے۔ آزاد کا ایک مضمون 'خیالات در باب نظم اور کلام موزوں' پر بہت پسند کیا گیا اور یہ ہی مضمون مقدمہ 'نظم آزاد' ہوا اور پھر یہ ہی مضمون کو اردو نظم نگاری میں ایک منشور کی حیثیت حاصل ہے۔ اس طرح اردو کی پہلی نظم آزاد کی مرہون منت ہے مگر تحریکِ نظم نگاری میں ان کی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

محمد حسین آزاد نے ۱۹/اپریل ۱۸۷۴ء کو نظم نگاری اور جدید شاعری کے موضوع پر روایت سے ہٹ کر اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کو پیش کیا۔ قدیم شعری روایات پر عمل پیرا ہونے والوں نے اس پر اعتراض کیا اور شدید مخالفت کی۔ قدامت پسندی اور روایت پسندی کے قلعہ سے تیروں کی بارش شروع ہوگئی۔ اسی دوران آزاد نے سرسید کو ان حالات سے واقف کروانے اور تائید حاصل کرنے کے لیے ایک خط لکھا جس کے جواب میں سرسید ۱۹/اکتوبر ۱۸۷۴ء کو ایک خط محمد حسین آزاد کو اس طرح لکھتے ہیں:

''حالات مندرجہ سے اطلاع ہوئی۔ افسوس صد افسوس کہ کبھی مسلمانوں میں باہم اتفاق نہ ہو۔ شعر وسخن پر رد وقدح دوسری چیز ہے اور آپس کا نفاق دوسری چیز ہے میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے برآئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی 'خواب امن' پہنچی دل بہت خوش ہوا۔ دراصل شاعری اور زورِ سخن وری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں، اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ آپ لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کئے جائیں یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ اب تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں۔ ہم بیان کیا کر سکتے ہیں۔ بعد رمضان انشاءاللہ تعالیٰ ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا۔ ان دنوں بسبب صوم کچھ کام نہیں ہوسکتا۔''

(سر راس مسعود، خطوط سرسید، ص ۲۲)

سرسید وعدہ کے مطابق اپنے مضمون میں نظم اردو کے شعرا کی بھرپور تائید کی اور مخالفین کی مذمت کی اور محمد حسین آزاد کی کاشوں کی بھرپور حمایت کی۔ سرسید کا یہ مضمون تہذیب الاخلاق میں ۷/فروری ۱۸۷۵ء کو شائع ہوا۔

منشی سراج الدین احمد نے اپنے خط میں سرسید کی خوب تعریف لکھی سرسید نے اس خط کا جواب اس طرح دیا:

''آپ کا عنایت نامہ پہنچا، ممنون ہوا۔ آپ کے قلم نے ''سومور گزٹ'' میں میری نسبت زیادہ جوش دکھایا جس کے لائق میں خود اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔ میں فرض کرتا ہوں کہ آپ اپنی عنایت ومحبت سے مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں لیکن اور لوگ تو ایسا نہیں سمجھتے۔ پس وہ لوگ آپ کی تحریر کو فضول سمجھتے ہوں گے۔ پس ایسی تحریرات سے، جن کو لوگ فضول سمجھیں، کیا فائدہ؟ بہ ایں ہمہ اگر آپ چاہتے ہیں تو لیجئے، ملفوف ہے، اگر تصویر میں کچھ نقص ہو تو بے چاری بے جان تصویر پر الزام نہ دیجئے گا بلکہ جس کی تصویر ہے اس پر، اور اگر آگے بڑھیے تو اور پر مگر یہ نصیحت پیر دانہ یاد رکھنی چاہیے۔''

سرسید منکسر المزاج شخصیت کے مالک تھے۔ عاجزی، انکساری، نرمی، شفقت ومحبت سے لبریز تھے۔ وسیع النظر اور اپنے سینہ میں قوم و ملت کے لئے ایک درد بھرا دل رکھتے تھے۔ رفقا اور معاصرین سے محبت سے پیش آتے تھے۔ جو ایک بار سرسید سے ملاقات کرتا وہ ان ہی کا ہو جاتا۔ مخالفین کے تنقید کی کبھی پرواہ نہیں کی اپنے مقصد کے حصول میں بے خطر وخوف چلتے رہے۔ مشکلات، پریشانیوں، مصیبتوں اور مشکل حالات میں صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ آپ نے صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ سرسید ہمیشہ دوسرے انسانوں کو اپنے سے بہتر سمجھتے تھے۔ ایک خط میں سرسید کس طرح اپنے آپ کو کم حیثیت سے پیش کرتے ہیں:

''میں صرف ایک گنہ گار شرمسار آدمی ہوں۔ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی مجھے گنہ گار سے ہزار بادرجہ بہتر ہے۔''

(مکتوبات سرسید، اسماعیل پانی پتی، ص۳۰۳)

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدا میں ہندوستان میں بیداریٔ نسواں کی تحریک شروع ہوئی۔اس تحریک میں کئی تعلیم یافتہ مسلم خواتین نے حصہ لیا جن میں سلطان جہاں بیگم، وحید جہاں، عطیہ بیگم، فیضی، فاطمہ بیگم، نفیس دلہن اور صغریٰ ہمایوں کے نام قابل ذکر ہیں۔اس تحریک نے خواتین کے مسائل کے لیے بڑی جد جہد کی۔اسی دور میں خواتین کے متعلق رسائل شائع ہونے لگے۔پہلا رسالہ ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ سے رفیق النساء کے نام سے جاری ہوا۔

(رسالہ رفیق النساء جلد ا شمارہ ۶۲، اگست ۱۹۳۰ء)

سرسید نے سیدالاخبار، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ اور تہذیب الاخلاق میں خواتین کے متعلق اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو پیش کیا۔سرسید نے مذہبی نقطہ نظر سے خواتین کا مقام، خواتین کے طرز زندگی، صحافتِ نسواں سے متعلق مضامین تحریر کیے۔سرسید نہیں چاہتے تھے کہ خواتین کے نام سے کوئی الگ اخبار یا رسالہ جاری ہو۔اس کا اندازہ سرسید کی سید ممتاز علی لاہور سے خط و کتابت سے ہوتا ہے۔سید ممتاز علی لاہور سے خواتین کے لیے ایک رسالہ نکالنا چاہتے تھے انہوں نے سرسید سے اس رسالے کے لیے نام تجویز کرنے کی گزارش کی اور کچھ ناموں کی فہرست اپنے خط کے ساتھ روانہ کیے۔سرسید نے ان ناموں کو خارج کر دیا بلکہ اس خیال کو مسترد کر دیا لیکن ممتاز علی کی فرمائش پر تہذیب نسواں نام تجویز کیا اور اپنے خط میں اس کی وضاحت کی ہے:

''مشفق و محبی مولوی سید ممتاز علی

عنایت نامہ ملا۔اگر آپ نے مجھ سے اس بات میں مشورہ نہیں لیا کہ اخبار جاری کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ بلکہ اس کے نام کے بابت دریافت کیا ہے۔چاہے آپ میرا مشورہ پسند نہ کریں مگر میں یہی کہوں گا کہ آپ خواتین کے لیے اخبار کر کے پچھتائیں گے اور تکلیف، نقصان اور سخت بدنامی کے بعد بند کرنا ہوگا لیکن اگر آپ ان سب باتوں کو سمجھ لینے کے بعد جاری کریں تو جو نام آپ نے مجھے لکھ کر بھیجے ہیں ان میں سے مجھے کوئی بھی پسند نہیں آیا میری رائے میں کوئی اخبار مستورات کے لیے جاری کیا جائے تو اس کا نام تہذیبِ نسواں ہونا چاہیے۔''

(مکتوبات سرسید، اسماعیل پانی پتی، ص۳۸۶)

سرسید نے سیدالاخبار، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں ایسے مضامین لکھے جن کا مقصد قوم و ملت کی رہبری و رہنمائی تھی۔ان کی یہ فکریں جدید وقت کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ تھیں۔سرسید نے اپنے مضامین میں قوم و ملت میں موجود خامیوں پر کھل کر بحث کی ہے۔قوم و ملت میں موجود مسائل کو پیش کیا مسائل کو حل کرنے کے تدابیر اور طریقوں کی طرف رہنمائی کی کیونکہ ان کی نظر میں پوری قوم کے مسائل یکساں تھے، مخصوص فرقہ کے مسائل پر وہ اس وقت بات کرنا زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔سرسید ہندو اور مسلمان دونوں کو عزیز رکھتے تھے۔سرسید کی تحریروں میں قومی یکجہتی، سالمیت اور امن دکھائی دیتا ہے۔انہوں نے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا اور اسی کے ذریعہ اپنے مقصد کو حاصل کیا۔سرسید کے خطوط کے صفات کا آل احمد سرور اس طرح تذکرہ کرتے ہیں:

''خطوں میں وہی شخصیت جھلکتی ہے جو 'تہذیب الاخلاق' کے کالموں میں ہم ایک لیڈر، ایک مصلح قوم، ایک معلم اخلاق، ایک سیاسی رہنما سے ہر جگہ دو چار ہوتے ہیں۔سرسید کے خط غالب کے خطوں کی طرح دلچسپ نہیں ہیں۔سرسید کے یہاں نہ کوئی راز ہے، جس سے پردہ اٹھنے میں دلچسپی ہو، نہ نشیب و فراز ہیں، جس سے گزر کر انسان ہمتوں کی پستی اور شوق کی بلندی کا نظارہ کرے۔''

(تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ص۶۶)

سرسید کو قومی یکجہتی بہت عزیز تھی تمام مذاہب اور پیشواؤں کا احترام کرتے تھے۔وطن کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گی تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جاوے گی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جاوے گی۔''

(مکمل مجموعۂ لکچرز، مرتبہ مولوی محمد امام الدین گجراتی، ص ۱۵۱)

سرسید کے ہم عصر مذہبی رہنماؤں نے سرسید کے مذہبی افکار کو مسترد کر دیا تھا۔ سرسید نے مسئلہ اجتہاد کا سہارا لیا اور اپنے جذبات کو خط کی شکل میں تحریر کر کے محسن الملک کو بھیجا سرسید اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''بھائی جان سنو، اب وقت نہیں رہا کہ میں اپنی مکنونانِ ضمیر کو مخفی رکھوں میں صاف صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تنقید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن وحدیث سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کر سکیں گے تو مذہبِ اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جاوے گا اس خیر خواہی نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پرواہ نہیں کرتا ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لیے اور بہشت میں داخل ہونے کے لیے ائمہ کبار تو درکنار مولوی حبو کی بھی تقلید کافی ہے۔''

(پروفیسر خلیق احمد نظامی، سید احمد خاں، ص ۲۹)

سرسید اور ان کے رفقا، سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ تحریک، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے مجموعی مقاصد یہ تھے کہ قوم وملت کو تعلیم کی طرف راغب کرنا، ان کے اندر تحریری صلاحیت پیدا کرنا۔ انگریزی اور مغربی علوم کی اہمیت کو واضح کرنا۔ مذہبی تعلیم کا رجحان پیدا کرتے ہوئے شریعتِ اسلامی سے واقف کروانا، تہذیب وتمدن سے واقف کرنا، دینی وعصری تعلیم کے ذریعہ معاشرے میں بیداری پیدا کرنا، عالم میں ہو رہی سائنسی ترقی سے ہونے والی تبدیلیوں کو منظرِ عام پر لانا۔ سیاسی بیداری پیدا کرنا۔ انگریزی تعلیم کا شوق پیدا کرنا، دوسری اقوام سے شانہ بہ شانہ چلنے کے لیے نئے علوم سیکھنے کی ترغیب دینا۔ اردو ادب کو عام فہم بنانا۔ معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا۔ سماجی فرائض سے آگاہ کرنا اور قومی یکجہتی کو فروغ دینا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سرسید کے خطوط ان کی جدوجہد زندگی کا آئینہ دار ہیں۔ سرسید کے خطوط تاریخی معلومات کا اہم ذریعہ ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے سرسید کے خطوط کو ان کے اخلاق و آداب کا ترجمان لکھا ہے:

''اگر ہمیں آدم نثر جدید بانیٔ مدرسۃ العلوم اور حامیٔ ملک وملت یعنی سرسید اعظم کو اگر برافگند نقاب دیکھنا ہے تو خطوطِ سرسید کا مطالعہ کرنا چاہیے، وہاں انہوں نے اپنا دل ودماغ کھول کر رکھ دیا ہے، یہ خطوط ان کے اخلاق وعادات، اعتقادات و نظریات اور عصری معلومات کا خزانہ اور گنجینہ ہیں۔''

(مکتوبات اردو کا ادبی وتاریخی جائزہ، ص ۲۵۴)

خطوط سرسید کے ذریعہ مسلمانوں کی مذہبی حالت، تحریک علی گڑھ مدرسۃ العلوم مسلمانان ہند، تہذیب الاخلاق، کالج کے حالات، معاصرین سرسید اردو و ہندی نزاع، جدید اردو شاعری، مسلمانوں کی سیاست اور تعلیم کی حالت، قوم مسلم کی زبوں حالی وپستی اور ان کے تدارک کے ذرائع وغیرہ پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے اور قیمتی تاریخی مواد حاصل ہوتا ہے۔

سرسید نے اپنے عزم مصمم کے ذریعہ اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کی اور برصغیر کے بڑے حصہ کو اپنی تحریک کا حصہ بنایا۔ سرسید نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اپنے منصوبوں کو پورا کیا جن میں اہم کام 'اسباب بغاوت ہند' کی تصنیف شامل ہے۔ سرسید نے سخت مخالفت کے باوجود نہ کبھی اپنے منصوبوں کو واپس لیا اور نہ اپنے قدموں کو کبھی پیچھے ہٹایا۔ کبھی سرسید کے قدم ڈگمگائے نہیں بلکہ سرسید کے مخالفین ان کے تائیدین بن گئے۔ یہ صرف سرسید کا یقین محکم اور عمل پیہم ہے۔

شاداب شمیم سرسید کے تحریری اسلوب کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''سرسید کو پیرائے سے زیادہ مطلب کی فکر تھی اور اسلوب سے زیادہ مضمون کی جستجو تھی سرسید کے خطوط مرحوم کی تمام زندگی اور ان کی علمی و عملی جدوجہد کی آئینہ دار ہیں، سرسید کے خطوط بڑی حد تک سپاٹ ہیں لیکن خلوص اور سچائی نے بے جان لفظوں میں جان ڈال دی ہے۔ ان کے خطوط میں سادگی اور بے ساختگی ہے۔''

(گلستانِ سرسید، ص ۱۶۳)

پروفیسر ٹامس آرنلڈ سرسید کی خدمات کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں:

''حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہوسکتا ہے تو یقیناً سرسید احمد خاں اس کے مستحق تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز مہارتیں اور اوصاف مجتمع ہوں۔ وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا۔ اس کا اثر اس عالم کا نہ تھا جو گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اکسائے بلکہ وہ اعلانیہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر اس لیے آیا کہ جس کی بات کو صحیح اور سچ سمجھے اگر اس کی دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لیے ہر وقت تیار اور آمادہ رہے۔ ہندوستان میں ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے کہ جان و مرتبہ تھا، نہ دولت تھی، باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور کے حاصل نہیں ہوا۔''

(ڈاکٹر سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۳۲۹)

سرسید کی تحریک ایک جامع تحریک تھی اور وہ جانتے تھے کہ مسلمان ترقی یافتہ قوم اس وقت ہوسکتی ہے جب اس کے ذہن میں جدید تعلیم کی شمع روشن ہو، دینی علوم کی صحیح رہنمائی ہو۔ علی گڑھ تحریک ایک وسیع الجہت تحریک تھی جس کا مقصد سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی زندگی میں اصلاح کر کے اسے ایک طاقتور قوم میں تبدیل کرنا تھا۔

موجودہ سرسید کے درج ذیل خطوط کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) رسالہ تحریر فی اصول التفسیر، ۱۸۹۲ء مطبع مفید عام آگرہ، (۲) مکاتیب الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن مرتب محمد عثمان مطبع محمدی علی گڑھ ۱۹۲۵ء (۳) خطوط سرسید مرتب سر راس مسعود نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۴ء (۴) انتخاب خطوط سرسید، شیخ عطاء اللہ قومی کتب خانہ لاہور ۱۹۵۸ء (۵) مکتوبات سرسید اسماعیل پانی پتی (۶) سرسید احمد خان کے خطوط، مرتبہ وحید الدین سلیم، (۷) مکاتیب سرسید احمد خان مرتبہ مشتاق حسین اس کے علاوہ اس میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔ سرسید کے خطوط جو ان مجموعات میں شامل ہیں ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے اور کوئی خط ایسا نہیں جن میں چند اصطلاحات، مشکل الفاظ، تاریخی مقامات اور متعدد شخصیات کا ذکر نہ ہو۔

سرسید کے خطوط سے ان کے مذہبی افکار، تعلیمی افکار، ادبی افکار، سیاسی و سماجی افکار اور حکومتِ وقت کے متعلق ان کے نظریات اور واضح نظر آتے ہیں اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں اور سرسید کے اخلاق و عادات، نظریات و عقائد، اپنے دوستوں سے بے تکلفی، محبت و عقیدت، مشاغل اور طرز زندگی کی تصویر سامنے آتی ہے۔ سید عبداللہ سرسید کے خطوط کا اس طرح تذکرہ کرتے ہیں:

''سرسید کے خطوط میں حقیقت، جامعیت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ سرسید خطوط کو پیغام کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کے خطوط میں کارآمد باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے پیش نظر صرف مقصد و مدعا ہوا کرتا تھا۔ بے کار گفتگو سے اجتناب کرتے تھے۔''

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''سرسید جس طرح نثر میں مدعا اور مقصد کے داعی ہیں اس طرح خط نگاری میں بھی مقصد ہی کے علمبردار ہیں۔''

(میرا من ست عبدالحق تک، ص ۱۹۵)

مجموعی اعتبار سے سرسید کی خدمات مسلمانوں کے لیے بڑی اہم اور انقلاب آفریں ہیں سرسید نے مذہبی اعتبار سے تقلید، تعصب اور تنگ نظری کو ختم

کیا۔سرسید کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے سب سے پہلے قوم کا لفظ استعمال کیا اور انھیں قومیت کے تصور سے آگاہ کیا۔

سرسید اور ان کے رفقا، سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ تحریک، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کا اردو زبان اور ادب پر بڑا احسان ہے۔

سرسید کی بصیرت سے واقف ہونے کے لیے مکتوبات سرسید کا مطالعہ ضروری ہے۔

سرسید کی ہمہ جہت شخصیت کا احاطہ چند جملوں میں ناممکن ہے۔

میں ایک چراغ بجھنے آیا تو کئی چراغ خود بخود فروزاں ہو گئے

سرسید کی تحریک کا اہم مقصد یہ تھا کہ ملت کے ہر فرد کے سر پر کلمہ طیبہ کا تاج ہو، سیدھے ہاتھ میں فلسفہ ہو اور بائیں ہاتھ میں سائنسی علوم ہو۔

☆☆☆

سرسید احمد خاں کے تعلیمی افکار وخیالات

سرسید احمد خاں کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ایک ایسی شخصیت اور روایت کا نام ہے جس نے قومی اور ملی زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہبری اور رہنمائی کی اور اس کی اصلاح وترقی کا سامان کیا۔ ہماری زندگی کا ہر گوشہ اس مرد درویش کے احسان سے گراں بار ہے، ایسے حالات میں جب کہ انگریزوں کے ظلم وجور کا بازار گرم تھا اور مسلمان بن کے جینا دشوار تھا۔ سرسید نے اپنی بھرپور صلاحیتوں کا استعمال کر کے قوم میں حوصلہ مندی اور ترقی کے جذبات پیدا کئے۔ ان کی شخصیت عظمت وبلندی سے عبارت ہے۔ قدرت نے انھیں متعدد اوصاف سے نوازا تھا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی قومی ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہونا ہے۔ انھوں نے ہر شعبہ میں جدت واختراع سے کام لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان، مسلمان بن کر رہیں مگر جدید ایجادات واختراعات سے بھی ہمکنار ہوں۔ سرسید کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں تھیں لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ مسلمانوں کی علمی وتعلیمی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنے علمی کام کو جاری رکھا۔ سرسید کے اندر قومی ملی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی چنانچہ وہ پوری عمر ملک وقوم کی بھلائی اور اصلاح وترقی کے لئے کوشاں رہے وہ جدت پسند تھے، اس سے انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا یا جس کام کو شروع کیا اس میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اس قدر ترقی حاصل کریں کہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکیں۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے کتابیں لکھیں، مضامین لکھے اور خاص اسی مقصد کے حصول کے لئے مدرسۃ العلوم اور سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، غرض سرسید اپنے عہد کے سب سے بڑے مصلح اور اعلیٰ دماغ انسان تھے۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ہندستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے کی خامیوں اور خوبیوں کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ ان کی ضرورتوں پر غور کیا اور مصلحانہ کوششوں سے ان کی زندگی بہتر بنانے کی کوشش کی۔ ان کی یہ رہنمایانہ کوششیں کسی ایک میدان تک محدود نہ رہیں بلکہ انھوں نے مذہب، ادب، سیاست، تعلیم، معاشرت۔ ہندوستانی مسلمانوں کے جملہ مسائل پر توجہ کی۔ اگر انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو کسی ایک شعبے پر مرکوز کر دیا ہوتا تو شاید اس میں سب سے بڑا ماہر ہونے کا اعزاز پایا ہوتا۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں کو یقیناً ان کی ذات سے وہ فائدہ نہ پہنچا ہوتا جو موجودہ صورت میں پہنچا۔ اگر سرسید قرآن وحدیث کی طرف توجہ کرتے تو بلند پایہ عالمان دین میں ان کا شمار ہوتا، رشد وہدایت دینے خانقاہ میں بیٹھ جاتے تو ایک عالم ان سے فیض پاتا۔ اگر سیاسی رہنمائی پر اکتفا کرتے تو اس میدان میں قوم کے کاروان سالار رہوتے۔ اگر صرف مسائل تعلیم پر غور کرتے تو دنیا کے مشہور ماہرین تعلیم کی صف میں جگہ پاتے۔ اگر شاعری کرتے تو غالبؔ واقبالؔ کے ہم پلہ ہوتے مگر وہ تخصیص کا راستہ اختیار نہ کر سکتے تھے کیونکہ وہ پیدا ہوئے تھے ہندوستانی مسلمانوں کو پستی وزبوں حالی سے نکالنے کے لئے اور ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ایسے ماہر طبیب کی ضرورت تھی جس کے پاس ہر مرض کا علاج ہو اور ہر درد کا مداوا ہو۔ چنانچہ سرسید نے اپنے دائرہ کار کو محدود نہیں کیا۔ انھوں نے بے عملوں کو جہد وعمل کا درس دیا، تہا نشینوں کو خلوت سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا، ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا، تنگ نظروں کو وسعت نظر سکھلائی محض اجداد کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنے آپ میں اوصاف پیدا کرنے کے لئے آمادہ کیا، مشرق کے پجاریوں کو مغرب سے روشناس کیا، تقلید پرستوں کو اجتہاد کی اہمیت سے آگاہ کیا اور غور وفکر تجزیہ اور استدلال کی ضرورت سے باخبر کیا، دنیا کو بے حقیقت سمجھنے والوں کو دنیا میں نیکی کمانے اور آخرت کے لئے توشہ جما کرنے کا راستہ دکھایا، انھوں نے سوتوں کو جگایا، مردوں میں جان ڈالی، غرض یہ کہ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو زندہ قوموں کی طرح زندگی گزارنے اور سربلند ہو کر جینے کا سلیقہ سکھایا۔

اردو ادب پر سرسید کا بہت بڑا احسان ہے۔ انھوں نے اردو نثر میں مدعا نگاری کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے اپنی بات کو دلیلوں کے ساتھ واضح الفاظ میں کہنا سکھایا۔ اردو کو لفاظی اور بے آرائی سے نجات دلائی۔ انھوں نے خود بہت کچھ لکھا اور اس سے بھی بڑا کام یہ کیا کہ لکھنے والوں کی ایک پوری جماعت تیار کر دی۔ یہ بات درست کہی گئی ہے کہ کچھ لوگوں نے تو براہ راست ان کے دامن تربیت میں پرورش پائی اور کچھ نے دور سے فیض اٹھایا۔ آج جو زبان ہم لکھتے اور بولتے ہیں اس کی داغ بیل سرسید ہی نے ڈالی تھی۔ نثر کی طرف تو انھوں نے خود توجہ کی لیکن وہ شاعر نہ تھے۔ انھوں نے شعر کہے ضرور لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ ان کا میدان نہیں اس لئے اس کو چے جلد نکل آئے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ کاش کوئی شاعر ایسا ہوتا جو مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے نظم

ڈاکٹر داؤد احمد

لکھتا۔آخر کار حالی نے مسدس (مدوجزر اسلام) لکھی جسے سرسید اپنی بخشش کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا تعلیمی و اصلاحی مشن تھا، جسے وہ ہر قیمت پر پورا کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے انھوں نے اپنے تمام اثاثہ و سرمایہ اور اپنی زندگی قربان کر دی۔سرسید کا مطالعہ بہت وسیع تھا انھوں نے فلسفہ تعلیم کا خاص طور سے بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا،ان کی ایک تحریر سے ان کے تصور تعلیم کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''کوئی قوم عزت نہیں پا سکتی جب تک تعلیم ایک مقدار مناسب سے اس قوم میں رائج نہ ہو،اور اس مقدار مناسب کا اندازہ حسب تفصیل ذیل ہو سکتا ہے،یعنی ضرورت ہے کہ اس قوم میں ایک معتد بہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایسا پیدا ہو جس میں سے کوئی کسی علم میں دستگاہ کامل رکھتا ہو،اور اسی طرح تمام علوم کے کامل لوگ اس قوم میں موجود ہوں جن کی عقل و فہم اور سعی و کوشش سے علم دین میں روز بروز ترقی ہو اور جن کے نام سے ہماری قوم کو عزت و فخر ہو۔''

سرسید کا تصور تعلیم بہت صاف ستھرا ہے۔تعلیم کے ذریعہ وہ مسلمانوں کی ہر طرح کی ترقی کے خواہاں تھے۔ ان کے نزدیک قومی ہمدردی اور تعلیم لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کے بغیر اپنے مفہوم میں مکمل نہیں ہوتے،سرسید دینی علوم کے فروغ کے بھی خواہش مند تھے مگر انھوں نے اپنا سارا زور جدید تعلیم پر صرف کیا ان کا خیال تھا کہ اس میں مہارت حاصل کرنا وقت اور حالات کا تقاضہ ہے،حالانکہ مسلمان اس وقت انگریزوں سے سخت بیزار تھے وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی تگ و دو کا حصہ ہے اور یہی خیال تھا جس کی بنا پر سرسید کو سخت پریشانی اٹھانی پڑیں اور اپنے بھائیوں نے ملحد،کافر،اور نیچری کہہ کر پکارا مگر اس مرد درویش کے پائے استقامت میں ذرہ برابر بھی لغزش نہیں آئی۔

آبروئے قوم و ملت سرسید احمد خاں کی حالات زندگی سے بنیادی طور پر دو چیزیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔اول نظم و ضبط،دوم تعلیم و تعلم۔کیوں کہ ان کی فکری بنیادوں میں تنظیم یعنی مناسب اوقات میں مناسب اقدامات کرنے کا خمیر شامل تھا،یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کو ترجیح دی تو کبھی رسائل و کتب کی طرف مائل ہوئے۔کبھی علمی بنیادوں پر اپنی تحریری عمارت کھڑی کی تو کبھی انتہائی عام فہم مسئلہ کو پیش کیا۔گویا سرسید کے اندر جو سلیقگی اور تنظیمی مہارت تھی وہی انھیں مناسب حالات و مواقع پر موزوں ترین کاموں پر اکساتی تھی۔تاریخی حوالوں کے تناظر میں اگر سرسید احمد خاں کی زندگی میں جھانکتے تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی ایک شہر میں مستقل نہیں رہے،مگر اس کے باوجود انھوں نے اپنے مشن سے انحراف نہیں کیا ہے اور حسب حال اپنے مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔سرسید کا یہی خمیر اور یہی جذبہ نہ صرف اس عہد میں قابل التفات تھا، بلکہ ہر دور میں یہ نسخہ کام آئے گا۔آج بھی جس فرد کے اندر بد سلیقگی آجائے تو بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔سرسید کے اندر ایک بہترین منتظم کی خصوصیت نہیں ہوتی تو وہ شاید قابل تقلید فریضہ انجام نہیں دیتے۔انھوں نے اپنے تعلیمی مشن کو کامیاب بنانے میں اسی نسخہ کو بروئے کار لایا جو حسب حال تھا،جو تعلیمی فضا کے لئے سازگار تھا۔

سرسید مصلح بھی تھے اور مفکر بھی۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مفکرین اپنی قائم کردہ بنیادوں کے سہارے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔انھیں حالات سے بہت زیادہ باخبری نہیں ہوتی ہے۔اپنی سوچ کی دنیا وہ ایسی بسا لیتے ہیں جس میں بہت سے افراد کی گنجائش نہیں نکلتی،مگر مصلح کا رویہ تھوڑا برعکس ہوتا ہے۔وہ حالات سے سمجھوتے بھی کرتا ہے،کچھ نیا بھی پیش کرتا ہے،کچھ پرانے معاملات کو ہی جوڑ توڑ کر آگے بڑھتا ہے۔سرسید احمد خاں کی زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ نرے مصلح تھے اور نہ نرے مفکر،بلکہ فکر و اصلاح کے درمیان سے وہ اپنی الگ راہ نکالتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کارواں میں لوگ شامل ہوتے گئے۔مصلح فقط اصلاحی نقطۂ نظر سے قدم بڑھاتا ہے اور اس کے ذہن میں مکمل تبدیلی کے خاکہ کے علاوہ اصلاح اور درستگی یا 'مرمت' کا فلسفہ بھی ہوتا ہے،مگر فکر اصلاح احوال کے لئے ترمیم و اضافہ کے ساتھ بہت سی بنیاد کو ختم کر کے نئی بنیاد ڈالتا ہے۔سرسید مصلح و مفکر دونوں تھے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تعلیمی تصورات میں بھی اپنا نقطۂ نظر بھی بہتر طریقے سے شامل کیا۔حالات کو بھانپتے ہوئے وہ تمام تر کام کئے جو حسب حال تھے۔گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید نے تعلیم کے تناظر میں نہ صرف اصلاح کا کام کیا بلکہ فکری سطح پر تبدیلی لانے کی بھی بھرپور کوشش کی۔وہ مصلح تعلیم کے ساتھ مفکر تعلیم بھی تھے۔

سرسید کی شخصیت جتنی دلکش تھی اتنی ہی ہمہ گیر بھی۔وہ اردو ادب کی تاریخ میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے مختلف موضوعات پر بے لاگ قلم اٹھایا ہے۔خواہ وہ اخلاقیات و سیاسیات،فلسفہ و مذہب ہو یا انشاء ادب،تحقیق و تنقید یا تاریخ و عمرانیات اور سائنس ہو۔غرض کہ جس شعبہ میں دیکھئے سرسید کی

شخصیت منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہوئی نظر آتی ہے۔انھیں انشا پردازی میں وہ کمال حاصل ہے جو کسی دوسرے انشا پرداز کے یہاں مشکل سے دیکھنے کو نصیب ہوگا۔وہ مشکل سے مشکل مسائل اس وضاحت وسادگی اور پرکاری سے بیان کرتے ہیں کہ قاری الجھنے کے بجائے چٹخارے لیتا ہوا پڑھتا چلا جاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے جس میں سرسید کی عالمانہ اور خطیبانہ شان بھی جھلکتی ہے۔یہی سرسید کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال ہے۔کیوں کہ وہ علم وکمال کے ساتھ حسن تقریر اور شگفتہ تحریر میں براق تھے۔مگر اپنے اپنے موقع پر یہ عالم ہوتا ہے کہ قلم سے موتی رولتے اور منھ سے پھول جھڑتے تھے۔اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اردو ادب کے دامن کو نئے اور خوش رنگ پھولوں سے بھر دیا۔جس کا اظہار وہ ''تہذیب الاخلاق'' میں اس طرح کرتے ہیں :

''جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردو زبان کی علم وادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے جو کوشش کی مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا اور اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔''

(انتخابات نثر : سید ظہیر الدین علوی، صفحہ۔۱۷۲،۱۷۳)

سرسید نہ صرف ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے لئے ادبی وعلمی خدمات انجام دئے بلکہ ان کے وسیع دامن میں جو آ گیا اس کی شخصیت سر سید کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔وہ بھی ملک وقوم کی خدمت کو اپنا اولین فرض سمجھنے لگا۔یہی وجہ ہے کہ سرسید کی بصیرت مندانہ قیادت میں ان کے ہر دلعزیز رفقاء نے جنم لیا جن میں بطور خاص مولوی ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، وقار الملک، محسن الملک، شبلی، حالی، اور ڈپٹی نذیر احمد کے نام قابل ذکر ہیں۔اگر انھیں سرسید جیسے عظیم المرتبت شخص نہ ملتے تو اردو ادب جس سرسبز وشاداب فضا میں سانس لے رہی ہے اور ہمیں لطف اندوز ہونے کے جو مواقع فراہم ہیں شاید میسر نہ ہوتے۔سرسید اور ان کے ادبی رفقاء دراصل ''تہذیب الاخلاق'' سے وابستہ تھے۔جن میں مذہبی افکار وخیالات علمی اصطلاحات اور فلسفیانہ انداز بیان سے مضامین بھرے پڑے ہیں۔سرسید کی عظمت اور ان کی ذہنی وفکری تحریک کو بام عروج تک پہنچانے میں ایسے رفقاء کی ذات شامل تھی جو اپنی ذات میں خود ایک انجمن اور اپنے وقت کے ایک عہد تھے۔سرسید احمد خاں بڑے وسیع النظر قومی لیڈر تھے جن کی نظر انتخاب اچھے ادیب، ادب پارے، شاعر، مبلغ اور معلم پر رہتی تھی اور انھیں جو اچھا معلوم ہوتا اسے اپنے حلقۂ اثر میں لانے کی کوشش کرتے تھے۔

سرسید نے جدید تعلیم کو اپنا نصب العین بنایا، پوری طاقت وتوانائی جدید وانگریزی تعلیم کی طرف لگادی، چونکہ خون میں ایمانی تڑپ اور بزرگوں واجداد کی ایمانی رمق بھی تھی، اس لئے دونوں کو ساتھ لیکر چلے اور قوم سے کہا کہ داہنے ہاتھ میں قرآن اور بائیں ہاتھ میں جدید تعلیم ہو، لیکن قوم نے انھیں یہاں بھی سکون سے نہیں رہنے دیا، ان کے خلاف کفر کے فتوے لائے گئے، انھیں کافر، ملحد وزندیق کہا گیا لیکن سرسید ان سب سے بے پروا ہو کر آگے بڑھتے گئے۔سرسید کے تعلیمی مشن کے بارے میں نور الحسن نقوی نے لکھا ہے:

''ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کا ہر شعبہ سرسید کا رہین منت ہے، لیکن ان کے نظام فکر میں جس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ مسئلہ تعلیم ہے، اگر سرسید سیاسی معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی نہ کرتے تو مسلمان بدستور انگریزوں سے، انگریزی زبان سے اور مغربی علوم سے متنفر رہتے اور آئندہ ہر قسم کی ترقی سے محروم ہو جاتے، لغو رسم ورواج میں تمیز کرنا نہ سکھاتے تو مسلمان جہالت کی تاریکی سے نکل نہ پاتے اور جدید تعلیم کو بدستور گناہ ہی خیال کرتے۔''

یہ صحیح ہے کہ اس وقت کے حالات بد سے بدتر تھے، ہر نفر اپنی فکر میں تھا، اجتماعی فکر کسی کو نہ تھی کہ قوم کا کیا ہوگا، یہ فکر اگر کہیں ملتی ہے تو سرسید کی تحریروں اور تقریروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اپنے تعلیمی مشن کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے سفر کرنا شروع کیا جس کا مقصد زیادہ تر مدرستہ العلوم کے لئے چندہ اکٹھا کرنا اور لوگوں کو تعلیم وتعلم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنا ہوتا۔مدرستہ العلوم کا آغاز وارتقاء اس کے سنگ بنیاد سے شروع ہو گیا تھا، باقاعدہ تعلیمی سلسلہ ۱۸۷۵ء سے شروع ہوا۔لوگوں نے ان پر الزام لگایا کہ انگریزی تعلیم کی طرفداری کر کے دینی تعلیم کو نقصان پہنچایا، لیکن اگر صدق دل

سے اس امر پر غور کیا جائے تو بالکل واضح ہے کہ انھوں نے دینی تعلیم اور بقا کے لئے جو کوششیں کیں، اس وقت کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتیں۔ سرسید نے سفر پنجاب کے دوران لدھیانہ میں ایک تقریر کے دوران قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

''یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے اس کو قائم رکھنے ہی سے ہماری قوم، قوم ہے، اے عزیز بچے اگر کوئی آسمان کا تارہ ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا؟ وہ ہماری قوم ہی نہ رہی۔ پس اسلام کو قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔''

تعلیم کا اور خصوصاً قومی تعلیم کا معاملہ جیسا نازک ہے ویسا ہی مشکل بھی ہے، ہماری قوم نے نہ کبھی اس پر غور کیا ہے اور نہ ان ملکوں کو جہاں قومی تعلیم کو ترقی ہے، دیکھا ہے اور اگر دیکھا جائے تو اس کی ترقی کے اسباب پر بہت کم غور کیا ہے۔

سرسید نے تعلیم کی جو شمع جلائی اس سے پورا ہندوستان فیضیاب ہوا، ان میں کیا ہندو کیا مسلمان وہ سبھی کی شمولیت کے خواہاں تھے۔ یہی سبب ہے کہ پنجاب میں سفر کے دوران ہندوؤں نے بھی ان کو ایڈریس دیا اور اس بات کی تعریف کی کہ سرسید نے بلاتفریق مذہب وملت سب کے لئے تعلیمی ترقی کے لئے جمع کیا۔ ایک ایڈریس میں جوگندر سنگھ بوس، وکیل عدالت ہائی کورٹ کلکتہ، رام نرائن وکیل ہائی کورٹ اضلاع شمالی ومغربی آنریری سکریٹری، دیال سنگھ پریسیڈنٹ، گوپال داس سپرنٹنڈنٹ عدالت چیف کورٹ نے دستخط کر کے تحریری ایڈریس پیش کیا:

''آپ کے خیالات کی وسعت اور آپ کا فیاضانہ برتاؤ جو آپ نے اپنے خاص مذہبوں کے علاوہ اور فرقوں کے ساتھ کیا ہے، آپ کے عام طریقۂ کارروائی کی کچھ کم مشہور ومعروف صفت نہیں ہے۔ آپ کا برتاؤ ابتدا سے انتہا تک تعصب یا خودرائی کے دھبے سے بالکل مبرا ہے، جو عمدہ تعلیمی انسٹی ٹیوشن آپ نے علی گڑھ میں قائم کیا ہے اس کے فائدوں سے ہندو مسلمان دونوں برابر مستفیض ہو سکتے ہیں۔'' اس ایڈریس کے جواب میں سرسید نے فرمایا: ''مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قائم کرنے کا یہ ہوا تھا۔ جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں اور آپ بھی واقف ہیں کہ مسلمان روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے ہیں، ان کے مذہبی تعصّبات نے ان کو تعلیمی فائدہ اٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہیا کی گئی تھیں۔'' (بحوالہ: لیکچر بمقام: مدرسہ گرداس پور ۲۷ر جنوری ۱۸۸۴ء)

علمی ادارے یا درسگاہیں نہ صرف تعلیم وتعلم کا مرکز ہوتے ہیں بلکہ تہذیب وثقافت کا گہوارہ بھی ہوتے ہیں۔ یہاں تہذیبیں پنپتی ہیں اور نظریات زندگی کی تولید ہوتی ہے جس پر عام لوگ چل کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ عمومی مشاہدہ یہ ہے کہ کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ ودیگر نوجوانوں کے لئے قابل تقلید تصور کئے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ نوجوانان درسگاہ کے عمل وطور طریقے اور لباس وآرائش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے اثرات بھی دیر پا ہوتے ہیں۔ تہذیب وثقافت کے معاملے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک الگ مقام وپہچان ہے، یہاں کے طلبہ معاشرے میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تہذیب اور طرز زندگی عام لوگوں کے لئے پرکشش ہوتی ہے۔

آج ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کے بڑے سے بڑے دانشور اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر سرسید اس وقت ملک میں تعلیمی و سماجی تحریک کا آغاز نہیں کرتے تو آج ہندوستان تعلیمی شعبے میں سو سال اور پیچھے ہوتا۔ مگر افسوس صد افسوس کہ سرسید نے مسلمانوں کو تعلیم کے جن نکات سے آگاہ کیا تھا ہم اس پر عمل نہیں کر سکے اور نہ سرسید کے مشن کو آگے بڑھا سکے۔ ورنہ آج ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی، معاشی، اقتصادی اور تعلیمی تصویر اتنی بھیانک نہیں ہوتی جتنی کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ میں پیش کی گئی ہے۔ اس لئے تقاضائے وقت یہ ہے کہ ہمارے رہنمائے قوم اور دانشوران ملت صرف اپنے فکر وخیال کی دنیا ہی آباد نہ کریں بلکہ صدق دل سے فلاح قوم کے لئے عملی قدم بھی اٹھائیں۔

☆☆☆

سرسید احمد خان کا تصور تربیت اطفال

دنیا کی تاریخ میں بے شمار ایسے لوگ نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت، بے پناہ صلاحیت، خداداد قابلیت، مسلسل محنت اور ناقابل فراموش کارناموں کے سبب اس کائنات میں ایسی آفاقی مقبولیت اور دوامی شہرت حاصل کر لی ہے کہ قیامت تک ان عظیم شخصیات کے عظیم کارناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا سرسید احمد خان ہمارے ملک ہندوستان کی انھیں عبقری اور نابغہ روزگار شخصیات میں سے ایک ہیں جن کے ناقابل فراموش تعلیمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور علمی کارناموں نے ہر ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، سیاہ و سفید اور خرد و بزرگ کو یکساں فیض پہنچایا ہے اور حافظ شیرازی کے مشہور شعر کا یہ مصرعہ اس عظیم شخصیت پر بالکل صادق آتا ہے ''ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما'' اس یگانہ عصر اور نابغہ روزگار شخصیت کی انفرادیت اور معنویت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مختلف النوع زندہ جاوید کارناموں سے صرف اپنے عہد کو ہی متاثر نہیں کیا تھا بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی ایسے پختہ، گہرے اور ہمہ گیر نقوش یادگار چھوڑے ہیں جن پر چل کر ہماری آنے والی نسلیں تا دیر کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتی رہیں گی اس عہد ساز شخصیت کی عظمت اور ناقابل فراموش کارناموں کا اعتراف ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے اور ہمیشہ کیا جاتا رہے گا ان کے آفاقی کارناموں کے سبب گزرتا ہوا وقت لوگوں کے درمیان ان کی عظمت و عقیدت اور قدر و منزلت کو مزید افزوں کرتا چلا جا رہا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بالکل صحیح کہا ہے:

> ''جس قدر زیادہ زمانہ گزرتا جائے گا اسی قدر سرسید کے کاموں کی زیادہ قدر اور ان کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائے گی۔۔۔۔اور صدیوں تک اس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا''[1]

سرسید احمد خان کی شخصیت میں کاتب ازل نے مختلف جہات کو مجتمع کر دیا تھا وہ بیک وقت مصلح قوم بھی تھے اور مدبر بھی، رہبر ملت بھی تھے اور مفکر بھی، ماہر تعلیم بھی تھے اور قلم کار بھی، محافظ تہذیب بھی تھے اور جدت پسند بھی، مذہب کے داعی بھی تھے اور مبلغ بھی، جدید تعلیم کے حامی بھی تھے اور قدیم روایتوں کے علم بردار بھی اور بہترین نثر نگار بھی تھے اور شاعر بھی، اس یگانہ عصر اور ہمہ جہت شخصیت کی پیدائش ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ میں دہلی کے ایک سید گھرانے میں ہوئی تھی ان کے والد بزرگوار سید محمد متقی، محمد شاہ اکبر ثانی کے ندیمان خاص میں سے تھے اور دادا سید ہادی عالمگیر کے دربار میں ایک اچھے منصب پر فایض رہے تھے ان کی والدہ محترمہ عزیز النسا نہایت پرہیزگار، متقی اور مہذب خاتون تھیں سرسید احمد خان پر اپنی والدہ محترمہ کی تعلیمات اور تربیت کا بہت گہرا اور ہمہ گیر اثر پڑا تھا سرسید نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین سے بھی تعلیم حاصل کی تھی اور اس کے علاوہ انھوں نے اپنے خالو مولوی خلیل اللہ، کی صحبت میں رہ کر عدالتی نشیب و فراز کے متعلق آگاہی بھی حاصل کی تھی اور ان دونوں بزرگوں کے علاوہ بھی دیگر اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا لیکن سرسید کے تمام اساتذہ کے علاوہ ان کی شخصیت کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں ان کی والدہ کا سب سے اہم اور بنیادی کردار رہا، سرسید کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی والدہ محترمہ ان کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں بہت سخت، اصول پسند اور بارعب قسم کی خاتون تھیں سرسید احمد خان نے اپنی ابتدائی تعلیم جو اس زمانے کے دستور کے مطابق عربی اور فارسی میں ہوئی تھی، اپنی والدہ محترمہ ہی سے حاصل کی تھی سرسید نے بارہا اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ایام گودکی میں ان کی والدہ کی طرف سے کی گئی معیاری اور بہترین تعلیم و تربیت کا ہی نتیجہ ہے کہ انھیں کم عمر ہی سے درست و نادرست، صحیح و غلط اور نیک و بد کے مابین فرق کرنے کی تمیز پیدا ہوگئی تھی اور ان میں زندگی گزارنے کا بہترین شعور بھی بیدار ہو گیا تھا انھوں نے بارہا اس بات کا بھی اقرار کیا ہے کہ والدہ محترمہ کے پند و نصایح اور رہبری و نگہداشت کے سبب ان میں زندگی کو درست طریقے سے جینے کا سلیقہ اور قرینہ پیدا ہوا، سرسید کی والدہ محترمہ کی تعلیم و تربیت کو لے کر سخت گیری اور اصول پسندی کا اندازہ محض اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید جب گیارہ سال کے کمسن بچے تھے تو انھوں نے غصے میں آ کر ایک دن اپنے ایک بوڑھے نوکر کو تھپڑ مار دیا جس کی وجہ سے ان کی والدہ محترمہ سرسید سے اس قدر دل برداشتہ اور ناراض ہوگئیں کہ انھوں نے سرسید کو فوراً گھر سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیا اور اس کے بعد کئی دنوں تک ان سے خفا رہیں اس کے بعد اس بوڑھے نوکر سے معافی مانگنے اور سرسید کی خالہ جان کی پرزور سفارش کے بعد ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو گھر واپس آنے کی اجازت مل سکی سرسید کی زندگی کے اس واقعہ سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید کی والدہ اخلاق سازی، کردار کی پختگی اور مذہبی

---

[1] ڈاکٹر نیلوفر حفیظ، اسسٹنٹ پروفیسر فارسی، شعبہ عربی و فارسی، الہٰ آباد یونیورسٹی، پریاگراج

تربیت کے معاملے میں بہت سخت اور بااصول تھیں اور شاید یہ سرسید کی والدہ محترمہ کی ان کے بچپن میں کی گئی اخلاقی تربیت ہی تھی جس نے سرسید احمد خان کی شخصیت کو باصلاحیت اور ہمہ گیر بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا لہٰذا کہتے ہیں:

''طفلی ودامان مادر خوش بہشتی بودہ
چون بہ پای خود روان گشتیم سرگردان شدیم '' ۲

ہر بچہ کی طرح سرسید احمد خان کی بھی پہلی تربیت گاہ یا تعلیم گاہ ماں کی گود تھی جس کے نقوش ساری عمران کی شخصیت پر حاوی رہے یہ ہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنے تعلیمی نظریات میں ماں کی طرف سے بچے کو دی گئی تعلیم وتربیت کو سب سے اہم اور ضروری خیال کیا ہے اس عظیم مفکر اور حساس دانشور کے نزدیک بچے کی پہلی درسگاہ اس کی ماں کی گود ہوتی ہے جہاں سے انسان اپنی زندگی کا پہلا سبق سیکھتا ہے لہٰذا ماں کا ہر اعتبار سے اعلیٰ صفات اور تعلیم یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے وہ ایک بچے کی تعلیم وتربیت میں ماں کو نمایاں بلکہ سب سے بلند اور عالی مقام دیتے ہیں ان کے مطابق اگر ماں کی طرف سے بچوں کی تعلیم وتربیت کا خصوصی دھیان نہ رکھا جائے تو بچہ کی شخصیت میں توازن اور اعتدال پیدا نہیں ہوسکتا صرف ایک ہوشمند ماں ہی ہے جو ہر حال میں اپنے بچے کی درست تعلیم وتربیت کی فکر کرتی ہے سرسید احمد خان ایک ماں کو سینکڑوں اساتذہ اور ہزاروں کتابوں سے بھی زیادہ اہم اور ضروری تصور کرتے ہیں اگر ایک ماں پڑھی لکھی، زمانہ شناس اور سمجھدار ہے تو وہ اپنے بچے کو درست راستے پر چلا کر اس کو ملک اور قوم کی ترقی کا ضامن بنا سکتی ہے انھوں نے اپنی مشہور ومعروف کتاب ''سیرت فریدیہ'' میں ماں کو ہزار استادوں پر ترجیح وفوقیت دیتے ہوئے لکھا ہے:

''بلاشبہ ایک نیک صفت ماں ہزاروں استاد سے بہتر ہوتی ہے'' ۳

سرسید کے جس عظیم کارنامے نے ہمیں اپنی گردنوں کو عقیدت سے خم کرنے پر مجبور کر دیا وہ ان کی تعلیمی خدمات ہیں انھوں نے اس میدان میں جو کارہائے گران قدر انجام دیئے ہیں اس کی مثال اس دنیا میں کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی ہے تفصیلات سے قطع نظر یہاں صرف بچوں کی تعلیم وتربیت سے متعلق سرسید کے افکار ونظریات پر گفتگو کرنے کی کوشش کروں گی انیسویں صدی کے پرآشوب عہد میں اس عظیم اور یگانہ عصر شخصیت نے بچوں کی تعلیم وتربیت کے متعلق جو خیالات پیش کیے ہیں وہ عصر حاضر میں بھی کچھ کم اہمیت وافادیت کے حامل قرار نہیں دیئے جاسکتے غالباً زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر سرسید کی دوررس نگاہ نہ پہنچی ہو یا جس پر انھوں نے اظہار خیال نہ کیا ہو ظاہر ہے کہ پھر ان کا حساس اور دردمند دل اپنے چمن کے نونہالوں کی تعلیم وتربیت سے کیونکر غافل رہ سکتا تھا انھوں نے بچوں کی تعلیم وتربیت کے متعلق جو بیش قیمت نکات پیش کیے ہیں ان میں آج بھی شگفتگی اور تازگی اسی طرح برقرار ہے جیسی کہ ان کے اپنے زمانے میں تھی، اور جن پر عمل درآمد کر کے ہم اپنے تعلیمی نظام کو نہ صرف بہتر بنا سکتے ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کو ہر اعتبار سے مضبوط ومستحکم بھی بنا سکتے ہیں ایک آئیڈئل ملک اور ایک صحت مند معاشرہ کا قیام عمل میں لا سکتے ہیں کیونکہ بچے صرف کسی ایک خاندان، ملک اور قوم کا ہی سرمایہ نہیں ہوتے بلکہ یہ رنگا رنگ اور تروتازہ پھول تو پوری دنیا کا مستقبل ہوتے ہیں اس پورے عالم کی بقا صرف اور صرف اطفال کے ہی مستقبل پر مشتمل ہوتی ہے کسی بھی معاشرے کو مضبوط ومستحکم بنانے کا خواب انھیں معصوم اور نازک پھولوں کی مدد سے پورا کیا جاسکتا ہے جس طرح کی تعلیم وتربیت ان بچوں کو دی جاتی ہے معاشرے اور ممالک اسی کے مطابق تشکیل پاتے ہیں لہٰذا سرسید کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ چھوٹے بچوں کی تعلیم وتربیت کا معقول ومناسب انتظام کیے جانا بے حد ضروری ہے ان کے مطابق ایک بچے کی درست تربیت اور بہترین تعلیم کا زمانہ سات سے پندرہ برس تک کا ہوتا ہے اگر اس عمر میں انسان کی درست طریقے سے تعلیم وتربیت سکھانے کے مواقع فراہم کیے جائیں تو وہ ایک کامیاب اور کامران انسان بن سکتا ہے اور ملک وسماج پر بوجھ بننے کے بجائے ایک خوش حال اور باوقار زندگی گزار سکتا ہے اور اگر اس عمر میں ان معصوموں کی صحیح طریقے سے تعلیم وتربیت پر نظر نہ کی جائے تو پھر آنے والی زندگی میں سوائے پچھتانے اور کف افسوس ملنے کے کچھ اور حاصل نہیں ہوسکتا ہے لہٰذا وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''لڑکپن کے زمانہ میں جو عمر سات برس سے پندرہ برس تک ہے وہی ایسا زمانہ زندگی کا ہے جس میں آئندہ کی بہبودی کے لیے زیادہ تر کوشش ہوسکتی ہے اس زمانے میں حافظہ بہت تیز ہوتا ہے، قوت غور مضبوط ہوتی ہے، اچھی عادتوں کا دیکھنا اور عمدہ نظیروں سے

تربیت پانا، جس کو عموماً نیک صحبت کہتے ہیں، نہایت ہی موثر ہوتا ہے یہ زمانہ لڑکوں کے لیے ذہنی عقلی اور اخلاقی تخم ریزی کا ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت کی تعلیم نہایت جلد قبول کرتا ہے اور اس تخم کو جس میں آئندہ نہایت عمدہ عمدہ پھل پھول پیدا ہوں گے، بہت جلد اگ آتا ہے لیکن اگر اس زمانے میں تربیت نہیں ہوتی تو پھر بہت ہی کم فایدہ ہوتا ہے''۔ ۴

سرسید احمد خان کو اس بات کا بھی سنجیدگی کے ساتھ احساس تھا کہ بچے کسی بھی ملک اور قوم کا بیش قیمت سرمایہ ہوتے ہیں لہٰذا ان کی جسمانی نشو ونما کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت اور روحانی ضرورت کا خیال رکھے جانا بھی بہت ضروری ہے ان کی عمر، نفسیات، لیاقت اور ضروریات کے مطابق ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیے جانا بھی ان کی ہمہ گیر ترقی کے لیے بہت اہم ہے یہ ہی سبب ہے کہ انھوں نے اطفال کی درست تعلیم وتربیت پر نہ صرف غور وفکر کیا ہے بلکہ ان کے اخلاق وکردار سازی کے متعلق بھی قیمتی نکات پیش کیے ہیں اور اپنے دور کے نظام تعلیم کو اس کے روایتی اور قدیم طور طریقوں سے باہر نکال کر جدت وندرت اور نئی فکر وآہنگ سے بھی ہمکنار کرنے کی اپنی پوری کوشش کی ہے حالانکہ اس سلسلے میں ان کو اپنے احساسات وخیالات، نظریات ومشاہدات اور مشورے وتجاویز وغیرہ کو بہت زیادہ مرتب ومنظّم انداز میں پیش کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور انھوں نے بہت غور وفکر اور تفکر ومتامل کے ساتھ اس پر اظہار خیال نہیں کیا ہے بایں ہمہ بچوں کی تعلیم وتربیت کے متعلق سرسری انداز میں کہی گئیں ان کی باتیں بھی کچھ کم وقیع اور قابل غور نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی اہمیت وافادیت کو پوری طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے سرسید کا تصور ادب اطفال از اول تا آخر گونا گون صفات اور فکر کن نکات کا حامل ہے ڈاکٹر سید اسرار الحق نے اپنے ایک مضمون ''سرسید اور بچوں کا ادب'' میں سرسید احمد کے افکار کی اہمیت وافادیت کے متعلق لکھا ہے:

''سرسید کو بچوں کی نفسیات وعادات کا بخوبی علم تھا، اور وہ نفسیات کے ذریعہ بچوں اور بڑوں دونوں کا علاج کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، چونکہ سرسید کا پیغام پوری قوم وملت کے لیے تھا اس لیے انھوں نے بہ طور خاص بچوں کے لیے نہیں لکھا لیکن انہوں نے جو کچھ لکھا اس کا بالواسطہ اثر بچوں کے ادب پر پڑا''۔ ۵

سرسید احمد خان کی پوری زندگی، اپنے ملک اور قوم کے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور مسائل کے سمندر اور مصایب کے گرداب سے باہر نکالنے میں صرف ہوگئی انھوں نے لوگوں کو کوشش پیہم، جہد مسلسل، حیات بامقصد اور خود کو باعمل بنانے پر جس پرزور اور پرجوش انداز میں تبلیغ کی ہے وہ کسی بھی صاحب خرد سے پوشیدہ نہیں ہے لہٰذا وہ قوم کے مستقبل یعنی بچوں کی انفرادی حیثیت کو بھلا کیسے نظر انداز کر سکتے تھے یہ ہی وجہ ہے کہ انھوں نے ادب طفلان کو عصری تقاضوں کی روشنی میں جانچا اور پرکھا، خامیوں کی نشان دہی کی اور اس کو بہتر اور مضبوط بنانے کے لیے نادر اور جدید تر اکیب بھی پیش کی ہیں ان کے مطابق کسی بھی معاشرے اور ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو ابتدائی زمانے سے ہی اخلاقیات کا درس دیا جائے یعنی ان کو نصابی اور غیر نصابی کتابوں میں ایسے اسباق کو پڑھایا اور بتایا جائے جو ان کی اخلاق وکردار سازی میں معاون ومددگار ہو ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد محض کتابی علم حاصل کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقیات پر بھی توجہ کرنا بے حد ضروری ہے اور یہ اخلاقی تعلیم اسی وقت ممکن ہے جب سماج میں رہنے والے تمام لوگ اس طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اسے اپنی مشترکہ ذمہ داری تصور کرتے ہوئے بذات خود عملی طور پر اعلیٰ اخلاق کا نمونہ بن کر سامنے آئیں وہ اپنے ایک مضمون ''تعلیم'' میں اخلاقی تعلیم وتربیت کے لیے سماج یا معاشرے کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں کیونکہ اخلاقی تعلیمات کا کتابوں کے ذریعے وہ اثر نہیں ہوتا جتنا کہ ہمارے عملی کردار کے ذریعے ہوتا ہے اپنے مذکورہ خیال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہمارے خیال میں اخلاقی تعلیم صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے''۔ ۶

سرسید احمد خان کو احساس تھا کہ دنیا کی کوئی عمارت کتنی ہی عمدہ واعلیٰ، بلند وبالا اور مضبوط اور مستحکم کیوں نہ بنالی جائے لیکن اگر اس عمارت کی بنیادیں عمیق اور گہری نہ ہوں گی تو اس کو کبھی بھی استواری اور پائیداری حاصل نہیں ہوسکتی ہے یا پھر کوئی درخت کتنا ہی گھنا اور تناور کیوں نہ ہو لیکن اس شجر کو اس وقت تک پائندگی اور پختگی حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کی جڑیں زمانے کی تیز وتند آندھیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار اور سینہ سپر نہ ہوں ٹھیک اسی طرح کوئی ملک اور معاشرہ کامیاب اور کامرانی سے ہمکنار ہو ہی نہیں سکتا ہے جب تک کہ اس ملک کا سب سے اہم، ضروری اور بنیادی حصہ یعنی بچوں کی تعلیم وتربیت

کا درست انتظام نہ کیا جائے انھیں اخلاقیات وانسانیت کا درس نہ دیا جائے اور ان کے دلوں میں آپسی اخوت ومحبت کی جڑیں مضبوط اور مستحکم نہ کی گئی ہوں اس مفکر اعظم کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ عموماً بچوں کو بچہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ملک کے سب سے لازمی طبقے کی طرف سے بے اعتنائی اختیار کی جاتی ہے یہ ہی سبب ہے کہ وہ اس بات پر خاصا زور دیتے نظر آتے ہیں کہ بچوں کو کم عمر سے ہی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ دی جائے کیونکہ کم عمر میں سکھائی گئی اخلاقی دروس بچوں کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح ایک کچے مٹی کے برتن پر نقش کیے گئے تمام نشانات کبھی نہیں مٹتے ٹھیک اسی طرح جو باتیں ان نونہالوں کو بچپن میں سکھائی اور بتائی جاتی ہیں وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی ہیں لہٰذا وقت رہتے اس طرف توجہ مبذول کیے جانا بے حد ضروری ہے ورنہ سوائے کف افسوس ملنے کے ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں آئے گا اور بچے ہر اعتبار سے کمزور اور ناقص رہ جائینگے جس کا براہ راست اثر اس ملک اور قوم کی کمزوری کی شکل میں نمودار ہوگا جو اس ملک اور اس کے لوگوں کو بے مائیگی اور احساس کم تری میں مبتلا کر دے گا سرسید احمد خان اپنے ایک مضمون میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو عمر اور وقت تربیت کا ہے، جب وہ گزر جاتا ہے تو بجز لاعلاج رنج رہ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا اور پھر ان کا ناتربیت یافتہ رہنا مثل کالی گھٹا کے ہم پر کڑکتا ہے اور ہم پر برستا ہے اور کسی کے گھر کو بہا دیتا ہے اور کسی کے خانماں کو جلا دیتا ہے''۷

سرسید احمد خان نے ادب اطفال اور تعلیم کے لیے جو فکر کن خیالات ونظریات پیش کیے ہیں وہ نہ صرف افراد بلکہ قوموں کی قسمتوں کو بدلنے کے لیے کافی ہے ان کو بچوں کی ذہنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کا بخوبی علم تھا وہ جانتے تھے کہ زور زبردستی سے کوئی بھی تعلیم یا تربیت بچوں پر اثر انداز نہیں ہوسکتی ہے اور نہ ہی ان کو ایک بہترین اور ذمہ دار انسان بنا سکتی ہے لہٰذا ضروری بلکہ لازم ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت میں جلد بازی یا زور زبردستی کا مظاہرہ نہ کیا جائے بلکہ انھیں جو کچھ بھی سکھایا یا بتایا جائے وہ ان کی عمر، ذہنی لیاقت اور نفسیات کے مطابق ہو کسی بھی بات کو سیکھتے وسمجھتے وقت کسی کی پسند وناپسند اور زور وزبردستی کے بجائے اس میں ان کی مرضی اور رضا شامل ہونا بے حد ضروری ہے بلکہ ان کی تعلیم وتربیت کرتے وقت زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان کو چیزوں کی درستگی ونادرستگی، صحیح وغلط اور اچھے وبرے کے بارے میں آگاہی کرادی جائے اور باقی کا مرحلہ انھیں بذات خود طے کرنے دیا جائے، سرسید احمد خان کو بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی سطح کا کس قدر علم تھا اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل جملوں سے لگایا جا سکتا ہے یہ جملے انھوں نے اپنے مشہور اور مقبول ترین پرچہ تہذیب الاخلاق کو بند کرتے وقت لکھے تھے جو ان کی بے پناہ بالغ نظری، حساسیت اور ذہنی وسعت کا پتا دیتے ہیں:

''بچے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے تم ٹھہر جاؤ ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے بچہ کڑوی دوا پیتے وقت بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی! یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے پی لے، تم چپ رہو میں آپ ہی پی لوں گا، لو بھائیوں اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھواٹھو، پی لو پی لو''۸

سرسید احمد خان کو اس بات کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ہندوستان کے بچوں بالخصوص مسلمانوں کو اپنے بچوں کی درست تعلیم وتربیت کے متعلق کوئی فکر نہیں ہے اور نہ ہی وہ اپنے تعلیمی نظام کو بہتر اور مضبوط بنانے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں ان کی لاپرواہی اور بے نیازی کے ان کو بہت خطرناک اور ہولناک نتائج دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن افسوس کہ وہ سب کچھ کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود بھی عبرت حاصل نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے کوئی ٹھوس اور عملی اقدام کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ وہ اس بات سے پوری طرح باخبر ہیں کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی مگر افسوس کہ جن ہاتھوں میں ان ننھے پودوں کی نگہداشت کی ذمہ داری ہے وہ ہی بے حسی اور بے اعتنائی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہم خود کو بے دست وپا محسوس کر رہے ہیں، سرسید نے بہت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ان تمام حالات کا مشاہدہ کیا ہے جو بچوں کی شخصیت کو مسخ کرنے والے ہیں وہ ایک منظم اور مستحکم تعلیمی نظام کی بات کرتے ہیں جس کے ذریعے بچوں کے مستقبل کو محفوظ کیا جا سکے اور ان کو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے روشناس کراتے ہوئے ایک بہترین انسان بنایا جا سکے لہٰذا کہتے ہیں:

''ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں تربیت اطفال کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے اور بڑا سبب ان کی حالت کے تباہ ہونے اور اولاد کے

نالائق رہنے یا آوارہ ہوجانے کا یہ ہی ہے کہ ہم ان حالتوں کا ذکر نہیں کرتے ،جن میں اطفال آوارہ اور خراب ہوجاتے ہیں بلکہ ان حالت کا ذکر کرتے ہیں جس میں غلطی سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری اولاد نے خوب تربیت پائی ہے، غلطی اس لیے ہے کہ حقیقت میں وہ تربیت عمدہ تربیت نہیں ہے، اور یہ ہی سبب ہے کہ ان کو کچھ لیاقت نہیں آتی، اور ان کے دل میں اخلاقی فیاضی اور طبیعت کی آزادگی اور دل کشادگی پیدا نہیں ہوتی ،تمام قویٰ جوان میں خدا تعالیٰ نے رکھے ہیں، سب پژمردہ اور ناکارہ ہوجاتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ قویٰ جن سے انسان اپنے زمانہ عمر میں نام آور، اور دل جلا اور عالی حوصلہ، غیرت ولا ہوتا ہے، باقی نہیں رہتے''۔۹

دورۂ موجودہ میں ہمارے ملک کا تعلیمی نظام جس انتشار، بدنظمی اور بحرانی صورت حال کا شکار ہے اس نے ہمارے ملک کے تمام والدین کو حیران و پریشان کر رکھا ہے لوگ یہ سمجھ ہی نہیں پا رہے ہیں کہ آج برق رفتاری کے ساتھ بدلتی ہوئی اقدار میں کس کو تھامیں اور کس کو چھوڑ دیں تعلیم کے نام پر چاروں طرف جو کاروبار کیا جارہا ہے اس کی حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ عصر حاضر میں تعلیم وتربیت کے نام پر جو طوفان بدتمیزی بپا ہے اس کی زد میں آنے سے اپنے بچوں کو کس طرح بچائیں تعلیمی ماہرین بھی اس سلسلے میں کوئی ٹھوس اقدام اور مضبوط دلائل دینے میں ناکام نظر آرہے ہیں لہٰذا آج کی تکلیف دہ صورت حال میں ہمارے اس رہبر ملت اور رہنمائے قوم کے تعلیمی نظریات اور تربیتی نکات اتنے ہی اہم اور ضروری ہیں جتنے کے خود ان کے اپنے زمانے میں ہوسکتے تھے اس دردمند قومی رہنما نے تعلیم وتربیت کے متعلق صرف اپنے نظریات ہی نہیں پیش کیے ہیں بلکہ عملی طور پر بھی وہ کارہائے گراں قدر انجام دیئے ہیں جن کی اہمیت ومعنویت آج دوصدیاں گزر جانے کے بعد بھی اسی طرح قائم ودائم ہے بلکہ دورۂ حاضر کے حبس زدہ ماحول میں تو ان کے ان نظریات کی اہمیت وافادیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے ڈاکٹر محمد نثار احمد نے اپنے ایک مضمون ''ادب اطفال'' میں سرسید کے نظریات وافکار کی قدر و قیمت اور اہمیت ومعنویت کا اعتراف کرتے ہوئے ان پر فوراً عمل ودرآمد کرنے کا مشورہ دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''سرسید احمد خان ہمارے لیے اہمیت کے حامل ہیں اور مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ادب اطفال اور تعلیم اطفال کے حوالے سے سرسید کے افکار ونظریات اس قابل ہیں کہ ان پر فوری عمل درآمد کیا جائے اور انھیں عملی شکل دینا آپ کی خدمات کا اعتراف اور آپ کے لیے خراج عقیدت ہے''۔۱۰

مختصر ایہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے بچوں پر ہی مستقبل کا دارومدار ہے لہٰذا ان کی شخصیت کی درست تشکیل کی طرف توجہ دینا ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے بچوں کے نصاب میں ہی اخلاقیات کو ہی شامل نہ کیا جائے بلکہ عملی طور پر بھی اعلیٰ اخلاقی اقدار کو پیش کیا جائے اور اس کے لیے ہمارے اس قومی رہنما کے نظریات وافکار ہماری خصوصی مدد کرسکتے ہیں اس معاشرے کے ایک حساس فرد اور دردمند قومی رہنما کی حیثیت سے انھوں نے جو اصول وضوابط اطفال کے لیے معین کیے ہیں ہمیں ان پر از سرنو غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ایک مہذب اور صالح معاشرے کا قیام عمل میں آسکے سرسید احمد خان جس اخلاقی تربیت اور روحانی تعلیم کی بات کرتے ہیں آج کے زمانے میں اس کی ضرورت زیادہ نظر آتی ہے۔

ماخذ ومنابع

۱۔ تاریخ ادب اردو جلد چہارم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی صفحہ نمبر ۸۹۴۔

۲۔ جام جم، سرسید احمد خان، تصحیح، ترتیب وحواشی پروفیسر ریحانہ خاتون، ناشر انڈو پرشین سوسائٹی، نئی دہلی، ۲۰۱۱، صفحہ نمبر ۴۔

۳۔ سیرت فریدیہ، سرسید احمد خان، طباعت مفید عام پریس، آگرہ، ۱۸۹۶، صفحہ نمبر ۴۷۔

۴۔ مقالات سرسید، سرسید احمد خان مرتبہ محمد عبداللہ خویشگی، نیشنل پرنٹرس کمپنی علیگڑھ، ۱۹۵۲، صفحہ نمبر ۲۰۸۔

۵۔ گلستان سرسید (مقالات سرسید)، مدیر ومرتب ڈاکٹر ناظم الدین منور، روشناس پرنٹرس، دہلی ۲۰۲۱، صفحہ نمبر ۱۶۲۔

۶۔ مقالات سرسید، سرسید احمد خان مرتبہ محمد عبداللہ خویشگی، نیشنل پرنٹرس کمپنی علیگڑھ ۱۹۵۲، صفحہ نمبر ۱۷۸۔
۷۔ مقالات سرسید، سرسید احمد خان مرتبہ محمد عبداللہ خویشگی، نیشنل پرنٹرس کمپنی علیگڑھ ۱۹۵۲، صفحہ نمبر ۲۰۶۔
۸۔ مطالعہ سرسید احمد خان، مولوی عبدالحق، ایجوکیشنل بک ہاؤس، لیتھو کلر پرنٹرس اچل تال علیگڑھ، صفحہ نمبر ۱۸۔
۹۔ مقالات سرسید، سرسید احمد خان مرتبہ محمد عبداللہ خویشگی، نیشنل پرنٹرس کمپنی علیگڑھ ۱۹۵۲، صفحہ نمبر ۲۰۸۔
۱۰۔ گلستان سرسید (مقالات سرسید)، مدیر و مرتب ڈاکٹر ناظم الدین منور، روشناس پرنٹرس، دہلی، صفحہ نمبر ۲۱۵۔

سرسید کا نظریہ ''تعلیم نسواں''

عورت اور مرد یہ معاشرے کے اہم ستون ہیں۔جن پر معاشرے کی بنیاد قائم ہے۔سماج کی فلاح و بہبود کے لیے دونوں کا کردار نہایت اہم ہے۔جس طرح کسی معاشرے کے افراد کی ترقی اور کامیابی کے لیے تعلیم کا حصول لازمی ہے اسی طرح تعلیم مرد وعورت دونوں کے لیے ضروری ہے۔مذہب اسلام میں عورت کو بہت عزت کا مقام عطا کیا گیا ہے،اوران کی دنیاوی وعصری تعلیم کو اہمیت دی گئی ہے۔تعلیم نسواں کی بدولت کسی ملک میں معاشی و اقتصادی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔عورتوں کی تعلیم کا اصل مقصد انہیں علم سے آگاہی کے علاوا ان کی اچھی صلاحتیوں کو اُجاگر کرنا بھی ہے۔جس معاشرے کی عورتیں تعلیم یافتہ ہوتی ہیں وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔عورت کا حقیقی زیور تعلیم ہی ہے۔اسی سے وہ اپنے مقام سے آگاہ ہوکر اپنا اور معاشرے کا مقدر سنوار سکتی ہے۔اس بات کا احساس بڑی حد تک سرسید احمد خان کو تھا اوراسی کی ترجمانی کے لیے انہوں نے بڑے اقدام کیے۔جدید مغربی تعلیم عورتوں کے لیے فائدہ مند نہیں ہے ایسا سرسید کا خیال تھا لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ تعلیم نسواں کے مخالف تھے۔مغربی تعلیم کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان عورتیں اپنی تہذیب وتمدن سے دور ہوجائیں گی ،رہن سہن،طرز معاشرت میں تبدیلی واقع ہوگی ،جو معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ سرسید دوراندیش شخصیت کے مالک تھے۔ان کی سوچ تھی کہ حالات بہتر ہوں تو عورتوں کی تعلیم کا نعرہ بلند کیا جائے۔اس وقت کے حالات کو مدنظر رکھ کر سرسید نے اہم فیصلے لیے۔انہوں نے عورتوں کی جدید تعلیم کے متعلق محتاط روّیہ اس لیے اختیار کیا کہ وقت اور ماحول کا یہی تقاضہ تھا۔نہ صرف مسلم بلکہ ہندوؤں کا بھی ایک بڑا طبقہ تعلیم نسواں کے سلسلے میں محدود نظریات کا حامل تھا۔ ایک جگہ سرسید کہتے ہیں:

''اے میری بہنو! میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا تعلیمی طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرو۔وہی طریقہ تمہارے لیے دین ودنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف رہو اور اس کی نیکی اور خدا کی عبادت کی خوبی کو تم جانو،اخلاق کی نیکی اور نیک دلی،رحم ومحبت کی قدر سمجھو اوران باتوں کو برتاؤ میں لاؤ۔گھر کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھو۔اپنے گھر کی مالک رہو۔اس پر مثل شہزادی کے حکومت کرو اور مثل ایک لائق وزیرزادی کے منتظم رہو۔''

ہر سال ۱۷ اکتوبر کی بڑی اہمیت ہے۔یہ دن سرسید اوران کے جہد مسلسل سے عبارت ہے۔دنیا کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہوگا جہاں اس دن سرسید اوران کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جاتا ہو۔سرسید ایک تحریک تھے جس نے ہندوستانی عوام کو ذہنی غلامی سے نجات دلائی۔قوم کو پستی سے نکال کر ترقی پر گامزن کیا۔جدید ہندوستان کی تعمیر اور مسلمانوں کی احیاء ملی کے لیے انہوں نے جو عظیم الشان خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔سرسید ایک بلند کردار انسان تھے۔روشن خیالی اور روشن دماغی کے ساتھ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیم کے حصول کے لیے پورے تن من دھن سے خود کو وقف کردیا۔وہ تاریخ کا رخ موڑ دینے والے اشخاص میں سے تھے۔جدید ہندوستان کی تاریخ میں سرسید جیسا مستقبل شناس پیدا نہیں ہوا اور نہ آگے اس کی توقع ہے۔زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جسے انہوں نے متاثر نہ کیا ہو۔تعلیم کے میدان میں سرسید نے دائمی نقوش ثبت کیے۔انہیں خاص اصطلاحی معنوں میں ماہر تعلیم نہیں کہا جاسکتا کیونکہ سرسید نے اپنے تعلیمی خیالات ونظریات کا اسکولوں اور کالجوں میں عملی تجربہ کیا،نہ اپنے افکار کی روشنی میں تدریس کا کوئی نیا دبستان قائم کیا لیکن اپنے افکار و نظریات سے خود عملی تدریس اور فن تعلیم کو ضرور متاثر کیا۔سرسید کا فلسفہ تعلیم دیگر دانشوروں سے منفرد تھا۔وہ تعلیم سے مُراد صرف لکھنا پڑھنا نہیں سمجھتے تھے بلکہ تعلیم کو انسان کی ہمہ جہت ترقیاتی منصوبوں کا ضامن قرار دیتے تھے۔انہیں یہ یقین تھا کہ اخلاقی بلندی،مہذب رویہ اور ذہنی کشادگی کا ایک بہترین وسیلہ وسماجی بہتری کا آلہ کار تعلیم ہے۔یہ سرسید ہی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے جس تعلیمی ادارے کی بنیاد ڈالی اس کی خدمات لاثانی اور روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں ایسے کئی بڑے نام ہم کو مل جائیں گے جنہوں نے تعلیم اور تعلیم نسواں سے متعلق بیش قیمتی نظریات پیش کیے ہیں مگر بہت کم ایسے ہیں کہ جنہوں نے فکر کے ساتھ فکری رویّوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہو۔سرسید احمد خان نے دونوں سطح پر یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ایک طرف انہوں نے تعلیمی تناظر میں کام کیا وہیں دوسری جانب تربیت پر بھی بہت زور دیا۔سرسید نے صاف لفظوں میں یہ کہا تھا کہ کسی بھی قوم کی تنزلی کو دور کرنے کا واحد

ڈاکٹر شیخ عمران،اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو،وسنت راؤنا یک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز،مہاراشٹر

علاج تعلیم کے سوااور کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ تعلیم کی اشاعت میں دلچسپی لی جائے۔ سرسید کا سفر انگلستان بہت اہمیت کا حامل تھا۔ سرسید نے وہاں کے تعلیمی نظام کا اچھے سے جائزہ لیا۔ وہاں عورتوں کی ترقی اور بیداری نیز مردوں کے شانہ بہ شانہ جینے کے اطوار اور حقوق اصرار سے سرسید آگاہ تھے۔ مغربی طرز زندگی میں عورتوں کے کردار کو بھی وہ تحسین کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ہر معاملے میں ہندوستانی حالات سے ان کا موازنہ کرتے تھے۔ عورتوں کی بے پردگی کے سرسید قائل نہیں تھے۔ سرسید کے مخالفین نے اس موضوع کو بہت نشانہ بنایا کہ وہ تعلیم نسواں کے سخت مخالف تھے، وہ عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھنا چاہتے تھے، ایسے الزامات ان پر لگائے گئے۔ یہ بات درست ہے کہ وہ جدید تعلیم کے حمایتی تھے۔ ہندوستان میں جدید تعلیم کو فروغ دینے کا سہرا سرسید کے سر جاتا ہے۔ اصل میں وہ چاہتے تھے کہ مسلم لڑکے پہلے تعلیم یافتہ ہوں اور پھر مسلم لڑکیاں۔ دونوں کی تعلیم کو وہ بے حد ضروری قرار دیتے تھے۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ اگر مرد تعلیم یافتہ ہوں گے تو عورتوں کی تعلیم کی راہ خود بخود ہموار ہو جائے گی۔ اپنی تقریروں اور تحریروں میں انہوں نے واضح الفاظ میں یہ کہا ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے مخالف نہیں، اور نہ ہی خواتین کو وہ تعلیم سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ ۱۸۹۱ کو علی گڑھ میں تعلیم نسواں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا:

''جب مرد لائق ہو جاویں گے سب ذریعہ پیدا کر لیں گے۔ گھر کی عورتیں بھی لائق ہو جاویں گی اور استانیاں بھی پیدا ہو جاویں گی۔ میرے صرف دو مطلب ہیں جن کو میں پھر بیان کرتا ہوں اوّل یہ کہ میں مخالف عورتوں کی تعلیم کا ہوں غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ ذریعہ عورتوں کی تعلیم کا سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ مردوں کی تعلیم ہو اور اسی میں میں کوشش کرتا ہوں کہ بچوں کی تعلیم ہو۔ جب وہ تعلیم یافتہ ہو جاویں گے اپنی بیویوں اور بچوں اور عورتوں کو تعلیم سے آراستہ کریں گے۔''

مذکورہ قول سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے حمایتی تھے مخالف نہیں۔ لڑکوں کی طرح لڑکیاں بھی زیور تعلیم سے آراستہ ہوں، یہ ان کا مشن تھا۔ انگلستان کے تعلیم طرز پر ہندوستان میں بھی وہ عورتوں کے لیے مدارس اور کالج دیکھنا چاہتے تھے تاکہ یہاں بھی وہ ایسے نظام کو فروغ دے سکیں جو عورتوں کی تعلیم کے حق میں مفید ہوں، ساتھ ہی ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے سرگرداں رہنے والوں کو ایک راہ دکھا سکیں۔ سرسید کا کہنا تھا کہ خواتین کو جو حقوق ملنے چاہیے وہ حقوق مرد حضرات انہیں نہیں دے رہے ہیں اگر پہلے مرد حضرات تعلیم حاصل کر لیں تو تمہارے حقوق تمہیں مل جائیں گے۔ اس لیے پہلے مرد حضرات تعلیم کی طرف رجوع ہو جائے اور بعد عورتیں:

'' اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستگی ہوگئی ہو اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہوگئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو۔ میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت تمہارے لڑکوں کے لیے کر رہا ہوں درحقیقت وہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے ہے۔''

(سرسید احمد خاں کا سفر نامہ پنجاب، مولوی سید اقبال علی، ۱۸۸۴، ص ۱۰۲)

عورتوں کے متعلق سرسید بہت حساس تھے۔ وہ ہمیشہ حقوق نسواں کے لیے بے چین رہتے۔ خواتین میں تعلیم کے علاوہ تحریری صلاحیت، پردہ کی اہمیت، مذہبی رجحانات کو بڑھاوا دینا ان کے اہم مقاصد تھے جس کی تکمیل کے لیے وہ آخری دم تک کوشاں رہے۔ اسعد فیصل فاروقی اپنے مضمون ''تعلیم نسواں کے سلسلے میں سرسید کے تصورات'' میں لکھتے ہیں:

''سرسید کو کامل یقین تھا کہ اگر لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح بندوبست ہو جائے گا تو آگے چل کر ہماری قوم کی بیٹیاں خود بخود اعلیٰ وجدید تعلیم سے آراستہ ہو جائیں گی اسی وجہ سے وہ لڑکیوں کی تعلیم میں جلد بازی نہیں چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے لڑکیوں کے لیے قدیم گھریلو طرز کی تعلیم کو موجودہ حالات کے لیے سودمند فلاح و بہبود کا ذریعہ بتایا۔ ان کا ماننا تھا کہ اگر موجودہ ماحول کو دیکھتے ہوئے عورتوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرانے کی کوشش کی گئیں تو بجائے فائدہ کے اُلٹا نقصان دہ ثابت ہوگا اور عورتوں کو دوزخ میں ڈھکیلنے کے مترادف ہوگا۔ کیوں کہ ان کا واسطہ ایسے معاشرے سے پڑے گا جس کے مرد خود ابھی تک اعلیٰ تعلیم سے محروم ہوں گے جس کی وجہ سے دونوں میں نااتفاقی پیدا ہوگی اور ان کی زندگی ناسور بن جائے گی۔''

(رسالہ تہذیب الاخلاق، خاص نمبر، اکتوبر ۲۰۰۳ ص ۹۳)

سرسید احمد خان اور تعلیم نسواں کو موضوع بنا کر بہت سے ماہرین نے اپنی رائے پیش کی ہے۔ پروفیسر اصغر عباس اپنے مضمون ''سرسید تحریک کی نسائی جہت'' میں لکھتے ہیں:

''لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں سرسید کے خیالات کا اندازہ ''اسباب بغاوت ہند'' سے بھی ہوتا ہے جس میں انہوں نے بغاوت کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے منجملہ اور اسباب کے ایک سبب لڑکیوں کے مدرسوں کے قیام کو بھی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''سب یقین جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکول میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں۔ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی۔''

(اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ، قیصر جہاں، مشمولہ مضمون ''سرسید تحریک کی نسائی جہت'' پروفیسر اصغر عباس، ص ۹۷)

سرسید احمد خان کے تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے میں ان کے رفقاء کا بھی اہم رول رہا۔ قدم قدم پر انہوں نے سرسید کا ساتھ دیا۔ رفقائے سرسید نے تعلیم نسواں پر نہ صرف توجہ دی بلکہ عورتوں کو ان کے حقوق کے حصول کے لیے بہت کوششیں کیں۔ ہندوستان میں تعلیم نسواں کو تقویت دینے اور اس کا وقار بلند کرنے میں رفقائے سرسید نے جو کوششیں کیں وہ کسی تحریک سے کم نہیں۔ مولانا الطاف حسین حالؔی جو سرسید تحریک کے اہم ستون تھے بار بار انہوں نے اپنی تحریروں میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ صحت مند سماج کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا اشد ضروری ہے۔ وہ عورتوں کی سماجی و تعلیمی پستی پر بہت رنج و افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالؔی نے اپنی نظموں میں تعلیم نسواں کو موضوع بنایا۔ صالحہ عابد حسین ''مجالس النساء'' کے مقدمے میں لکھتیں ہیں:

''حالؔی کے دل میں عورتوں کا بڑا احترام تھا۔ اور ان کی تعلیم، تربیت اور بھلائی کی گہری فکر تھی اور اس کا بڑا دکھ تھا کہ عورت کو مردوں نے علم کی روشنی سے محروم رکھا ہے۔ اس احساس کی پہلی جھلک مجالس النساء میں نظر آتی ہے۔ بعد میں یہی درد چُپ کی داد میں ڈھل کر سامنے آیا۔ حالؔی کی کوششیں صرف قلم تک محدود نہ رہیں۔ انہوں نے اپنے خاندان، محلّے اور اپنے وطن پانی پت میں لڑکیوں کی تعلیم کو رواج دیا۔ ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی وہاں لڑکیوں کے لیے قائم کیا تھا۔''

(مجالس النساء، مولانا الطاف حسین حالؔی، ص ۶۔۷)

سرسید کی تعلیمی تحریک کے روح رواں مولوی نذیر احمد نے لڑکیوں کی تعلیم کو اپنا خاص محور بنایا۔ اپنے مختلف ناولوں میں اس کا تذکرہ کیا، تعلیم نسواں کی اہمیت کو اپنی تقاریر میں اُجاگر کیا، اس موضوع پر مضامین و کتابیں ترتیب دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے نئے راستے ہموار ہوئے۔ جس بے باکی سے نذیر احمد نے اس موضوع پر لکھا اس عہد کے دیگر مفکرین کے یہاں وہ بات نظر نہیں آئی۔ تعلیم نسواں اور ان کے حقوق سے متعلق نذیر احمد کے موقف کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دیگر رفقاء کے خیالات بھی اس ضمن میں مثبت تھے۔ انہوں نے ہر طرح سے تعلیم نسواں کی اہمیت وافادیت کو عام کیا۔ مولوی ذکا اللہ لڑکیوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ خواتین کے مسائل کو انہوں نے اپنے مضامین میں جگہ دی۔ ان کا ایک اہم کارنامہ بلند شہر میں بیواؤں کے لیے اسکول کا قیام تھا۔ شمالی ہند میں تعلیم نسواں کی جڑیں مضبوط کرنے کا اہم کام مولوی ذکا للہ نے کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سماج میں ایک نئی کرن پیدا ہوئی۔ وہ لوگ جو عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے تعلیم کو ضروری سمجھنے لگے۔

رفقائے سرسید نے تعلیم نسواں کے متعلق سرسید پر لگائے گئے الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ سرسید کبھی ایسا نہیں چاہتے تھے کہ مسلم قوم کی عورتیں تعلیم سے محروم رہے۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق سرسید پہلے لڑکوں کے لیے تعلیم کا پختہ انتظام کرنا چاہتے تھے۔ جس دور میں سرسید جدید تعلیم کو لے کر ایک محاذ پر جنگ لڑ رہے تھے، وہ حالات بہت نازک تھے۔ سرسید کے مخالفین انہیں ہارتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ ایسی نازک گھڑی میں سرسید اپنے خلاف ایک اور محاذ کھڑے ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے، ساتھ ہی لڑکوں کی تعلیم کی راہ بھی مشکل میں پڑ جاتی۔ ہندوستان میں جدید تعلیم کی ترغیب کی وجہ سے سرسید کو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کی جانب سے مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہاں تک کے مولویوں نے فتوے جاری کیے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا کفر ہے۔ اب ایسے وقت جب لڑکوں کی تعلیم حاصل کرنے کے ہی لالے پڑے تھے پھر سرسید لڑکیوں کی تعلیم کا معاملہ اُٹھا کر اپنے تعلیمی مشن کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ سرسید ارباب دانش میں سے تھے۔ اپنے خاندان میں خواتین کی تعلیم کا اہتمام کیئے جانے اور ان کے لیے مرد حضرات کی طرف سے تعاون کا ذکر

بھی انہوں نے کیا۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کو لے کر فکر مند تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر راحت ابرار لکھتے ہیں:

''سرسید نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں اپنے متعدد مضامین اور اداریوں میں اظہار خیال کیا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے متعدد شمارے اس اجمال کی تفصیل پر گواہ ہیں۔ سرسید نے ایجوکیشن کمیشن کے سامنے اپنے خاندان کی عورتوں کے پڑھے لکھے ہونے کا ذکر کر کے اس کی تردید کی تھی کہ مسلمان عورتیں جاہل ہوتی ہیں۔ سرسید کی چہیتی پوتی یعنی سید حامد کی اکلوتی بیٹی احمدین بیگم اپنے دادا سرسید سے گیارہ بارہ سال کی عمر میں خط و کتابت کرتی تھیں ان خطوط سے بھی پتہ چلتا ہے کہ سرسید کے خاندان کی لڑکیاں بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ سرسید کا تعلق معاشرے کے جس طبقے سے تھا، اس طبقے کے فرد کی حیثیت سے خواتین کے بارے میں ان کا رویّہ جذبہ تحسین سے مملو نظر آتا ہے اور وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے مسائل کو یکسر فراموش نہیں کرتے۔ جو لوگ انہیں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں مستعد نظر آتے ہیں وہ ان کی کوششوں کو فراخ دلی سے سراہنے سے گریز نہیں کرتے۔''

(مسلم تعلیم نسواں کے سو سال: چلمن سے چاند تک، ڈاکٹر راحت ابرار، ۲۰۱۱، ص ۲۰)

پروفیسر شمیم نکہت نے اپنے مضمون ''آزادی نسواں کی جدوجہد'' میں لکھا ہے:

''انیسویں صدی کا آخری حصہ اور بیسویں صدی عورتوں کی آزادی کی جدوجہد کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ اسی زمانے میں سرسید نے مسلم ایجوکیشن کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس کا اصل مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی پستی سے نکالنا تھا۔ سرسید یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ خواب اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم و اصلاح اور مذہبی عقائد و رسومات کو درست نہ کیا جائے۔ اس لیے سرسید نے ۱۸۷۰ سے تہذیب الاخلاق میں عورتوں کی تعلیم، کثرت ازدواج اور رفاہِ عورات وغیرہ عنوانات پر کئی مضامین لکھے۔ سرسید تحریک کے اثر کے تحت بہت جلد ایک معقول اور روشن خیال مسلمان حلقہ بن گیا جس نے عام مسلمانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم و اصلاح پر بھی خصوصیت کے ساتھ زور دیا۔''

(اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ، قیصر جہاں، مشمولہ مضمون ''آزادی نسواں کی جدوجہد''، شمیم نکہت، ص ۴۳)

رسالہ تہذیب الاخلاق کو سرسید نے اس دور میں جاری کیا جب اس کی شدید ضرورت تھی۔ سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے میں یہ رسالہ ایک اہم کڑی ثابت ہوا۔ اس کے ذریعہ انہوں نے مسلم قوم کو بیدار کیا۔ تعلیم نسواں کی ضرورت، اہمیت و افادیت پر متعدد مضامین اس رسالہ میں شائع ہوئے۔ ہندوستان میں تعلیم نسواں کی روایت بہت قدیم ہے۔ سرسید اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے یہاں تعلیم نسواں کے لیے سازگار ماحول تیار ہوا۔ آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ عورتیں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ تعلیم کے مدارج طے کر رہی ہیں۔ تعلیمی، سیاسی، سماجی ہر اعتبار سے انہیں اہمیت دی جا رہی ہے۔ سرسید کا لگایا ہوا پودا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں آج بھی موجود ہے جس کی جڑیں پورے ہندوستان میں پھیل چکی ہیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں خواتین تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ اس یونیورسٹی میں لڑکیوں کے لیے اسکول اور کالج کا قیام اس بات کے شاہد ہیں کہ تعلیم نسواں کے متعلق سرسید کے نظریات مثبت تھے۔ وہ خود اپنی جگہ ایک انجمن تھا۔۔۔۔

حواشی:

۱۔ سرسید احمد خاں کا سفر نامہ پنجاب، مولوی سید اقبال علی، ۱۸۸۴، ص ۱۰۲

۲۔ رسالہ تہذیب الاخلاق، خاص نمبر، اکتوبر ۲۰۰۳ ص ۹۳

۳۔ اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ، قیصر جہاں، مشمولہ مضمون ''سرسید تحریک کی نسائی جہت'' پروفیسر اصغر عباس، ص ۹۷

۴۔ مجالس النساء، مولانا الطاف حسین حالؔی، ص ۶۔۷

۵۔ مسلم تعلیم نسواں کے سو سال: چلمن سے چاند تک، ڈاکٹر راحت ابرار، ۲۰۱۱، ص ۲۰

۶۔ اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ، قیصر جہاں، مشمولہ مضمون ''آزادی نسواں کی جدوجہد''، شمیم نکہت، ص ۴۳

سرسید احمد خان: اردو میں جدید تاریخ نویسی کے بانی

انسانی زندگی کے گزرے ہوئے واقعات بیان کرنے کو (اصطلاح میں) تاریخ کہتے ہیں۔ تاریخ مختلف قوموں کے ظہور، تنزل، ترقی، آثار، حالات، آداب، رسوم، عقائد اور مشہور لوگوں کے کارنامے بیان کرتی ہے اور جو اہم امور ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ان کے اسباب اور نتائج بتاتی ہے۔ تاریخ میں آدمی کے لئے بہت کچھ فوائد ہیں۔ مختصر یہ کہ تاریخ جاننے والا ان تمام تجربات سے تھوڑے عرصہ میں واقف ہوجاتا ہے جنھیں اگلے لوگوں نے تمام عمر صرف کر کے حاصل کیا تھا اور تاریخ نہ جاننے والوں سے حاصل بہتر سمجھ سکتا ہے کہ کیا کرنا چاہئے اور کس سے بچنا چاہئے۔[1]

اگر تاریخ نہ ہوتی تو انسان کی ابتدائی پیدائش اور طرف رہائش کی ہمیں خبر نہ ہوتی۔ نہ اگلے وقتوں کے بزرگوں کی طرز معاشرت کا حال معلوم ہوتا۔ اگر تاریخ نہ ہوتی تو بہاروں کی دلیری، فاضلوں کی علمیت، قابلوں کی نصیحت، بادشاہوں کا انصاف گمنامی کے تاریک غار میں چسپاں ہوتا۔

علمیت اور واقفیت کے لئے تو اریخ عالم سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں۔ تاریخ ہی ہمیں بتاتی ہے کہ پیغمبروں اور اولیاؤں نے کیوں کر زندگی بسر کی۔ ایک تن واحد نے کیوں کر اپنی سچائی، دیانت داری اور خلق سے لوگوں کو اپنا گرویدہ کرلیا اور اسلام کو تمام دنیا میں پھیلا دیا۔ دیگر برگزیدہ انسانوں نے کیوں کر ترقی کی تاریخ گزشتہ لوگوں کے حالات کا ہو بہو آئینہ ہے۔ وہ ذاتی جوہر بتاتی ہے تو ساتھ ساتھ عیب بھی گنواتی جاتی ہے۔ تاریخ نے ملک کی تہذیب و ترقی میں بہت مدد دی ہے۔ تاریخ ہی ایسی چیز ہے جو ہمیں ترقی کے اسباب اور تنزل کے وجوہات بتاتی ہے کہ تمہارے بزرگوں نے اس طرح میدان ترقّی میں قدم بڑھایا اور ان وجوہات سے پستی کے گڑھے میں گر پڑے۔

تاریخ کے مطالعہ سے دماغ میں فکر و سوچ، دل میں جوش، طبیعت میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ انسان کے سامنے بھلائی و برائی کا دفتر ہوتا ہے، عزت و ذلت کے سبق ملتے ہیں۔ عقل و تجربہ کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایجاد و اختراع کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ حرص و ہوا سے بچاتی ہے اور قناعت و صبر کا سبق پڑھاتی ہے۔

غرض تاریخ بہت کارآمد چیز ہے۔ لیکن افسوس لوگ اس کی قدر نہیں کرتے۔ جو اس کی قدر کرتے ہیں، پڑھتے ہیں اور اس سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ انھیں عبرت نصیحت، علم واقفیت بہت سی باتیں حاصل ہوسکتی ہیں۔ تاریخ کل بھی تھی، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ غرض تاریخ کائنات وجود میں آنے کے بعد سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا زوال خزانہ ہے۔

تاریخ کی تدوین و ترتیب کرنے والا مورخ کہلاتا ہے جو علم، طبقات الارض، علم ہیئت، علم تمدن اور مذاہب عالم سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین نکتہ رس اور منصف مزاج ہوتا ہے۔ جو ادیب اور قادر الکلام بھی ہوتا ہے تاکہ ماضی الضمیر کو با آسانی ادا کرسکے۔ اچھا مورخ امانت و دیانت میں ممتاز جھوٹ اور بیہودہ گوئی سے کوسوں دور ہوتا ہے جو صادق ہوتا ہے اور جس اعمال میں خصوصی امتیاز رکھتا ہے۔ جو نہ کسی کی خوشامد کرے نہ کسی سے بغض و عداوت رکھے، جس کی عبارت سادہ، سلیس، عام فہم اور بے ساختہ ہو۔

جہاں کم فہم لوگوں کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کے اندیشہ ہو وہاں مورّخ اس واقعہ کے متعلق اپنی جانب سے تشریح کرتا ہے اور حقیقت کو سمجھاتا ہے۔[2]

انیسویں صدی میں ہندوستان میں ایک کثیر جہتی شخصیت کی پیدائش ہوئی۔ جن کا نام سرسید احمد خان تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان پر انگریزی حکومت کا تسلط قائم ہوچکا تھا اور ہر ہندوستانی زبردست کشمکش میں مبتلا تھا۔ مغلوں کی نظام حکومت کی جگہ برٹش اقتصادی نظام نے لے لیا تھا۔ اس مایوس کن فضا میں افق دہلی سے سرسید امید کی کرن بن کر ابھرے۔ جن کی ہمہ گیری سیاست، تعلیم، مذہب اور سماج پر اپنے لافانی نقوش چھوڑے۔ جن کے بارے میں پروفیسر آرنلڈ رقمطراز ہیں:

> ''تاریخ سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں مجتمع ہوں وہ (سرسید) ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا سوشل

ڈاکٹر نزہت فاطمہ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تاریخ قرون وسطیٰ، حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، پریاگ راج

رفارمر، پولیٹیشین، مصنف اور مضمون نگار تھا۔ اس کا اثر سوچنے والے عالم کا سا نہ تھا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھا اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اکسائے بلکہ وہ علانیہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر آیا۔ اس لئے کہ آیا کہ جس بات کو سچ اور صحیح سمجھے اگر اس کی دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لئے ہر وقت آمادہ اور تیار رہے۔ ہندوستان میں ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا اور نہ دولت تھی۔ باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور سے حاصل نہیں ہوا۔''

انھوں نے اپنی کاوشوں سے اردو کو مولوی ذکاء اللہ اور شبلی نعمانی جیسے مورخ دیئے۔ سرسید ایک تحقیقی ذہن کے مالک تھے۔ سرسید نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے ہر وہ قدم اٹھانے کی سعی کی جو انھیں آزاد فضاؤں میں لے جاتا۔

انھوں نے شبلی کو جدید کام سونپا کہ وہ مسلمانوں کو پر عظمت ماضی کی داستان سنا کر ان کے دلوں سے وہ احساس کمتری دور کریں جو جنگ آزادی میں شکست کھانے کے بعد ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا۔[۳] سرسید خود بھی عملاً اس کام میں شریک رہے۔

تاریخ نویسی میں جملوں کا اختصار اور بیان میں سادگی کی ضرورت ہوتی۔ چنانچہ شبلی کی تصنیف 'المامون' کے سادہ انداز تحریر کا ذکر کرتے ہوئے اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے، جو خوبصورت ہے، خوبصورت ہے۔ جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے۔ نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بتایا ہے نہ بھونڈے پن کو زیادہ بھونڈا اور دراصل یہی کمال تاریخی نویسی ہے۔''[۴]

سرسید کی تاریخی نگارشات مختلف النوع ہیں۔ انھوں نے تاریخ کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا۔ عرب و ہند کے قدیم تاریخی تذکروں کو کھنگالا، تاریخ اسلام اور اسلامیانِ ہند پر خامہ فرسائی کی اور یورپ و ایشیا سے متعلق متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا۔ سرسید کی اہم تاریخی تحریروں سے ان کے مورخانہ عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سرسید کے قلم سے تحریر سیرۃ و سوانح میں اول الذکر و 'جلا القلوب بذکر المحبوب' رسالے کی اشاعت کے چھتیس سال بعد جون ۱۸۷۸ء میں سرسید نے اس پر ریویو کیا جو تصانیف احمدیہ، جلد اول مطبوعہ ۱۸۸۳ء میں شامل ہے۔[۵] اس کا مقصدِ تحریر یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے سلسلے میں مستند ماخذات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات یکجا کر دیئے جائیں۔[۶] 'سیرتِ فریدیہ' سرسید کے نانا دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد کی سوانح حیات ہے۔ اگرچہ یہ فردِ واحد کی سوانح حیات ہے لیکن اس سے اس عہد کے شرفائے دلی کے مشاغل اور ان کے عام حالات کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے سلطنت مغلیہ کے دورِ زوال کے حالات بھی معلوم ہوتے ہیں۔ آخری مغل حکمرانوں کی بے کسی کا بھی پتہ چلتا ہے۔[۷]

ملکۂ وکٹوریہ کی سوانح حیات اور شہر لندن کے مضمون میں ملکۂ وکٹوریہ کے حالات، لندن شہر کا ذکر اس کی قدامت اور اس کے موجودہ حالات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لندن شہر زمانہ قبل مسیح سے آباد ہے۔ ان کے عہد میں دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے اور اس کی آبادی تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ اس کا طول بیس میل اور عرض دس بارہ میل ہے۔[۸]

سرسیّد نے تاریخ کے سلسلے میں 'جام جم' فارسی زبان میں تحریر کی تھی۔ اس میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک مختلف خاندانوں کے پینتالیس بادشاہوں کے حالات اختصار کے ساتھ ۱۷ افسانوں کے جدول نما فہرست کی شکل میں تحریر کئے تھے۔[۹] یہ ۱۸۴۰ء میں چھپا۔

سرسیّد نے دلی میں اپنے زمانۂ منصفی میں مولانا صہبائی[۱۰] کی مدد سے دلّی کی عمارتوں اور اپنے عہد کے اہل کمالات کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اور

اس کتاب جس میں ۵۹۶ صفحے ہیں کا نام آثار الصّنادید رکھا۔ کتاب چار ابواب میں تقسیم ہے پہلے باب میں شہر کے باہر کی عمارتوں کا ذکر ہے۔

دوسرے باب میں قلعۂ معلّٰی کی عمارتوں کا بیان ہے۔ اس میں ۳۲ کتبے اور نقشے درج ہیں تیسرا باب خاص شہر شاہ جہاں آباد کے حال میں ہے۔ اس میں ۷۰ حویلیوں، مندروں، مساجد، باؤلیوں، کنوؤں اور بازاروں کا ذکر ہے۔ اس میں قلعوں شہروں اور محلوں کا تذکرہ بھی ہے۔ اس کا چہارم باب سب سے اہم ہے جس میں دلّی اور دلّی کے لوگوں کا بیان ہے۔ سب سے پہلے دلّی شہر کی وجہ تسمیہ، ناموں اندر پرست اور دلّی کا ذکر ہے۔ دلی میں آباد ۱۸ مشائخ و کبار ۴ رسول شاہی صوفیاء ۹ معذوروں ۱۲ اطباء، ۲۷ علماء دین، ۵ قراء و حفّاظ، ۱۱ خوشنویسوں، مصوّروں، ۱۷ شعراء اور ۹ موسیقاروں کے نام ہیں۔ یہ نہایت مختصر ہیں۔ مگر چونکہ بیشتر حالات معاصر اطلاعات پر مبنی ہیں انھیں نہایت اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ تذکروں میں مجذوبوں، مصوروں، قراء و حفاظ اور باب موسیقی کے بیان کے لئے آثار الصّنادید، واحد ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مشہور فرانسیسی محقق اردو کارسن دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا اور اس کی بنا پر سرسید کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی فیلوشپ ملی۔[۱۱]

سرسید کی تصنیف 'سلسلۃ الملوک' میں ابتدا میں دنیا کی عمر اور تخلیق عالم کی بحث ہے۔ ۱۸۵۲ء میں ایسے ۲۰۰ حکمرانوں کی فہرست شائع کی جنھوں نے دلی پر آریاؤں کے عہد سے زمانۂ تالیف کتاب تک حکومت کی[۱۲] ۱۸۵۷ء میں سرسید نے ضلع بجنور کے صدر امینی کے زمانہ میں ضلع بجنور کی انتہائی مبسوط تاریخ تیار کی۔ جس کے مواد حکام ضلع کی جانب سے بہم پہنچائے گئے تھے حالانہ اس میں ضلع کے عام حالات کے سوا کوئی اور قابلِ ذکر بات نہیں تھی۔ لیکن یہ تاریخی کتاب ''تاریخِ بجنور'' ہنگامہ غدر کی نذر ہوگئی۔[۱۳]

سرسید ۱۸۵۸ء میں مراد آباد کے صدر الصدور ہوکر گئے تو انھوں نے وہاں 'تاریخِ سرکشی بجنور' قلمبند کی۔ جو تقریباً ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ابتداء میں غدر کے حالات و واقعات کا بیان ہے پھر غدر کے بجنور تک پھیلنے، گوجروں کے فساد، ضلع کی انتظامی تدبیر، مراد آباد کے جیل خانے کے ٹوٹنے، برم پور کے لٹنے، ۲۹ پلٹن کے سہارنپور سے بجنور آمد، بجنور ہندو چودھریوں کے حملے اور نواب محمود خاں سے ان کی جنگوں کا تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے، جس سے اس فوج کے پانچ مراکز کا علم ہوتا ہے کہ ۱۵ سالار، ۱۹ رسالہ دار اور ۱۵۲۶ سوار تھے۔ اور فوج پیادہ کی تعداد ۱۲۵۵۰ تھی۔ اس فوج کے پاس ۳۰ توپیں تھیں۔ مضمون کے آخر میں بجنور پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کی تفصیل دی گئی ہے۔[۱۴]

دستاویزات کی مدد سے بیانات کی توثیق کے طریقے سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات و واقعات کا ذکر ہے۔[۱۵]

۱۸۵۷ء کی بغاوت سے متعلق سرسید نے ایک رسالہ مطبع مفصلت گزٹ آگرہ سے ۱۸۵۹ء میں چھپوا کر وزیر ہند کو لندن روانہ کیا۔ چونکہ اس رسالہ کی تقریباً تمام جلدیں لندن بھیج دی گئی تھیں۔ اس لئے 'حیات جاوید' کی اشاعت کے موقع پر مولانا حالی نے اسے کتاب کے ضمیمے کے طور پر آخر میں شامل کر دیا۔ سب سے پہلے سرکشی کی تعریف اور اس کے تمام اقسام بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ بتایا ہے کہ سرکشی یا بغاوت کسی ایک وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے سرکشی کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے۔[۱۶]

سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب 'OUR INDIAN MUSALMAN' میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمان انگریزوں سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ سرسید نے یہ محسوس کیا کہ ہنٹر کے اس مضمون سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔ اس لئے انھوں نے اس نہایت مدلّل جواب تحریر کیا جو اس زمانہ کے مشہور انگریزی روزنامہ 'PIONER' الہ آباد میں بالاقساط شائع ہوا۔[۱۷]

غدر ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی تباہی سے لے کر قیام مدرسہ العلوم اور اس کی درجہ بدرجہ ترقیوں اور دیگر مسائل کا تزکرہ جس میں ۱۸۸۱ء کے بعد تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں 'مجلس ترقی ادب لاہور' کے شائع کردہ 'مقالات سرسید' کی جلد ۱۲ میں شامل ہے۔ یہ مضمون مدرسۃ العلوم کی تاریخ کا ایک اہم دستاویز ہے۔

سرسید نے تاریخ اقوام و اشخاص قرآن کے سلسلے میں مختصر تاریخ مذہب عیسوی، ترمیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم، ازالۃ الفین عن ذی القرنین،

کالڈیا کی نظم میں طوفان (نوح) کا ذکر، حقیقت خضر، عرب بتوں کے نام اوران کے حالات پر مضامین لکھے۔ جس میں بدرجہ مذہب عیسوی کی تاریخی حیثیت، اصحابِ کہف اور رقیم کی شخصیت، طوفان نوح کی نوعیت کے متعلق نظم، خضر در حقیقت کون تھے اور عرب میں ۴۲ بتوں کی پرستش اور ۳۵ بتوں کے نام مذکور ہیں۔ ۱۸ سر ولیم میور لفٹیننٹ گورنر صوبہ شمال مغربی کی کتاب 'LIFE OF MUHAMMAD' کے جواب میں سرسید نے 'خطبات احمدیہ' تحریر کی۔ اسی مقصد سے انھوں نے سفر لندن کا قصد کیا تھا۔ انھوں نے ۱۲ خطبات لکھے۔ ایک انگریز نے ان کا ترجمہ کر کے ۱۸۷۰ء میں لندن سے شائع کیا۔ اسلام کی اشاعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح کی۔ خلافت مضمون میں خلفائے ترک کی حیثیت پر بحث، خلافت کے مفہوم اور خلیفہ کی مذہبی حیثیت کی وضاحت اور خلافت کی وجہ سے ترکوں کو دوسری مسلم اقوام پر کسی قسم کا نفوق حاصل نہیں ہے کہ ان سے اسلامیانِ ہند لازماً محبت کریں۔ ۱۹

اس کے علاوہ سرسید نے عقیدہ آمد مہدی آخر الزماں وغیرہ کا ذکر ہے۔ واقعاتی اور تاریخی پہلو پر مضمون لکھا جو تہذیب الاخلاق بابت شعبان ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں یہ مضمون شائع ہوا۔ اسی طرح سرسید نے اپنی وفات سے ایک ماہ قبل فروری ۱۸۹۸ء میں اسلامی سلطنت کے زوال، عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا تھا جو ایک نامکمل مضمون ہے، جسے ان کی رحلت کے بعد مولوی وحید الدین نے علی گڑھ سے رسالہ 'معارف' میں جاری کیا تو اس میں شائع ہوا تھا۔ سرسید نے آخری مضمون اپنی وفات سے دو ہفتے قبل ۱۱ مارچ ۱۸۹۸ء کو ایک دیسی عیسائی پادری کی تردید میں شائع کیا۔

سرسید کے سفرنامے تحریر کئے جوان کے تاریخی سرمایہ سے کم نہیں ہیں۔ مسافران لندن، میں سرسید نے ۱۱ اپریل ۱۸۶۹ء تا ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۰ء میں اپنے لندن کے سفر کے احوال اول بالاقساط 'تہذیب الاخلاق' میں شائع کئے پھر انھیں ایک علیحدہ کتابی شکل میں چھاپ دیا۔ 'تہذیب الاخلاق' کے جلد دوم میں ایک انگریز رابرٹ شا کے سفرنامے کا ترجمہ 'مسلمانِ یارقند' کے عنوان سے شائع کیا، جس نے حکومتِ ہند کے حسب الحکم ۱۸۶۸ء میں یارقند کا سفر کیا تھا۔ اس مضمون میں یارقند کے مسلمان حاکم اور شہر کے دلچسپ حالات تحریر کئے ہیں مثلاً یہ کہ وہاں ذمّیوں کو حکم ہے کہ وہ پگڑی نہ باندھیں اور کمر میں سیاہ ڈوری باندھیں رہا کریں۔ ۲۰

قلم کے میدان میں ان سب تاریخی کارناموں کو سرانجام دینے کے علاوہ سرسیّد نے عہد اسلامی کی دو اہم تاریخیں جو مآخذ اول ہیں ان کی تصحیح کی جن میں ابو الفضل علاّمی کی 'آئین اکبری' اور ضیاء الدین برنی کی 'تاریخ فیروز شاہی' قابلِ ذکر ہیں۔ ان کو ایڈٹ کرنے میں سرسید نے تحقیق و جستجو سے کام لیا۔ 'آئین اکبری' کی پہلی اور تیسری جلد ۱۲۷۲ء (۵۶۔۱۸۵۵ء) میں طبع ہوئی تھی۔ دوسری جلد میں آئین خراج سے متعلق کچھ اور تحقیق ضروری تھی جسے سرسید نے بڑی محنت سے سرانجام دیا۔ مگر جب مسودہ چھپنے کے لئے دہلی پہنچا تو ۱۸۵۷ء کے واقعات رونما ہوئے۔ اور اس جلد کا جو حصہ چھپ گیا تھا وہ اور مسودہ اس ہنگامہ کی نذر ہوئے۔ سرسید نے آئین سلطنت کے متعلق تمام سامان، تزک واحتشام، فیل خانہ اور ہاتھیوں کی پورش کے مرقع بھی بنوا کر کتاب میں اضافہ کیا۔ نیز ملک میں پیدا ہونے والے پھول دار درختوں کی تصویریں بھی ان کے بیانات کے ساتھ ساتھ بڑھائی گئیں۔ آئین کے مسودوں کی بربادی کے بعد سرسید کو اس کے لئے وقت نہیں ملا۔ ۲۱

۱۸۶۲ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال سے ضیاء الدین برنی کی تاریخِ فیروز شاہی شائع ہوئی۔ وہ سرسید کی ایڈٹ کی ہوئی ہے۔ سرسید نے اس کی تصحیح میں متعدد قلمی نسخوں سے مدد لی جن میں ایک نسخہ دلّی کے شاہی کتب خانہ کا دوسرا سر ایلیٹ کا جو تاریخ ہند کی تالیف کے وقت ان کے پیشِ نظر تھا۔ تیسرا ایڈورڈ تھامس کا اور چوتھا نسخہ بنارس کا تھا۔ تصحیح کے وقت سرسید نے اس کا ایک دیباچہ بھی لکھا۔ جس میں انھوں نے تمام تاریخی کتابوں کا تذکرہ کیا جو برنی سے پہلے سلاطین ہند کے حالات میں لکھی گئیں اور خصوصاً فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت کے بارے میں برنی کے بعد یا اس کے زمانہ میں تحریر کی گئیں۔ یہ دیباچہ سائنٹیفک سوسائٹی کے اخبار کی جلد اول ہی چھپا۔ ۲۲ یہ اخبار ۱۸۶۶ء سے ۱۸۹۸ء تک جاری رہا۔

ان سب تحریروں کے علاوہ سرسید کا ایک مضمون جس کا عنوان 'تہذیب اور اس کی تاریخ اور افعال انسانی کے باقاعدہ ہونے کا ثبوت' ہے، ہنری تھامس بکل کی کتاب History of Civization کے ایک اہم حصہ کا اردو میں ترجمہ ہے۔ اس میں سرسید کے مقدمہ کے ساتھ تہذیب الاخلاق جلد ۵ شمارہ نمبر ۱۳ بابت شوال ۱۲۹۱ھ ۱۸۷۵ء میں چھپا۔ ۲۳

اس مختصر سے تحقیقی مقالے میں سرسید احمد خاں کے تاریخ کے میدان میں ان کے تحقیقی اور تالیفی کاوشوں کو منظر عام پر لانے کی ادنیٰ کوشش کی ہے۔ بلا شبہ سرسید احمد خاں ایک بے باک مورخ تھے جو دلائل و براہین سے کام لے کر عوام الناس کو حقیقت سے روشناس کراتے ہیں۔ انھوں نے اپنے رفقاء کو بھی اسی

راستے پر چلایا اور انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں اردو میں جدید تاریخ نویسی کی بنیاد ڈالی۔ ان کے مقالات، مضامین، تصنیفات اور رسائل ان کی مورخانہ بصیرت کے ثبوت ہیں۔ جن کی اہمیت وافادیت رہتی دنیا تک محققین کے لئے انتہائی گراں قدر خزانہ ثابت ہوتے رہیں گے۔

حواشی:

۱۔ نامعلوم مصنف 'علم تاریخ کی تعریف' ص ۲۔۱

۲۔ http://www.urdumajlis.net

۳۔ شبلی نعمانی، المامون، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۸۷ء، ص ۴

۴۔ شبلی نعمانی، دیباچہ المامون، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۸۷ء، ص ۲

۵۔ مقالات سرسید، مرتبہ محمد عبداللہ خان خویشگی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۲ء، جلد ۷، ص ۶، ۳۰

۶۔ ایضاً ص ۳۱۔۳۵

۷۔ خواجہ الطاف حسین حالی، 'حیات جاوید' مطبوعہ، مطبع نامی، کانپور ۱۹۰۱ء، جلد ا ص ۲۴

۸۔ مقالاتِ سرسید مرتبہ محمد عبداللہ خان خویشگی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء جلد ۱۲، ص ۱۰۶۔۱۱۶

۹۔ ایضاً جلد ا، ص ۴۹۔۵۰

۱۰۔ امام بخش صہبائی شہید ۱۸۵۷ء

۱۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی، 'حیات جاوید' مطبوعہ، مطبع نامی، کانپور ۱۹۰۱ء، جلد ا، ص ۵۶

۱۲۔ سرسید احمد خان، آثار الصنادید، منشی کنول کشور لکھنؤ، ۱۸۹۵ء، باب چہارم، ص ۲

۱۳۔ مولانا حالی 'آب حیات' مطبوعہ نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء، جلد ا، ص ۶۰۔۶۲

۱۴۔ مقالاتِ سرسید، مرتبہ محمد عبداللہ خان خویشگی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، جلد ۶، ص ۲۷۲۔۴۵۲

۱۵۔ شان محمد، 'سید تاریخی وسیاسی آئینے میں' مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۷ء، ص ۲۳۹۔۲۴۰

۱۶۔ ضمیمہ حیاتِ جاوید، ص ۱۶۔۱۷

۱۷۔ محمد حسین آزاد، آبِ حیات، جلد ا، مفید عام پریس لاہور، ۱۸۸۷ء، ص ۸۲

۱۸۔ مقالاتِ سرسید، مرتبہ محمد عبداللہ خان خویشگی، جلد ۴، ص ۱۰۶۔۱۲۰

۱۹۔ ایضاً جلد ا، ص ۱۶۴۔۱۰۶۹

۲۰۔ مقالاتِ سرسید، مرتبہ محمد عبداللہ خان خویشگی، جلد ۴، ص ۲۳۲۔۲۶۲

۲۱۔ آبِ حیات، جلد ا، ص ۶۲۔۶۶

۲۲۔ حیاتِ جاوید، جلد ا، ص ۱۰۷۔۱۰۸

۲۳۔ مجلّہ اردو کالج کراچی، انجمن پریس کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۱۵۶

سرسید کی نثر نگاری

انیسویں صدی ہندوستانی قوم اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے بربادی، مایوسی، پسماندگی، بے بسی، لاچاری اور حزن وملال سے عبارت ہے۔ ایک طرف کمپنی بہادر کا چڑھتا سورج مسلم قوم کو اپنے ظلم واستبداد سے جھلسا رہا تھا، تو دوسری طرف سلطنت کا رویہ زوال آفتاب انہیں قعر مذلت کے اندھیروں میں ڈھکیل رہا تھا۔ مزید برآں مسلمان تمام تر پیش آمدہ حالات سے بے بہرہ آنکھیں موندے اپنی خرمستیوں گم تھے۔ تعلیم، سیاست، معیشت اور معاشرت کے میدانوں میں ترقی سے دور مسلمان مغلیہ دور کی عیاشیوں میں مصروف تھے۔ امراء طوائفوں کے کوٹھے آباد کر رہے تھے تو عوام الناس کی توجہ مرغوں کی لڑائی، کبوتر بازی اور شطرنج کی چالوں پر مرکوز تھی۔

ایسی بدحالی میں جن جیالوں نے امت کی ہچکولے کھاتی کشتی کو کنارے لگانے کی کوشش کی اور ذلت وپستی سے نکال کر عظمت ورفعت پر پہنچانے کا بیڑا اٹھایا، ان میں سرفہرست سرسید احمد خاں کا نام آتا ہے۔ یوں تو سرسید کا اصل مشن مسلمانوں کی تعلیمی ترقی تھا، البتہ انہوں نے کئی میدانوں میں بیک وقت کام کیا۔ سیاست، مذہب، صحافت، ادب، اخلاق اور اصلاح حال جیسے مختلف میدانوں میں سرسید نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، جن کو بیان کرنے کے واسطے الگ الگ دفتر چاہئے۔ اس مختصر مضمون میں ہم صرف سرسید کی نثر نگاری اور طرز تحریر پر خامہ فرسائی کریں گے۔ اور کوشش کریں گے کہ قارئین کے سامنے سرسید کے طرز تحریر ونثر نگاری کی خصوصیات وامتیازات واضح طور پر پیش کرسکیں۔

سرسید نے جس دور میں آنکھیں کھولیں اس دور میں نثر نگاری مسجع ومقفیٰ عبارتوں کے تنگ دائرے میں محصور تھی، قافیہ کی پابندی، غیر ضروری استعارات و تشبیہات اور گرانبار جملوں سے بوجھل نثر، نظم کے مماثل تھی، فرق صرف اتنا تھا کہ نظم میں بحر وعروض کی پابندی کی جاتی تھی اور نثر میں نہیں۔ دراصل اس دور کے نثری اسلوب پر داستانوی رنگ چھایا ہوا تھا، باغ وبہار اور آرائش محفل جیسی کتابیں فقط نشاط خاطر کا ہی ذریعہ سمجھی جاتی تھیں۔ انسان ان کتابوں کو پڑھنا اور ایک خیالی دنیا میں گم ہوکر مصائب روزگار سے جزوقتی بے خبر ہوجاتا، البتہ کسی بھی طرح کے علمی یا فکری فائدے سے محروم ہی رہتا تھا کہ اس طرح کی کتابوں کا مقصد علمی یا فکری فائدہ پہنچانا تھا ہی نہیں۔

درحقیقت اس دور کی اردو زبان کافی حد تک عربی اور فارسی پر منحصر تھی، عربی علماء کی زبان ہوا کرتی تھی اور فارسی سرکاری ودرباری زبان۔ چنانچہ اردو کے قلم کار طبعی طور پر ان دونوں زبانوں سے متاثر ہوکر انہی کے الفاظ اور پیرایۂ بیان اختیار کرتے۔ اس پر مستزاد اپنی زبان کو پرشکوہ اور بارعب بنانے کے لئے پرتکلف اسلوب، بھاری بھرکم الفاظ، نامانوس تعبیرات اور خیالی تشبیہات کا سہارا لیتے تھے، نتیجتاً اس دور کی نثر گنجلک اور عام قاری کے فہم سے ماوراء تھی۔

سرسید نے ہوش سنبھالا تو اردو زبان کو ایسا ہی مسجع ومقفیٰ اور بوجھل پایا اور وہی روش اختیار کی جو اوروں کی تھی۔ چنانچہ سرسید کے ابتدائی دور کی تصانیف اسی قدیم گنجلک اسلوب وپیرایہ میں سامنے آئیں۔ جام جم (سن اشاعت 1840)، جلاء القلوب (سن اشاعت 1842)، فوائد الافکار (سن اشاعت 1846) اور دیگر بہت سی تصانیف قدیم رنگ وآہنگ کی پابند ہیں۔ حتیٰ کہ سرسید کی مشہور ترین تصنیف آثار الصنادید بھی اسی پرانے طرز پر لکھی گئی تھی۔ قدیم اسلوب میں سرسید کی تحریر کردہ کتابوں کا تذکرہ اسماعیل پانی پتی اس طرح کرتے ہیں:

> ”جس دور میں انہوں نے آنکھ کھولی تھی اس وقت ادب اور زبان مسجع اور مقفیٰ عبارت کی حکومت تھی۔ دوراز کار تشبیہیں، مبالغہ آمیز تحریریں، مشکل فقرے، ادق محاورے مضمون نگاری اور ادبیت کی شان سمجھے جاتے تھے اور ان پر فخر کیا جاتا تھا۔ سرسید بھی اس وقت اسی رنگ میں رنگین تھے۔ اس وقت تک عام روش سے ہٹ کر انہوں نے اپنا علاحدہ رستہ نہیں بنایا تھا۔ جلاء القلوب، آثار الصنادید اور سلسلۃ الملوک ان کی اسی وقت کی یادگار ہیں۔ سرسید کی طرز قدیم کے نگارش سے بہت سے عمدہ نمونے ان مقالات اور کتابوں میں آسانی سے مل سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جلد ہی اس طرز نگارش سے اکتا گئے۔ جس کو انہوں نے اس وقت کے ماحول کے مطابق شوق کے ساتھ شروع کیا تھا۔ اب انہوں نے سادہ، صاف اور

عبدالواسع ندوی، لیکچرار ذکریٰ انٹرنیشنل کالج، مالدیپ

آسان عبارت میں اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنا شروع کیا۔ یہ اسلوب غالباً 1857 کے بعد اختیار کیا اور بالآخر اس طرز تحریر کے موجد اور بانی ہوئے جو آج تک رائج ہے۔''[1]

جیسا کہ اسماعیل پانی پتی مرحوم نے لکھا کہ سرسید ابتدا میں قدیم اسلوب کے مقلد تھے، لیکن 1857 کے بعد ان کے اسلوب میں نمایاں تبدیلی محسوس کی گئی۔ یا یوں کہئے کہ 1857 سے قبل ہی یہ تبدیلی آنا شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ قدیم اسلوب میں تحریر کردہ آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن 1847 میں سامنے آیا۔ دوسرا ایڈیشن 1854 میں شائع ہوا تو سرسید نے کتابت کے اسلوب، زبان و بیان اور مواد میں بھی کافی حد تک اصلاح اور ترمیم کی، اسلوب کو سادہ بنایا اور بہت سا مواد حذف کیا۔ قدیم اور جدید ایڈیشن کے اس فرق کو الطاف حسین حالی یوں بیان کرتے ہیں:

''بڑی خوبی اس نئے ایڈیشن میں یہ ہے کہ اس کی عبارت بہ نسبت پہلے ایڈیشن کے نہایت سادہ ہے اور اس کا بیان ایشیائی مبالغوں اور تکلفات بارده سے بالکل پاک ہے۔''[2]

اس کی اس تبدیلی کے مدنظر کہا جا سکتا ہے کہ سرسید ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو زبان کو معنویت دی، افکار کا جامہ پہنایا، زبان کو عام فہم اور طرز بیان کو سادہ بنایا، مزید یہ کہ انہوں نے مروجہ تقلیدی اسلوب کو ہی خیر آباد کہا، بلکہ عام قواعد سے بھی کنارہ کش اختیار کی۔ سرسید اپنے اسلوب کے متعلق خود لکھتے ہیں:

''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کو علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ دوستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیال سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی میں رہتی ہے اور دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانہ میں مقفی عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا، جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل ہی میں بیٹھے۔''[3]

سرسید کے اسلوب کی اسی سادگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر سعود عالم قاسمی لکھتے ہیں:

''سرسید کا اسلوب نثر رنگین نہیں سادہ اور دلنشیں ہے۔ اس میں شوخی کم سنجیدگی اور شائستگی زیادہ ہے ابہام اور ژولیدہ بیانی نہیں ہے بلکہ سلاست اور روانی ہے، لفاظی سے کوئی واسطہ نہیں، خیال کی بلندی اور اظہار کی بے تکلفی ہے۔ بے تکلفی بھی ایسی کہ ان کی تحریر کو پڑھنے والا یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ ان کا قاری نہیں بلکہ ہم نشیں ہے۔ محاکات اور عوامی محاورات کے سہارے قاری کے قلب و ذہن میں اپنے خیالات کو اتارنے کا سلیقہ سرسید کی نثر میں ہے۔ جو شخص بھی اپنے پیغام کی افادیت پر نظر رکھے گا اور اس کی ترسیل کے لئے سنجیدہ ہوگا وہ اسی طرز تحریر کو موزوں سمجھے گا۔ اسی لئے علامہ شبلی نعمانی نے انشاء پردازی کے جدید اسلوب کا امام اور جد امجد سرسید کو قرار دیا ہے۔''[4]

اسلوب کی سادگی اور طرز ادا کی بے تکلفی کے باوصف سرسید نے متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا۔ تاریخ، مذہب، سماج، سیاست، قانون، معیشت، سائنس، تعلیم، اصلاح حال، ادب، سیاحت، تنقید ہر طرح کے موضوع پر لکھا اور خوب لکھا۔ اور جس موضوع پر بھی لکھا طرز و آہنگ اسی کے موافق اختیار کیا۔ اسی لئے قاری سرسید کی تحریروں میں کبھی استدلالی طرز سے روبرو ہوتا ہے تو کبھی تاثراتی و محاکاتی اسلوب سے کہیں آہنگ خطیبانہ پاتا ہے تو کہیں متکلمانہ، کہیں انداز تجزیاتی ملتا ہے تو کہیں ناقدانہ۔ موضوعات کے مطابق اسلوب کے تنوع کو حالی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''سرسید کے یہاں ہر مقام کے مقتضا کے موافق ان کی تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے۔ اگر ان کے علمی و تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ جیسی روانی ہے تو مذہبی اور پولیٹیکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیزانی کا ساز ور۔ اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے اور بے دلیل دعووں کے مقابلے میں ظرافت، خوش طبعی نصیحتیں، نشتر سے زیادہ پر لطف ہے۔ وہی قلم

خواخلاق کے بیان میں ایک ناصح مشفق کے ہاتھ میں نظر آتا ہے وہ عدالت کے فیصلوں میں ایک کہنہ جج کے ہاتھ میں دکھائی دیتا ہے۔اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں کی روئدادوں میں ایک تجربہ کار سکریٹری کے ہاتھ میں معلوم ہوتا ہے۔"[۵]

مقصدیت، جذبات پر عقل کی بالادستی، منطقیت، بے تکلف عرض مدعا، سادہ بیانی، یہ وہ عناصر ہیں جو سرسید کی تحریروں میں غالب نظر آتے ہیں۔اور انہی کے سبب بسا اوقات قاری ان تحریروں میں کوئی کشش اور دلچسپی نہیں پاتا بلکہ یہ تحریریں کھردری اور سپاٹ نظر آتی ہیں، لیکن جوش بیان، طرز ادا کی بے ساختگی، قوت استدلال اور سلاست و روانی میں یہ کمی دب جاتی ہے اور سرسید اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سرسید کو اردو نثر نگاری کو سہل بنانے، علمی اور منطقی طرز دینے اور عام فہم بنانے میں اولیت حاصل ہے اور وہ جدید اردو نثر نگاری وانشاء پردازی کے باوا آدم ہیں۔سرسید کے طرز تحریر اور نثر نگاری کو اگر مختصراً بیان کرنا ہو تو تاریخ اردو ادب کے مصنف رام بابو سکسینہ کے ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

یقیناً سید صاحب اردو جرائد نگاروں میں ایک بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں، ان کا قلم بہت زبردست، ان کا تبحر علمی بہت اعلیٰ تھا۔ان کا طرز تحریر زوردار مگر صاف اور سادہ ہے۔اس میں کسی قسم کی عبارت آرائی نہیں ہے۔کچھ غلطیاں بھی اس میں نکلیں گی مگر سید صاحب قواعد صرف ونحو کی پابندی کے مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے۔مگر یہی چیز ان کی شہرت اور قابلیت کو نقصان پہنچانے کے بجائے اس میں اور اضافہ کرتی تھی۔ان کے طرز جدید نے قدیم تصنع نگاری پر جو بیدل اور ظہوری کی فارسی کی تقلید میں اردو میں بھی برتی جاتی تھی ایک ضرب کاری لگائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں تصنع سے زیادہ خوبیاں ہیں۔"مضمون کو دیکھو اور عبارت آرائی سے غرض نہ رکھو" پر سید صاحب کا عمل تھا اور حقیقت میں یہی حال ان کی تمام تحریروں کا ہے۔ان کی عبارت ان کے ادائے مطالب میں کبھی قاصر نہیں ہوئی۔ان کو زبان پر عبور حاصل ہے۔نیز اردو لکھنے میں وہ ایسے مشاق تھے کہ کان کے بیش تر کوئی ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔"[۶]

☆☆☆

حوالہ جات:

[۱] محمد اسماعیل پانی پتی، مقالات سرسید، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ، 2022، جلد اول، مقدمہ، ص 22

[۲] سید احمد، آثار الصنادید، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ، 2007، ص 16

[۳] تہذیب الاخلاق، یکم شوال، 1292ھ

[۴] تہذیب الاخلاق، اکتوبر، 2022، ص 22

[۵] ڈاکٹر مشتاق احمد، سرسید کی نثری خدمات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2005، ص 122

[۶] رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، نئی دہلی، 2000، ص 442

مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' تاثراتی جائزہ

سرسید احمد خاں کا شمار عہد آفریں شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے عہد سے متاثر ہوئے بلکہ اپنے مذہبی، تہذیبی، ادبی، تعلیمی اور معاشرتی افکار سے اپنے عہد کو متاثر کیا اور مختلف شعبوں پر اپنی چھاپ چھوڑی۔

اردو ادب میں مضمون نگاری کا بانی سرسید کو ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ صنف انگریزی ادب سے اردو ادب میں آئی۔ بیکن اور ڈرائڈن دو ایسے نام ہیں جن کا شمار انگلستان میں مضمون نگاری کی صنف کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ بعد میں ایڈیسن اور اسٹیل نے اس صنف کو فروغ دیا۔ سرسید جب انگلستان گئے تو وہاں انھوں نے 'اسپکٹیٹر' اور 'ٹیٹلر' جیسے رسالوں کا مطالعہ کیا۔ سرسید نے اسٹیل اور ایڈیسن کے ان رسالوں سے استفادہ کیا اور وطن واپسی پر انھوں نے اسی طرز کا ایک رسالہ نکالا جس کا نام 'تہذیب الاخلاق' رکھا۔ اس رسالے سے ہی اردو ادب میں صنف مضمون نگاری کا آغاز ہوا۔ تہذیب الاخلاق نے مضمون نگاری کے فن کو فروغ دیا جس کے سبب مضمون لکھنے کا چلن عام ہوا۔ حالانکہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والے بیشتر مضامین کو مضمون نگاری کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ مضمون نگاری کی فنی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ تہذیب الاخلاق میں سیاسی، مذہبی، معاشرتی، اخلاقی، اصلاحی غرض ہر طرح کے موضوعات پر مضامین شائع کئے جاتے تھے۔

مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' سرسید کے لکھے گئے مضامین میں سے ایک ہے جس کا شمار سرسید کے خاص چنیدہ مضمون میں ہوتا ہے۔ اس مضمون کو اردو ادب کے کلاسکی نمونوں میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ''گزرا ہوا زمانہ'' میں سرسید نے زندگی کی ایک مجرد حقیقت کو تمثیلی پیرائے میں کہانی اور واقعہ بنا کر پیش کیا ہے۔ مضمون کی ابتداء رات کے اندھرے کے ہیبت ناک منظر نگاری سے ہوتی ہے۔ ایک بوڑھا شخص اپنے اندھیرے گھر میں گزرتے برس کی آخرہ رات کو خوفزدہ اور غمگین حالت میں اپنے ماضی کو یاد کر رہا ہے۔ وہ ماضی جو بہت دلفریب تھا اور جس کی یاد اس کے دل میں ایک ساتھ مسرت اور غم کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ ان گزرے ہوئے لمحات کو یاد کر کے اس کا دل غم سے لبریز ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں جو اس بات کی علامت ہیں کہ وقت کتنی قیمتی شے ہے۔ وقت کی اہمیت سرسید مضمون میں اس بوڑھے شخص کی زبان سے ان الفاظ میں ادا کراتے ہیں:

''ہائے وقت، ہائے وقت! گزرے ہوئے زمانے! افسوس کہ میں تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔''

(انتخاب مضامین سرسید۔ انور صدیقی ص ۷۱۔۷۰)

دراصل سرسید بوڑھے شخص کے ذریعہ ادا ہوئے ان الفاظ سے اپنے عہد کی نوجوان نسل کو وقت کی اہمیت بتانا چاہتے ہیں کہ ابھی بھی وقت کی ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اٹھو، جاگو اور اپنے کارہائے نمایاں سے اپنے حالات کو تبدیل کر کے ملک اور قوم کی بھلائی میں اپنا رول ادا کرو۔

سرسید ایک عملی دانشور تھے اور نسانی نفسیات سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ وہ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ رہے تھے کہ اگر نوجوان قوم عیش و آرام اور دنیاوی آسائشوں میں الجھ گئی تو وہ اپنے ان قیمتی لمحات کو ضائع کر دیگی۔ اپنی فارغ البالی کے اوقات میں بھی وہ وقت کی اہمیت کو نہیں سمجھیں گے اور یہ سوچتے رہیں گے کہ ابھی ان کے پاس بہت وقت ہے۔ انسانی نفسیات کے اس پہلو کو سرسید بوڑھے کی گزری ہوئی زندگی کے آئینے میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

''پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت امنگ میں بھرا ہوا دل، جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خداپرستی کی بات بتاتے اور یہ کہتا تھا کہ ''آہ ابھی بہت وقت ہے'' اور بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خداپرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا! آہ وقت گزر گیا! اب

ڈاکٹر عارفہ بیگم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ایس۔ ایس کھنا گرلس ڈگری کالج، الہ آباد

پچھتائے کیا ہوتا ہے۔افسوس میں نے آپ اپنے تیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ 'ابھی وقت بہت ہے۔''

(انتخاب مضامین سرسید۔انور صدیقی ص ۷۱)

بوڑھا شخص اپنی زندگی کے وہ قیمتی لمحات جو گزر چکے ہیں ان کی یاد میں پچھتا رہا ہے اور یہ سوچ رہا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کیوں نیک کاموں اور دوسروں کی بھلائی میں صرف نہیں کی۔سرسید بوڑھے کے کردار کے ذریعے دراصل قوم کے نوجوانوں کو ترغیب دینے کی کوشش کرتے ہیں اور قوم کے نوجوانوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ تمہارے پاس ابھی وہ قیمتی وقت موجود ہے اور اس کا استعمال تم قومی ترقی اور بھلائی اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے کرو۔کیونکہ وقت ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسلتا جاتا ہے۔زندگی کے تمام کام انسان اپنی ذاتی غرض کو پورا کرنے کے لئے کرتا ہے لیکن ہمارا وہ ہی عمل کارآمد ہوتا ہے جو قوم کی بھلائی کے لئے کیا جاتا ہے۔گزرے لمحات کبھی واپس نہیں آتے۔پھر انسان صرف ماضی کے ان سنہریں لمحات کو ہی یاد کرتا رہ جاتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اگر مجھ کو وہ وقت پھر حاصل ہو جائے تو اسے میں نیک عمل کے لئے استعمال کروں گا۔

مضمون ہماری سوچ کے برعکس اینٹی کلائمکس پر ختم ہوتا ہے کیونکہ یہ سارے واقعات اور مناظر ایک بچے کے خواب میں رونما ہوتے ہیں اور جب بچہ خواب سے بیدار ہوتا ہے تو اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔میں کبھی اس بوڑھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔''

(انتخاب مضامین سرسید۔انور صدیقی ص ۷۵)

ان جملوں کے ساتھ مضمون اختتام پزیر ہوتا ہے۔مضمون کے خاتمے کے ساتھ سرسید اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں اور وہ مقصد تھا نوجوان ہم وطنوں کو وقت کی اہمیت کا احساس دلانا تاکہ کوئی بھی اپنی زندگی کے قیمتی وقت کو ضائع کرنے کے بعد اس بوڑھے کی طرح نہ پچھتائے اور اپنی زندگی کو کارآمد بنائے۔

اس مضمون میں سرسید نے تخیل کی مدد سے بہترین تصویر کشی کی ہے جو مضمون کے مرکزی کردار کے اردگرد کے ماحول سے تیار کی ہیں جو ایک اچھے مضمون کی خوبی ہے۔مضمون کا ایک بہترین وصف اس کا اختصار ہے،اس مضمون میں یہ خوبی موجود ہے۔چونکہ یہ مضمون سرسید نے منصوبہ بندی کر کے تحریر کیا۔چنانچہ بعض جگہ اتنی سنجیدگی آ گئی ہے کہ کچھ جگہ ان کی حیثیت مصلح قوم کی شکل میں ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔قوم کی اصلاح چونکہ سرسید کا مقصد تھا چنانچہ بعض جگہ پر ان کے تصورات اور مقصدیت کا غلبہ نظر آتا ہے۔چونکہ سرسید کے سامنے علم سے محروم خوابیدہ قوم تھی اور سرسید اس سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔انھوں نے اپنے مقصد کو مضمون میں فوقیت دی۔شائستہ اور شستہ اسلوب اس مضمون کی خوبی ہے۔چند خامیوں کے باوجود سرسید کا یہ مضمون اردو کے کلاسکی نمونوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔سرسید نے مضمون نگاری کی صنف کو شعوری طور پر اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے اختیار کیا تھا اور بہترین مضامین پیش کر کے آگے آنے والے مضمون نگاروں کے لئے راہ ہموار کی۔

☆☆☆

حواشی

۱ انتخاب مضامین سرسید از انور صدیقی ص ۷۱۔۷۰

۲ انتخاب مضامین سرسید از انور صدیقی ص ۷۱

۳ انتخاب مضامین سرسید از انور صدیقی ص ۷۵

سرسیداوراردوصحافت

ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ میں جہاں شاہ ولی اللہ اور راجہ رام موہن رائے کے نام صفحہ اول پر آتے ہیں، وہیں سرسید احمد خان کی عظیم المرتب شخصیت بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔انھوں نے دیگر علوم وفنون کے ساتھ ساتھ صحافت کی بھی اپنے خون جگر سے جس طرح آبیاری کی، اس کی مثال تقریباً مفقود ہے۔

''لفظ صحافت صحیفہ سے نکلا ہے۔صحیفہ کا لغوی معنیٰ کتاب یا رسالے کے ہیں۔صحیفہ سے مراد ایک ایسا جریدہ جو خاص وقفہ پر نکلتا ہو۔اس سے صاف ظاہر ہوتا کہ تمام اخبارات، رسائل اور جرائد، صحیفہ کے زمرے میں آتے ہیں۔'' [1]

جہاں تک صحافت کے آغاز وارتقا کی بات ہے۔مطبوعہ صحافت کی ابتدا چین سے ہوئی۔ پیکنگ کے دربار کا سرکاری اخبار دنیا کے قدیم ترین اخبارات کی فہرست میں آتا ہے۔ ہندوستان میں بقول اصغر عباس صحافت کی ابتدا عہد مغلیہ میں ہوئی اور مطبوعہ صحافت کا رواج انگریزوں کی آمد کے بعد ہوا۔ بنگال ابتدا سے انگریزوں کے تگ وتاز کا مرکز تھا۔ وہاں پہلی دفعہ جنوری ۱۷۸۰ء میں آگسٹ ہکی نے ''ہکیز بنگال گزٹ'' کا اجرا کیا۔

اس واقعہ کے چھتیس سال بعد اہل ہند صحافت کے میدان میں آئے۔ کچھ محققین کے مطابق ہندوستانی صحافت کی ابتدا ۱۸۱۶ء میں گنگا دھر بھٹا چاریہ نے ''بنگالی گزٹ'' کے اجرا سے کیا جب کہ کچھ محققین کے مطابق ہندوستانی صحافت کی ابتدا ''سماچار درپن'' کے اجرا سے ہوئی۔ مذکورہ بالا ہندوستانی انگریزی کے اخبارات میں کالم ہندوستانی زبان کا بھی ہوتا تھا، جس سے انگریزوں کو خطرہ لاحق ہوا اور انھوں نے ہندوستانی اخبارات پر ہر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کردیں۔

ہندوستان میں صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون بننے کا مرحلہ اس وقت آیا، جب چالس مٹکاف نے صحافت پر عائد پابندیوں کو بہت حد تک کم کردیا۔ ۱۸۳۶ء میں پہلا اردو اخبار ''دہلی اردو اخبار'' کے نام سے مولوی محمد باقر صاحب (محمد حسین آزاد صاحب کے والد محترم) نے نکالا۔اس اخبار کو اردو کا پہلا اخبار تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن جدید محققین نے اس خیال کی تردید کرکے یہ ثابت کیا کہ اردو کا پہلا مطبوعہ اخبار ''جام جہاں نما'' ہے، جس کا اجرا منشی سدا سکھ مرزا پوری نے ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے کیا۔ ہری دت سنگھ کے اہتمام میں یہ اخبار ولیم ہوپ کنس پیرز کے مشن پریس میں چھپتا تھا۔

شمالی ہندوستان میں پہلا اردو اخبار ''سیدالاخبار'' تھا۔اس اخبار پر بحیثیت ایڈیٹر سید عبدالغفور کا نام شائع ہوتا تھا، لیکن حقیقی ایڈیٹر سرسید کے بڑے بھائی سید محمد تھے۔ گورنمنٹ رپورٹ کے مطابق اس اخبار کا اجرا ۱۸۳۱ء میں ہوا اور یہ اخبار سید محمد کے ذاتی مطبع لیتھوگرافک میں چھپتا تھا۔سید محمد اور سرسید احمد اس اخبار کو پروان چڑھانے میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ دونوں بھائیوں کو صحافت کے اصول، نفاذ اور حرکت کا ابتدائی علم اپنے نانا خواجہ فریدالدین احمد صاحب سے ملا تھا، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کو صحافت ورثے میں ملی تھی۔اپنے بڑے بھائی احتشام الدولہ سید محمد کے مذکورہ اخبار میں جب سرسید نے بطور نوآموزہ لکھنے کی ابتدا کی تو اس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ سیدالاخبار کے بارے میں امداد صابری اپنی ہمہ گیر تصنیف ''تاریخ صحافت اردو'' جلد اول میں تحریر فرماتے ہیں۔۔

''یہ اخبار اس وقت وجود میں آیا جب سرسید مرحوم کی عمر سترہ یا اٹھارہ سال تھی۔ سرسید کے ابتدائی مضامین غالباً اسی اخبار میں شائع ہونے شروع ہوئے تھے۔'' [2]

سیدالاخبار کی اشاعت جلد بند ہوگئی کیوں کہ اس کا سرکولیشن بہت ہی محدود تھا۔اس کی بنیادی وجہ عوام میں اخبار بینی کے ذوق کا فقدان بتائی جاتی ہے، دوسری وجہ یہ کہ ہندوستانی عوام میں غیر معمولی طور پر جہالت اور غربت تھی اور اخبار بینی کو بحز تضیع اوقات اور کچھ نہیں تصور کیا جاتا تھا۔

اردو صحافت پر ہندوستان کی پہلی ناکام جنگ آزادی کے اثرات منفی ومثبت دونوں ہی تھے۔ وقتی طور پر اردو صحافت جمود کا شکار ہوگئی، جس کا مخصوص سبب برطانوی حکام کا صحافیوں پر بے جا عتاب تھا، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ مولوی محمد باقر صاحب کی قربانی نے اردو صحافیوں کے لئے مشعل راہ

کا کام کیا اور انہیں اولوالعزمی، بلند حوصلگی اور صاف گوئی کا خاموش درس دیا۔

جہاں تک سرسید کی بات ہے، حقیقت یہی ہے کہ غدر کے بعد عوام الناس کے حالات و کیفیات نے انہیں مضطرب کر دیا اور اسی تجسس نے ان کو صحافت میں دوبارہ آنے پر مجبور کیا۔ وہ صحافت کے ذریعہ مسلمانان ہند میں ذہنی بیداری اور روشن خیالی لانا چاہتے تھے۔

۱۸۶۳ء میں سرسید نے ایک تحریر ''التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب تعلیم اہل ہند'' کے عنوان سے شائع کیا، جس میں ایسی علمی و ادبی تنظیم کے قیام کی تجویز پیش کی گئی جو ہندوستان میں جدید علوم و فنون کے انگریزی سے اردو ترجمہ کا اہتمام کرے۔

۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا اور ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے نام سے ایک تنظیم غازی پور میں قائم کی گئی۔ اس سوسائٹی کے ذریعہ سر سید نے ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو علی گڑھ سے ایک اخبار کا اجرا کیا جس کا نام ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' تھا۔ پہلے یہ ہفتہ روزہ اخبار تھا پھر سہ روز ہو گیا۔ اس اخبار کے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہونے کا اصل مقصد انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین افہام و تفہیم کی راہ ہموار کرنا اور باہمی کدورت کو رفع کرنا تھا۔ سرسید کا اجرا، ان کی بے خوفی، جرأت اور ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے لئے ان کے اخلاص فکر و عمل کا ثبوت ہے۔ اس کے اداریے میں سرسید ایک پیشہ ور صحافی نہ ہونے کے باوجود بھی واقعات کا ردعمل اس سلیقہ مندانہ طرز سے پیش کرتے تھے پیشہ ور صحافیوں کے لئے مثال قائم ہو جاتی تھی۔

شیخ محمد عمران فرماتے ہیں۔۔۔

''سرسید کی شخصیت جتنی بڑی دلکش تھی، اتنی ہمہ گیر بھی تھی۔ وہ بیک وقت اصلاح معاشرہ کے پرزور علم بردار، غیر معمولی بصیرت کے ماہر تعلیم، دیدور سیاسی مدبر، روشن خیال مذہبی مفکر، گہری لگن کے مورخ، موثر اور فکر انگیز تحریر کے مالک انشاء پرداز تھے ہی، اس کے علاوہ وہ بے باک و بے خوف صحافی بھی تھے۔'' [۳]

سرسید گزٹ میں زیادہ تر خبریں مستند انگریزی اخبارات سے ماخوذ ہوتی تھیں۔ ترجمے کا کام بابو درگا پرشاد اور مولوی فیض الحسن انجام دیتے تھے۔ گزٹ کے قبل اردو اخبارات میں خبروں کی زبان بھی مقفیٰ اور مسجع ہوتی تھی۔ سرسید کے اس اخبار سے اس کا رنگ بدلا اور آسان اور سلیس زبان و ادب کو فروغ ملا۔ موضوع کے اعتبار سے علی گڑھ گزٹ میں سیاسی، سماجی، علمی، تاریخی، اخلاقی غرض کہ ہر قسم کے مضامین برابر شائع ہوتے رہتے تھے۔ سرسید نے اردو صحافت کو ایک باوقار مقام عطا کیا اور اسے ہر قسم کے مضامین پر تنقیدی و تجزیاتی تبصرہ کرنے کے لائق بنا دیا، لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اردو میں قدیم اور جدید کی درمیانی کڑی ہے۔

سرسید کا یہ اخبار ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور دانشور طبقے کے خیالات کا آرگن تھا۔ سرسید نے مختلف موضوعات پر خود بھی لکھا اور دیگر اہل قلم سے بھی لکھوایا۔ گزٹ کے لکھنے والوں میں سرسید کے علاوہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، وقار الملک، محسن الملک، مولوی ذکاء اللہ، نذیر احمد، وحید الدین سلیم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں کی علمی، اصلاحی، فکری اور ادبی کاوشیں اگر اخبار کے منتشر اوراق سے جمع کی جائیں تو یقینی طور پر تاریخی اعتبار سے دلچسپ اور مفید دستاویز تیار ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔۔۔

''سرسید کے رفقاء میں حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، چراغ علی، وقار الملک نے انہی مقاصد کے تحت اس پرچے میں علمی، ادبی، فکری اور تہذیبی مضامین لکھ کر اور عام لوگوں کے فکری افق کو بلند کیا۔'' [۴]

سرسید اقوام عالم کی تاریخ سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ انگلستان کے سفر سے واپسی پر ان کا یادگار صحافتی کارنامہ ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا ہے۔ اس رسالے کا مقصد فاسد رسومات اور معاشرتی و اخلاقی اصلاح کے علاوہ مسلمانان ہند میں جدید علوم و فنون کا مذاق پیدا کرنا تھا۔

تہذیب الاخلاق کے حوالے سے معین الدین صاحب نے سرسید کے بارے میں لکھا ہے کہ۔۔۔

''جناب سرسید نے نازک وقت میں مسلمانوں کی دستگیری کی جب ان کی ہمتیں پست ہو چکی تھی۔ ساری قوم پر بے بسی اور مایوسی طاری تھی اور انھیں

کوئی ایسا راستہ دکھائی نہ دیتا تھا جس سے وہ اپنی تہذیب کی حفاظت کے لئے فارغ البالی اور عزت کی زندگی بسر کر سکیں۔'' ۵

ابتداً یہ رسالہ پندرہ روزہ تھا، بعد میں اس نے ماہانہ رسالے کی شکل اختیار کر لی۔ سرسید کی حیات میں یہ رسالہ تین بار نکلا اور بند ہوا۔ پہلی بار ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۶ء تک جاری رہا۔ اس دوران ۲۲۶ مضامین اس پرچے میں شائع ہوئے جن میں ۱۱۲ مضامین سرسید کے تھے۔ یہ رسالہ قارئین کے اصرار پر ۱۸۷۹ء میں دوبارہ شائع ہوا جو ۱۸۸۶ء تک جاری رہا۔ اس دوران ۶۷ مضامین شائع ہوئے، لیکن اس بار تفسیر لکھنے کی مصروفیت کے باعث سرسید صرف ۲۳ مضامین ہی اس رسالے کی نذر کر سکے۔ تیسری بار اس کا اجرا ۱۸۹۴ء میں میں ہوا اور ۱۸۹۷ء تک اس کی اشاعت ہوتی رہی۔ اس میں سرسید کے ۲۴ مضامین شامل تھے۔

سرسید نے رسم ورواج، ہمدردی، آزادی رائے، تربیت اطفال، غلامی، عورتوں کے حقوق، علوم جدیدہ، کاہلی، تعلیم وتربیت، طریق تناول طعام، ریاکاری، خوشامد اور مہذب قوموں کی پیروی جیسے مضامین لکھ کر قوم کو ایک بہتر زندگی بخشی تاکہ مسلمانان ہند ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔ اس تحریری صحافتی انقلاب نے مسلمانوں کے اندر ایک نئی روح پھونک دی نیز وقت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھنے میں اس سے معانت ملی۔

بلاشبہ قدرت نے سرسید کو حال کے آئینے میں مستقبل کے خدوخال دیکھ لینے کی زبردست صلاحیت بخشی تھی اور انہیں ایسا مثالی شعور اور حوصلہ بھی دیا تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے اس ابتدائی دور میں جو ہندوستانیوں کے لئے ہر لحاظ سے بہت نازک اور پرآشوب تھا، ملک وقوم کے لئے نہ صرف تعلیم واخلاق میں ترقی کا نسخہ کیمیا تلاش لیں، بلکہ اس پر عمل درآمد کی خاطر، ذہن سازی کے لئے زبان وقلم سے مسلسل جدوجہد بھی کرتے رہیں۔ سرسید کے لئے صحافت سے شغف محض شوق نہیں تھا بلکہ یہ ملک وقوم کی اصلاح وفلاح کے لئے ایک باقاعدہ اور منصوبہ بند مشن کے مصداق تھا۔

سرسید ہندوستانیوں کو جگانا اور انہیں زمانے کے تقاضے سمجھانا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے صرف ''گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' نکالنے کے سادہ اور رسمی عمل تک اپنا صحافتی کام محدود نہیں رکھا، بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ سرسید نے اردو صحافت میں نفسیاتی جذبہ کی عکاسی کر کے عوام میں اخبار بینی کا شوق پیدا کیا۔ وہ ہندوستان میں آزاد صحافت کے حامی تھے۔ انھوں نے خبروں کی اشاعت میں صداقت ودیانت کا دامن نہ چھوڑ کر اردو صحافت کو باوقار صحافت بنا دیا۔ ان کا ایک مضمون ''اخبار نویسوں کی آزادی کیا چیز ہے''؟ سے ان کے صحافتی شعور کا پتا چلتا ہے۔

''آزادی ہمارے نزدیک اس بات کا نام ہے کہ کسی اخبار نویس کی طبیعت صاف گوئی اور راست بازی میں کسی کی غلام اور تابعدار نہ ہو''۔ ۶

سرسید نے ورنا کولر پریس کی عظمت اور وقار کو بڑے دلیری اور حسن وخوبی سے قائم رکھا۔ جب اینگلو انڈین اخبارات، دیسی اخبارات پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے تو آپ دیسی اخبارات کی جانب داری کرتے ہوئے اس کا جواب دیتے، چنانچہ ایک اداریہ میں لکھتے ہیں کہ انگریزی اخبار نویس ہندوستان میں اس قدر کسی فرقہ سے ناراض نہیں ہیں، جس قدر کہ وہ ہندوستانی اخبار نویسوں کی آزادی سے۔

بقول اصغر عباس۔۔۔

''جس طرح سرسید نے زندگی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کیا اسی طرح انہوں نے اس دور کی کم مایہ صحافت کو اپنے خلوص عمل سے گراں مایہ بنا دیا۔''

محمد افتخار کھوکھر سرسید کے بارے میں لکھتے ہیں۔۔۔

''سرسید احمد خان نے اردو صحافت کو اعلیٰ روایت سے ہمکنار کیا۔ صداقت، بے خوفی اور بے غرضی ان کی صحافت کا طرۂ امتیاز تھا۔ سرسید احمد خان نے جس مسئلے کو بیان کرنا چاہا بے خوف اور بے غرض ہو کر بیان کیا۔ ان کے ذہن وقلب میں کچھ آیا درست جان کر بیان کر دیا۔ اپنی ذات کے لئے کبھی کسی پر کیچڑ نہ اچھالی اور نہ ہی بے جا تنقید کو روا رکھا۔'' ۷

راجہ جے کشن پرساد سرسید کے بارے میں فرماتے ہیں۔۔۔

''جب سرسید نے 'لائل آف محمڈنز آف انڈیا' نکالنا شروع کیا تو اس کے فکروں سے مجھے یہ خیال ہوا کہ سرسید احمد خان نہایت متعصب آدمی ہیں، اور ہندوؤں سے ان کو ہمدردی نہیں ہے۔ اس وقت مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ اسی طرح ایک رسالہ ہندو خیر خواہ کے تذکرے میں نکالا جائے۔ اور پھر ان سے

ملاقات کے بعداس چیز کااظہار کیاتو ان کااندازہ الگ نکلا۔'' ۸

سرسید کے اخبارات اپنی دیدہ زیبی، عمدہ کتابت وطباعت اور کاغذ کی کوالیٹی میں اپنی مثال آپ ہوتے تھے۔بقول عبدالسلام خورشید۔۔۔

''اخبار سائنٹفک سوسائٹی'' کو ہندوستان کی اردو صحافت میں وہی مقام حاصل تھا، جو انگلینڈ میں 'دی ٹائمز' کو حاصل ہے۔''

حواشی

۱۔ڈاکٹر احسان عالم، اکیسوی صدی میں اردو صحافت، مرتب ڈاکٹر امام اعظم، ایجوکیشنل بک ہاؤس
دہلی، ۲۰۱۶ء، ص۔۱۳۹

۲۔امداد صابری: تاریخ صحافت اردو، جلد اول، احمد ابراہیم علوی، اردو صحافت کا جائزہ، کوالیٹی پرنٹرس لکھنو، ۲۰۰۰ء، صفحہ۔۱۴۴

۳۔شیخ محمد عمران، مرد صحافت: سرسید احمد خان، ماہانہ تہذیب الاخلاق، سرسید نمبر، اکتوبر ۲۰۱۳ء، ص۔۱۱۸

۴۔اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص۔۳۳۶

۵۔ معین الدین، ماہنامہ تہذیب الاخلاق۔سرسید نمبر اکتوبر ۲۰۱۳ء، ص۔۱۶۶

۶۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ: جلد ۸، شمارہ ۳۳، ۱۸ اگست ۱۸۷۳ء، ص۔۷

۷۔محمد افتخار کھوکھر: تاریخ صحافت، مقتدرہ قومی زبان۔اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص۔۸۸

۸۔خلیق احمد نظامی: جدید ہندوستان کے معمار: سرسید احمد، مرتب۔ڈاکٹر اصغر عباس، وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند، ۱۹۷۱ء، ص۔۴۷

علی گڑھ تحریک سے متاثر افسانوں میں مستورات کی عکاسی

عورتوں کے انسانی مساوات اور سماجی حقوق کی بات کی جائے تو تواریخ کے صفحات کے صفحات سیاہ نظر آتے ہیں۔تمام ترقی یافتہ مذاہب ومما لک خاموشی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور عورتوں کے حقوق ومرتبہ پر چشم پوشی کرتے نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے فلسفی نسوانی کرداروں کے حقوق اور ان کی سماجی حقوق طے کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ارسطو وافلاطون بھی صحیح معنوں میں عورت کی حیثیت متعین نہ کر سکے۔طلوع اسلام سے قبل عورتوں کی سماجی حیثیت بہت زیادہ خراب تھی۔ان کا یقین تھا کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کو اپنی لڑکی دے کر ہمیشہ کے لئے اس سے کم تر ہو جائے گا۔اس لئے وہ پیدائش کے وقت ہی لڑکی کو زندہ درگور کر دیتے یا پیدا ہونے کے بعد پہاڑ کی چوٹی سے نیچے پھینک دیتے تھے۔قدیم ہندوستان میں عورتوں کی حالت اچھی نہیں تھی۔عورت دھیرے دھیرے سماجی زندگی میں اپنا وقار کھو رہی تھی اور وہ مرد کی خواہشات پوری کرنے کا صرف ایک آلہ ہو کر رہ گئی تھی،جس کے حوالے ویدوں،اپنشدوں اور اس سے پہلے کے ادب میں ملتے ہیں۔عورتوں کے ذہن پر مذہب کے ایسے گہرے پردے ڈال دیئے گئے تھے جن سے باہر دیکھنا ان کیلئے ممکن ہی نہیں تھا۔ مذہبی باتیں اور مثالیں عورت کے ذہن پر ایسا نفسیاتی اثر ڈالتی تھیں کہ وہ تمام عمر اپنی مسرت اور خوشیوں کا انحصار انھیں پابندیوں میں جکڑی ہوئی پاتی تھیں۔ان کے سامنے ستی ساوتری اور بعض دوسری مثالی عورتوں کی زندگی کے نمونے اس طرح سے پیش کئے جاتے تھے کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد شوہر کے ہر جائز اور ناجائز حکم کی پابندی سمجھنے لگتی تھیں اور اسی میں ابدی مسرت محسوس کرتی تھیں۔مگر وقت اور حالات نے کروٹ بدلے اور ایک نئے دور کا سورج طلوع ہونے لگا۔عورتوں کے لبوں پر لگے قفل ٹوٹنے لگے اور گھر کی چہار دیواری کی قید سے عورتوں نے آزادی کے نغمے گانا شروع کر دیئے۔ان کی آنکھیں چہار دیواری سے باہر کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے بے قرار دکھائی دینے لگیں۔اسی وقت سماج کا دانشور طبقہ بھی اس نئی سوچ کا حامی اور حقوق نسواں کے فروغ کے لئے کوشاں نظر آنے لگا۔صنعتی انقلاب اور سائنسی ترقی نے بھی بڑی حد تک آزادی نسواں کے لئے راہ ہموار کی۔

اس طرح انیسویں صدی کا آخری حصہ اور بیسویں صدی عورتوں کی آزادی کی جدوجہد کے لحاظ سے بہت اہم ہے،اسی زمانے میں سرسید نے مسلمانوں کو سماجی،سیاسی پستی سے نکالنے کے لئے اسکول کھولے،انجمنیں قائم کیں اور اخبار نکالے۔انہوں نے 1870 تہذیب الاخلاق کے ذریعہ لوگوں کے ذہنوں کو بیدار کرنے کا کام لیا تا کہ وہ ملک وقوم کی ترقی میں برابر کے حصہ دار بن سکیں۔علاوہ ازیں 1886 میں مسلم ایجوکشنل کانفرنس کی بنا ڈالی تا کہ اہل وطن کے اندر علم کی روشنی پھیلائی جا سکے۔سرسید کی انہیں کاوشوں اور کوششوں کو اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس تحریک کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو سماجی،سیاسی،مذہبی اور اخلاقی پستی سے نکالنا تھا۔تعلیم کی کمی اور کسی فکری نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ پستی کی آخری منزلوں تک پہنچ گئے تھے۔انہوں نے مردوں کی تعلیم کی طرف خاطر خواہ توجہ کی لیکن جہاں تک عورتوں کی تعلیم کا سوال ہے تو اس سلسلے میں ہمیں مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔وہ عورتوں کی تعلیم کو مذہبی اور سماجی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور خواتین کے پردے پر خاص طور سے زور دیتے تھے۔اس سلسلے میں شیخ عبداللہ کی خودنوشت ''مشاہدات وتاثرات'' کے مطالعہ سے اس بات کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔

علی گڑھ تحریک سے منسلک ادباء وشعراء نے حقوق نسواں اور ان کے مساویانہ سلوک پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے مراۃ العروس،بنات النعش اور رویائے صادقہ اور الطاف حسین حالی نے مجالس النساء جسے ناول،مناجات بیوہ اور چپ کی داد جیسی نظمیں لکھ کر عورتوں کی سماجی،مذہبی واخلاقی صورت حال سے اردو کے قارئین کو متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ 1904 میں شیخ عبداللہ کی کوششوں سے علی گڑھ میں عورتوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حقوق نسواں اور تعلیم نسواں کے سلسلے میں کئی اہم فیصلے لئے گئے۔اس کانفرنس کو کامیابی سے ہمکنار کرانے میں فرماں روائے بھوپال سلطان جہاں بیگم نے اس کے انتظام وانصرام میں بہت ہی اہم رول ادا کیا تھا۔اسی دوران شیخ عبداللہ نے ''فیمیل ایجوکشن ایسوسی ایشن'' نامی تنظیم کی بنا ڈالی اور محلّہ ''بالائے قلعہ'' میں گرلس اسکول قائم کیا جو آج 'ویمن کالج' کے نام سے مشہور ومقبول ہے۔اس طرح شیخ عبداللہ اور دیگر دانشوروں کی

ڈاکٹر وصی احمد اعظم انصاری،اسسٹنٹ پروفسر،عافیہ حمید (ریسرچ اسکالر)،خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی لکھنؤ

کوششوں سے عورتوں کو مساویانہ حقوق حاصل ہوئے اوران کے لئے علم کے دروازے ہمیشہ کے لئے کھل گئے۔ان کی عملی کوششوں نے اردو کے بیدار ذہنوں کو متاثر کیا،جس کے سبب اردو کے متعدد ادیبوں اور شاعروں نے مستورات کے مسائل ومصائب کو اپنی نگارشات میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

علی گڑھ تحریک کے اثرات مختلف اصناف کے ساتھ افسانوں پر بھی بالواسطہ پڑے ہیں۔علی گڑھ تحریک سے متاثر ہوکر جو ناول یا افسانے لکھے گئے ہیں ان میں سے بیشتر اصلاح نسواں کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔اس تحریک سے منسلک قلم کاروں کا ایک مقصد سماج میں عورتوں کے حقوق کی بازیابی تھا تو دوسرا سماج میں عورتوں کے اندر موجود برائیوں کو دور کر کے ان کی اصلاح و تربیت کا سامان بھی فراہم کرنا تھا۔اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر ڈپٹی نذیر احمد نے مراۃ العروس، بنات النعش، رویائے صادقہ اور الطاف حسین حالؔی نے مجالس النساء جیسے ناول تخلیق کئے۔نیز اس مقصد کے پیش نظر متعدد افسانہ نگاروں نے قلم کو جنبش دی۔مثلاً محمد مجیب کا ''کیمیا گر'' محمد احسان اللہ العباسی کا ''زاہدہ''،''فسانہ دل پذیر''اور''المجاہد''۔علامہ راشد الخیری کا ''بدنصیب کا لال''،''رویائے مقصود''،''شناس ودراج''،''نند کا خط بھاوج کے نام''،''سوکن کا جلاپا''،''کثرت ازدواج''،''بے زبانوں کا صبر''،''ماہ حسن اندرا'' سلطان حیدر جوش کا ''نابینا بیوی''، قاضی عبدالغفار کا ''تیس پیسے کی چھوکری۔علی محمود کا ''ایک پرانی دیوار''،''چھاؤں''۔مرگ محبوب ''وزارت علی اور پنی''، دردمند اکبرآبادی کا ''تصویر غم''، خواجہ حسن نظامی کا ''بیگمات کے آنسو''،''شہزادی کا بڑھاپا'' حامد اللہ افسر کا ''سوتیلی ماں''،''دوسری شادی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

افسانہ نگار محمد مجیب کے افسانہ ''کیمیا گر'' میں نسوانی کردار کو نہایت مضبوط، باوفا اور ہمدرد دکھایا گیا ہے۔اس افسانے میں ''حکیم مسیح'' افسانے کا مرکزی کردار) کی بیوی ہر حال میں ااپنے شریک حیات کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی رہتی ہے اوران کے ساتھ سماجی خدمات کو بخوبی انجام دیتی ہے۔خاص کر افسانوں کے ذریعہ افسانہ نگار نے عورت کو مرکزی کردار کے طور پر عوام وخواص کے سامنے پیش کیا ہے اور نسوانی کرداروں کو سماج ومعاشرے میں ایک اہم مقام ومرتبہ دلانے کے لئے آواز بلند کی ہے۔نیز نسوانی جذبات واحساسات کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔مثال کے طور پر افسانے کا یہ اقتباس دیکھیں :

'ادھر صبح سویرے جب مسلمان قافلے نے کوچ کی تیاری کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں۔نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اس نے رات کے تیسرے پہر ''یارسول'' کا ایک نعرہ سنا تھا۔لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہ بتا سکا۔حکیم مسیح کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً سمجھ گئیں کہ وہ خالد پور واپس بھاگ گئے ہیں۔وہ بہت روئیں، اپنے بچوں کو بھائی کے سپرد کیا اور بیوہ کی زندگی سے بچنے کے لیے بیوی کی موت مرنے خالد پور چلیں۔جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو شام ہوچکی تھی۔دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے دواخانہ کے سامنے بیٹھے ہیں نہ پانی پیا ہے، نہ کھانا کھایا ہے، بال پریشان ہیں، آنکھیں سرخ، لیکن مریضوں کا تانتا بندھا ہے اور وہ برابر نبض دیکھ رہے ہیں۔دوائیں دے رہے ہیں۔انہوں نے نوکر کے ذریعہ سے کچھ کہلا بھیجا۔مگر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہنچنے میں زیادہ دیر لگی،اور جب وہ پہنچ گیا تو حکیم صاحب نے نہ اسے پہچانا نہ اس کی بات سمجھے۔رات بھر انہوں نے حکیم صاحب کی آمد کا نہایت بے تابی سے انتظار کیا۔لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو خود باہر پہنچیں۔وہاں ابھی لوگ موجود تھے لیکن انہیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئیں۔حکیم مسیح انہیں آسانی سے پہچان نہ سکے لیکن جب پہچان لیا تو مسکرائے، کچھ سوچا اور کہا:

''لالہ سیتارام کی بیوی بیمار ہیں۔میں نے دوا بھیج دی ہے لیکن ان کی تیمارداری کے لئے کوئی نہیں۔اگر وہاں چلی جائیں۔۔۔''

حکیم مسیح کی بیوی نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی۔پچھلے دنوں کی تکان کا نام ونشان نہ تھا آنکھیں اب بھی سرخ تھیں مگر چہرے سے نور برس رہا تھا۔کپڑوں پر کچھ مٹی سی لگی رہ گئی تھی۔جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوئے ہیں۔یہ ایک نظر کافی تھی، وہ باہر نکلیں اور راستہ پوچھتے پوچھتے لالہ سیتارام کے گھر پہنچ گئیں۔۔۔''

(اردو افسانے کی روایت، مرزا حامد بیگ، ص ۹۳۴)

علامہ راشد الخیری کے افسانوں کا محور ومرکز مشرقی روایات اور تہذیب کے ساتھ ہی ساتھ طبقہ نسواں کی خدمات رہا ہے۔ان کی یہ شعوری کوشش خواتین کو ذلت اور رسوائی کے غار سے نکالنے کی تھی جس کے لئے انہوں نے 1909 میں ماہنامہ ''عصمت'' اور اپریل 1911 میں رسالہ ''تمدن'' نکالا۔1915 میں

ایک ہفتہ وار پرچہ ''سہیلی'' کے نام سے بھی شروع کیا۔علاوہ ازیں انہوں نے ''بنات'' اور ''جوہرِ نسواں'' کے نام سے بھی رسالے نکالے جو حقوقِ نسواں اور ان کی آزادی کے حامی وحمایتی تھے۔ان کی اشاعت کا مقصد خواتین میں لکھنے پر ھنے کا ذوق پیدا کرنا،انہیں سلیقہ منداور باحوصلہ بنانا تھا،تا کہ وہ نت نئے مسائل کا بہادری سے مقابلہ کرسکیں۔ان کے افسانوں کا باریک بینی مطالعہ وشاہدہ کیا جائے تو یہ بھرپور تاثر ابھرتا ہے کہ وہ خواتین کی زندگی کو خوشگوار بنانے کی ہر ممکن کوشش کررہے تھے۔راشدالخیری نہ صرف محسنِ نسواں تھے بلکہ مسائل کو فنی ضابطے کے ساتھ افسانوں میں پیش کرنے کی صلاحیت سے بخوبی واقف تھے۔ان کے افسانوں کا بنیادی مقصد سماجی اصلاح کے ساتھ ہی ساتھ حقوق نسواں کی اصلاح بھی تھا۔ان کے بارے میں اردو کے مشہور ومعروف فکشن نگار امتیاز علی تاج نے ان کے مقصد حیات کو اس طرح سے بیان کیا ہے جو حقوق نسواں کی جدوجہد اور ان کی آزادی میں تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔سید امتیاز علی تاج رقم طراز ہیں:

''مولانا راشدالخیری عورتوں کے حقوق کے پُرزور حامی تھے چنانچہ وہ زندگی بھر عورتوں پر مردوں کے مظالم سے نجات دلانے کی کوشش کرتے رہے۔عقدِ بیوگان،حقوقِ نسواں ان کے خاص موضوع تھے جن کا ذکر ان کے افسانوں میں جابجا ملتا ہے۔انہوں نے مزاحیہ افسانے بھی لکھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی طبیعت حزن وملال کی تصویر کشی کے لئے موزوں تھی۔''

(مولانا راشدالخیری کا انتقال،سید امتیاز زعلی تاج (تہذیب نسواں،۱۵ فروری ۱۹۳۶ء،ص ۱۶۶)

راشدالخیری کا پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' ماہنامہ مخزن بابت دسمبر ۱۹۰۳ میں شائع ہوا۔یہ افسانہ خطوط کی ٹکنیک میں تخلیق کیا گیا ہے جس میں بڑی بہن نے اپنے چھوٹے بھائی کو خطوط کے ذریعہ چند نصیحتیں کی ہیں اور مرحوم بہن کے بچوں کی خراب حالت کی طرف اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے پرورش کا معقول بندوبست کرنے کی درخواست کی ہے۔اردو فکشن میں غالباً سب سے پہلے اس ٹکنیک کا استعمال علامہ راشدالخیری نے ہی کیا ہے۔اس افسانے کے پندرہ سال بعد ۱۹۱۸ء میں راشدالخیری کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گوہرِ مقصود'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔جنوری ۱۹۲۰ء میں تین طویل افسانوں کا ایک مختصر مجموعہ ''جوہرِ عصمت'' کے نام سے شائع ہوا۔بعد میں اسی نام سے دس اور افسانوں کے ساتھ یہ مجموعہ ۱۹۲۷ء میں چھپا۔''مظلوم بیوی کا پاک جذبہ''،'' بھنور کی لہن''،''بے گناہ کا قتل''،''عدل جہانگیری'' اور ''بلبل کی شہادت'' اس مجموعے کے اہم افسانے ہیں۔ان افسانوں میں عورتوں کی مظلومی اور ان کے صبر واستقلال کی داستان بیان کی گئی ہے۔راشدالخیری نے اپنے افسانوں کے ذریعہ مسلم خواتین کی زبوں حالی اور مظلومیت کی داستان کو اجاگر کیا ہے اور تعلیم وتربیت کی ترغیب دی ہے۔اصلاحِ معاشرت کے جتن کئے۔اصول خانہ داری اور حفظانِ صحت کی تعلیم دی۔بچوں کو نگہداشت کا قرینہ بتایا۔جہیز کے سلسلے میں رسموں کی قباحت،تعدادِ ازدواج،طلاق اور وقت علی الاولاد جیسے مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے افسانہ ''جہانگیری عدل'' (مجموعہ جوہر عصمت) میں ایک پاک باز خاتون کے کردار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنی عصمت کے تحفظ کے لئے زر وجواہر کو ٹھکرا دیتی ہے اور ان کے عوض پریشانیوں کو قبول کرلیتی ہے۔راشدالخیری کا یہ افسانہ ''نسیمہ کی سنگ دلی'' میں جہاں ایک طرف ایک عورت کی وفاداری اور صبر کی مثال نظر آتی ہے وہیں دوسری طرف ایک محبت کرنے والی ماں کی تصویر بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ان کے افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''دوپہر ہوچکی تھی۔گود میں لے کر لیٹی تو بچہ سوگیا۔ظہر کی اذان ہوئی تو نماز کو اٹھی۔فارغ ہوکر بچے کے پاس آئی تو اس کا پنڈا پھیکا تھا۔کلیجہ دھک سے ہوگیا۔بچے کو تو اس غضب کا بخار چڑھا کہ ابھی تو یہ عشاء کے وقت تک وہ معصوم چنوں کی طرح بھن رہا تھا۔اتنا بڑا بھنڈار گھر ماما چلی گئی اور نسیمہ اپنے لال کو گود میں لئے پڑی رہی۔دن کی باتیں یاد آئیں۔کلیجے پر تیر برسے۔لمحہ لمحہ بعد دیکھتی تھی کہ شاید بدن پسیج گیا ہو مگر وہاں تو بھاڑ بھن رہا تھا۔قسیم آج کسی خاص جلسے میں تھا۔معصوم بچہ ظالم باپ کو بخار کی حالت میں خواب دیکھ رہا تھا۔دفعتاً آنکھ کھولی۔ابا کہہ کر ماں سے لپٹ گیا۔ماں نے ہر چند چمکارا مگر وہ روتا پیٹتا گود سے اترا اور دیوان خانے کے دروازے پر گیا اور باپ کو بلاتا رہا۔لاکھ نسیمہ کہہ رہی تھی کہ بیٹا ابھی نہیں آئے،مگر وہ بلک رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔اماں جان!اندر لیٹے ہیں،کنڈی لگائی ہے۔اب نسیمہ بچے کو گود میں اٹھا کر اندر کے دالان میں آئی۔منہ پر منہ رکھا۔پیار کیا۔چمٹایا،گلے میں ہاتھ ڈالے ننھے ننھے ہاتھوں کو سینے پر رکھا اور رو کر کہا۔''معبود حقیقی!یہ دکھیا مصیبت زدہ نسیمہ کا لال تری امانت ہے الٰہ العالمین!مجھ بدنصیب پر رحم کیجیو۔سچے آقا!اچھے معبود!دکھیاری کا لال شکستہ دل کا چراغ ہے۔''نسیمہ یہیں تک پہنچی تھی کہ نسیم پھر اٹھا اور کہنے لگا۔اچھی ماں جان!چھوڑو دیکھو ابا جان گملوں کے پاس کھڑے ہیں۔

نسیمہ کے پاس اس کا کچھ جواب نہ تھا۔ آنکھ سے آنسو کی جھڑیاں بہہ رہی تھیں۔ کبھی اس کو سینے سے لگاتی اور کبھی اس کی ضد پر چھوڑ دیتی۔ تین بج چکے تھے۔ چار برس کا پلا پلایا بچہ آج ماں کے ہاتھوں میں تھا۔ بارش زور وشور سے ہو رہی تھی اور اس عظیم الشان مکان میں ایک بدنصیب ماں اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو لئے بیٹھی تھی۔ ماتھے پر ہاتھ پھیرتی پاؤں کو پیار کرتی۔ بلبلاتی اور روتی۔ بچے نے پانی مانگا رات کا وقت تھا۔ گود میں لے کر دروازے پر آئی کہ کسی سے شربت منگوا کر معصوم کا حلق تر کر دوں۔ مگر سڑک پر سناٹا تھا۔ الٹی لوٹی اور یہ کہہ کر پانی پلا دیا۔ ''کلیجے کے ٹکڑے! شربت بھی نصیب نہ ہوا۔''

نسیمہ اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ نسیم کو پھر غفلت ہوئی اور ماں کا منہ اس کے ہونٹوں پر تھا کہ وہ چونکا اور کہا اچھی اماں! وہ آ گئے۔ ابا آؤ۔ ابا۔

بہتیرا ہی نسیمہ نے اس وقت بہلانا چاہا مگر بچہ نہ سنبھلا۔ کھڑا ہوا، مگر گرا۔ گرتے ہی ماں نے گود میں لیا، لیٹتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔ ''ابا'' زبان سے نکلا۔ مگر پہلی ہی آواز پر اس کو ایک ہچکی آئی۔ آنکھیں، ماں کی صورت پر، اور زبان باپ کی یاد میں تھی کہ نسیمہ کی گود میں اس کا لال ہمیشہ کی نیند سو گیا۔''

(اردو افسانے کی روایت۔ مرزا حامد بیگ، ص ۲۱۸)

سلطان حیدر جوش کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جوش کا مشہور افسانہ ''طوق آدم'' میں نسوانی کردار کے مختلف خوبصورت رنگ نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر (طوق آدم) کا نسوانی کردار ''حمیدہ'' کہیں خوبصورت کم سن، ماڈرن عورت کی تصویر کشی کرتی ہے اور کہیں صرف ایک نو بیاہتا بیوی کی شکل میں نظر آتی ہے اور کہیں بالکل روایتی عورت کے طور پر افسانے میں جان ڈالتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ افسانہ اس بات کی گواہی پیش کرتا ہے۔:

''وہ میرا ہی دل لبھانے کے لئے سہی روزنت نئی صورت ولباس میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ یہاں تک تو نہایت اچھا تھا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ میں روزانہ اس کی دلفریبی اور حسن کا اعتراف بھی کروں۔ اور یہی غضب تھا۔ میں بار بار اس سے کہہ چکا تھا، اس کے سامنے شاعری کر چکا تھا کیونکہ میں ایسے الفاظ کو نظم ہی سمجھتا ہوں کہ وہ سب سے زیادہ حسین، سب سے زیادہ دلکش، سب سے زیادہ غریب، نیچر کی انتہائی صنعت، تہذیب اور ترقی کی نقش آخریں وغیرہ وغیرہ تھی اور ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ میں ہمیشہ ان الفاظ کو طوطے کی طرح دہرایا کرتا۔ جب کبھی وہ خلوت میں ہوتی ایک شعلہ خودستائی اس میں بھڑک اٹھتا اور اس وقت تک فرو نہ ہوتا جب تک کہ میں عملاً نہیں بلکہ قولاً الفاظ میں اس کی مدح سرائی نہ کرتا۔ میں اس کو نہایت عزیز رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ میرا کالج کا نام سیماب تھا۔ اس کے علاوہ حمیدہ کو ایک بات سے نفرت بھی تھی۔ وہ کسی عورت کو میری زبان سے خوبصورت سننا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ گویا اپنی دلفریبی کی تعریف اور دوسرے کے اپنے ہمسر نہ ہونے کا اقرار۔ یہ دونوں ایسی عادتیں تھیں جو مستقل طور پر اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھیں، اور میں کسی عادت کے پابند ہونے سے اسی قدر دور تھا جس قدر قطب شمالی، قطب جنوبی سے ہے۔ وہ کسی اور کے حسن کی تعریف سننا نہیں چاہتی تھی، اور مجھے بعض اوقات بلا کسی وجہ کے اس کی دھن لگ جاتی تھی۔ تاہم ایسے لمحے جو ہماری خاموش اور مسرت انگیز زندگی میں بادصرصر کا طوفان کہے جا سکتے ہیں۔ اکثر واقع ہوتے تھے، لیکن یہ آندھیاں بلا کسی ظاہری نقصان کے اوپر ہی اتر جایا کرتی تھیں۔ اور بہت جلد مطلع صاف ہو جاتا تھا۔

ایک روز عین اس وقت جبکہ وہ اپنے ٹامکیٹ سے یا بالفاظ دیگر کنگھی چوٹی سے فارغ ہو چکی تھی، اور میرے پیچھے کھڑی ہوئی اپنی دلفریبی اور حسن بے مثال کا اندازہ بڑے آئینہ میں کر رہی تھی۔ میں ایک تصویر، انگریزی میگزین میں دیکھ رہا تھا اور ایک ایکٹریس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ غالباً وہی خودنمائی اس کے اندر بھڑک اٹھا تھا۔ اور اس نے میرے پاس آ کر دیکھا تو مجھے ایک دوسری صورت کے نظارے میں مشغول پایا۔ ممکن ہے کہ اس سے وہ شعلہ خود نمائی زیادہ مشتعل ہو گیا ہو۔ لیکن مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ میرے اوپر اس تصویر کی تعریف کرنے کی خواہش آندھی کی طرح مسلط ہوتی جاتی تھی اور میں نے آخر کار کہا۔

''پیاری حمیدہ! دیکھنا یہ ایکٹریس کس قدر خوبصورت ہے!''

''کیا خاک خوبصورت ہے، مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی معلوم نہیں ہوتی۔'' اس نے کہا۔

دوسرے دن میرے خیالات یہ نہیں تھے۔ طبیعت کا غبار رات کے ساتھ ہوا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ جس کو میں کل پسند کر رہا تھا آج اسی کے لئے بے قرار نہ ہوتا۔ سچ ہے کہ تنہائی کا رفتہ رفتہ پڑنے والا اثر مجھے بے چین کئے دیتا تھا۔ نوکر کا تقاضا تھا کہ فرنیچر خراب ہو رہا ہے۔ مرمت کی ضرورت ہے۔

خادمہ کی ضد تھی کہ پہلے برتن دیکھ لئے جائیں، وہ بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ محض ایک حمیدہ کے نہ ہونے سے میں اپنے آپ کو کوئی مصیبت میں پاتا تھا۔ میں اور ایسی فضولیات کا حساب و کتاب ناممکن! قطعی ناممکن۔ میں کبھی ان واہیات باتوں کی طرف مشغول نہیں ہوا تھا۔ حمیدہ خدا جانے کس طرح ان سب سے برابر پیش آتی ہوگی۔ مجھے تعجب تھا۔ تاہم اب کیا کیا جائے۔ حمیدہ کو اب واپس آنا چاہئے۔

مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی۔ کیونکہ کوچوان سے صرف اس قدر پتہ چل سکا تھا کہ وہ قلابہ کے اسٹیشن پر اتری تھی۔ بفرض محال اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو بھی اس کے پیچھے وارنٹ گرفتاری کی طرح ہر جگہ پہنچنا میرے دل و دماغ کے قطعی خلاف تھا۔ خود جا کر خوشامد کرتا یا دو ایک کو درمیان میں ڈال کر اور زیادہ تشہیر کرنا۔ مجھ سے قطعی ناممکن تھا۔ پھر کیا کیا جائے۔ کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حمیدہ کے بغیر اب مجھے زندگی ایک کالا پانی معلوم ہوتی تھی۔

میں جانتا تھا کہ حمیدہ روزانہ اخبار دیکھتی ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کل کے پرچے میں وہ اعلان شائع ہو گیا ہے۔ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ حمیدہ ہر جدت پسند بات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ایسا اعلان ایک روزانہ اخبار میں کیا۔ اور محض اس خیال سے کیا کہ حمیدہ اس کو پڑھے، میری حالت سے آگاہ ہو، جدت آمیز خیال کو پسند کرے اور چلی آئے۔ آج دوسرا دن تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس نے اخبار پڑھا ہی نہ ہو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس نے کل ہی پڑھا ہوگا۔ اور اگر اس نے مان لیجئے کل بھی نہ پڑھا ہو تو آج میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ اب دوپہر ڈھل چکی تھی۔ نصف سے زیادہ دن گذر چکا تھا اور میری تشویش بڑھتی جاتی تھی''

(اردو افسانے کی روایت۔ مرزا حامد بیگ، ص ۳۰۳۔۲۹۷)

حامد اللہ افسر کا شمار اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۲۷ء میں زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ ہو کر منظر عام پر آیا اور قارئین کے بیچ خوب سراہا گیا۔ اس مجموعہ میں کل گیارہ افسانے ہیں۔ ان میں ''ڈالی کا جوگ''، ''گومتی کا فقیر''، ''حیات بعد الموت''، ''مصرانی''، ''سوتیلی ماں'' اور ''بہن کی محبت'' 1924 میں ''صلائے عام'' میں شائع ہوئے۔ حامد اللہ افسر کے افسانے اصلاحی اور اخلاقی نقطہ نظر سے خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اپنی وسیع النظری اور باریک بینی کے سہارے زندگی کے نئے نئے واقعات سے دلچسپ اور سبق آموز موضوعات نکال لیتے ہیں اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی آئینہ داری کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے افسانہ ''دوسری شادی'' میں ایک ایسے مسلم گھرانے کی روایت کو پیش کیا ہے جس میں نسل پرستی کا بول بالا ہے۔ ہم مذہب اور ہم رتبہ و مرتبہ ہونے کے باوجود غیر خاندان میں شادی کا دستور نہیں ہے۔ اس خاندان میں عورت کی مرضی یا پسند ناپسند کا کوئی دخل نہیں ہے اور صرف روایت کی پاسداری لازمی شرط ہے۔ اس کا فرض محض احکامات کو بجالانے کا ہے، قناعت کرنے کا ہے اور یہ سوچ کر رہ جانے کا ہے کہ:

''میں بن بیاہی بیوہ تھی، اور اس خاندان کی بیوہ تھی جس میں عورت صرف ایک بار بیوی بن سکتی ہے اور ایک ہی بار بیوہ۔''

(دوسری شادی، ادبی دنیا، نوروز نمبر ۱۹۳۲ء، ص۔۸۷)

مجموعی اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان افسانوں کی روشنی میں علی گڑھ تحریک نے سماجی، سیاسی، تعلیمی انقلاب کے ساتھ نسوانی کرداروں کے ساتھ بھی حتی المقدور انصاف کا برتاؤ کیا ہے۔ انصاف اس معنی میں کہ اس تحریک نے جہاں زندگی کے ہر میدان میں اصلاحی کارکردگی انجام دی وہیں اس سماج کا ایک اداس چہرہ نسوانی کردار بھی اس کے سامنے رہا ہے۔ اس تحریک نے نسوانی کرداروں کو گھر کی چہار دیواری سے نکال کر کالج اور یونیورسٹی تک پہنچایا اور ''العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ'' کو عملی طور پر معاشرے میں نافذ کر دکھایا ہے۔

☆☆☆

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی بہتری اور ترقی میں سرسید احمد خان کا تعاون

انیسویں صدی کا دوسرا نصف ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں قرون وسطی سے جدیدیت کی طرف منتقلی کا دور تھا۔ 1857 کا بغاوت اس دور کا ایک خوفناک اور سب سے بڑا واقعہ تھا۔ اس بغاوت نے ہندوستانی سماج میں سیاسی، معاشی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی حالات میں زبردست تبدیلیاں لائی تھیں۔ بغاوت کی ناکامی کے نتیجے میں مغل خاندان کا خاتمہ ہوا اور ہندوستان میں برطانوی راج قائم ہوا۔ برطانوی راج کے قیام کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ انگریزوں نے ان کو بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرایا، اور وہ انگریزوں کے ہاتھوں کمزور اور نظر انداز ہوئے۔ مسلمانوں کو معاشی طور پر کچل دیا گیا اور ان کے لیے روزگار کے دروازے بند کر دیے گئے۔ تعلیمی لحاظ سے بھی انہیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ عربی اور فارسی زبانوں کی تعلیم کو اسکولوں سے نکال دیا گیا تھا اور نیا نصاب ہندوستانی مسلمانوں کو روزگار کے حصول کے لیے موزوں نہیں تھا۔ نئے نظام تعلیم کو ہندوستانیوں نے خاص طور پر مسلمانوں نے قبول نہیں کیا۔

انگریزوں نے انہیں ایک قابل رحم حالت میں پہنچا دیا، زیادہ تر 1857 کی بغاوت میں مسلمانوں کی شرکت کی وجہ سے؛ بالآخر یہ مسلمانوں کے لیے ایک مکمل تباہی تھی"[1] مسلمانوں نے بھی تاریخی وجوہات کی بنا پر اور اپنے تعصّبات کی وجہ سے مغربی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی۔''[2] انہوں نے انگریزی تعلیم کو ترک کر دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے ان کی عیسائیت میں تبدیلی آئے گی۔[3] چنانچہ ان کی سوچ اور تعصّبات نے ان کی ترقی کو نقصان پہنچایا۔ بغاوت کی ناکامی کے نتیجے میں نہ صرف اختیارات کی تبدیلی بلکہ مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم موڑ بھی تھا۔ پرانی روایات کا خاتمہ ہوا اور نئی روایات کا آغاز ہوا اور ایک نیا معاشی، تعلیمی اور سماجی نظام وجود میں آیا۔ موجودہ حالات میں ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی بقا کی امیدیں کھو دیں۔ لہٰذا وقت کا تقاضا تھا کہ علمی، مذہبی، سماجی، فکری، علمی تحریکیں شروع کی جائیں۔ مسلم معاشرے کی سیاسی اور ثقافتی تخلیق نے اس نازک حالت کے نتیجے میں سرسید احمد خان ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ان کی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے امید کی کرن بن کر ابھرے۔

ہندوستان میں جس شخص نے تعلیم کو نئی شکل اور اردو نثر کو نئی صورت عطا کی اس کا نام سرسید احمد خاں ہے۔ جدید تعلیم کے محرک اور جدید اردو نثر کے بانی سرسید احمد خاں نے صرف طرز تحریر ہی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کے طرز احساس کو بھی بدلا۔ انہوں نے سائنسی، معروضی اور منطقی طرز فکر کو فروغ دیا، عقلیت کی بنیادیں مضبوط کیں۔ ان کی تحریک نے شاعروں اور نثر نگاروں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ سرسید کا شمار ہندوستان کے عظیم ریفارمرس میں ہوتا ہے۔ سرسید احمد خان ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ وہ ایک سیاسی رہنما، سماجی مصلح، مذہبی مفکر اور ماہر تعلیم بھی تھے۔ وہ 19 ویں صدی کے ہندوستان کے سب سے ممتاز مسلم دانشور تھے۔ جس نے مسلمانوں کو ان کی ابتر حالت سے نکالنے کے لیے زندگی کے آخری دم تک کوشش کی۔" [4]

سرسید احمد خان نے اپنے خیال کا اظہار کیا کہ تعلیم انسانی شخصیت کی ہمہ گیر نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیتے ہوئے انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم کے بغیر انسانی روح سنگ مرمر کے کھردرے ٹکڑے کی مانند ہے اور جب تک مجسمہ ساز اس پر کام نہیں کرتا اور اس کے کھردرے پن کو دور نہیں کرتا... اس کی خوبیاں اس میں پوشیدہ رہتی ہیں۔ اور اس کی دلفریب چھائیاں، خوبصورت رگیں..... نظر نہیں آتیں۔ ان کا خیال تھا کہ صرف تعلیم ہی انسانی شخصیت کو نکھار سکتی ہے۔

سرسید احمد خان کے قائم کردہ تعلیمی ادارے

سرسید احمد خان انیسویں صدی کے ہندوستان کے ایک جدیدیت پسند اور ممتاز مسلمان مصلح تھے۔ پہلا جدید مسلمان ذہن ہونے کے ناطے، وہ یورپیوں کی حیرت انگیز ہمہ جہت ترقی سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ گہرے دماغ اور اعلیٰ اخلاقی قوت کے آدمی تھے، اس لیے ماضی کی روایات اور جدیدیت کی اقدار دونوں کو آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ وہ ایک سماجی مصلح، مذہبی، سیاسی اور تعلیمی مفکر تھے جنہوں نے ہماری قومی زندگی کے تمام شعبوں پر گہرا اثر ڈالا۔ اپنی پوری زندگی جہالت کے خاتمے اور معاشرے کی بہتری کے لیے جنونیت، قدامت پرستی اور روایت پرستی کے خلاف جدوجہد کی۔ انہوں نے ایک ایسے نظام تعلیم

ڈاکٹر تبسم نگار، پی۔ جی۔ ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

کی وکالت کی جس میں ذہن اور اخلاق دونوں کی تربیت کو یکساں اہمیت دی جائے۔انہوں نے اندرونی ضمیر کی آزادی اور خیالات کے اظہار کی آزادی کی بھی وکالت کی۔تاراچند کہتے ہیں-"سرسید احمد نے مسلم فکر میں ایک انقلاب کا آغاز کیا۔ان کی کوششیں انفرادی اور اجتماعی طور پر مسلمانوں کی اصلاح تھیں۔۵ وہ 1857 کی بغاوت اور ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی بگڑتی ہوئی اور مخدوش حالت کے عینی شاہد تھے۔اپنے وقت کے موجودہ حالات پر غور کرنے کے بعد انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عصری مسلم معاشرے میں موجود تمام برائیوں کا علاج صرف تعلیم ہی کر سکتی ہے۔29 جنوری 1884 کو امرتسر میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''اگر حکومت نے ہمیں ابھی تک کچھ حقوق نہیں دیے جن کی ہم شکایت کر سکتے ہیں، تو انہیں ہمیں وہ حقوق دینے کا پابند بنانا ہوگا-اعلیٰ تعلیم ایک ایسی چیز ہے جو بہت ہوشیاری سے کی جائے گی۔''۶ تعلیم کے لیے ان کی جدوجہد 1857 کی جنگ کے فوراً بعد شروع ہوئی۔انھوں نے وقت کی ضرورت کے ساتھ قائم کی گئی مختلف تحریکوں اور اداروں کے ذریعے بہت زیادہ تعاون کیا، جو اس طرح ہیں۔

مرادآباد میں قائم فارسی مدرسہ

تعلیمی ترقی کے لیے سرسید احمد خان کی پہلی کوششوں کا آغاز 5 نومبر 1859 کو مرادآباد میں ایک مدرسہ کے قیام سے ہوا۔اسے فارسی مدرسہ بھی کہا جاتا تھا۔مرادآباد میں انہوں نے انگریزی اور اردو میں ایک چھوٹا سا پمفلٹ لکھا جس میں تعلیم کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر زور دیا گیا اور ساتھ ہی حکومت کے ذریعے چلائے جانے والے روایتی تعلیمی نظام پر تنقید کی اور اسے معاشرے کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی قرار دیا۔انہوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ انگریزی زبان میں تعلیم فراہم کی جائے، تاکہ ہندوستانی اس سے حقیقی فائدہ اٹھا سکیں۔مرادآباد سے ہی ان کی سماجی تعلیمی ترقی میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ انہوں نے تعلیم کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا، جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ تعلیم انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہونی چاہیے۔ہندوستان میں روایتی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی تعلیم دینے کا مشورہ دیا۔۷ انہوں نے حکومت کی تعلیمی پالیسی پر بھی تنقید کی جس کا مقصد ایسی تعلیم فراہم کرنا ہے جو صرف لوگوں کو اپنی روزی روٹی کمانے کے قابل بنائے۔انہوں نے کہا کہ تعلیم کا بنیادی مقصد عقل کو بیدار کرنا اور ایک روشن خیال اور مربوط اخلاقی شخصیت کی تشکیل میں معاونت کرنا ہے۔بعدازاں اس مدرسہ کو تحصیل مدرسہ کے ساتھ ضم کر دیا گیا جس کی بنیاد مسٹر سٹریچی نے رکھی تھی۔

غازی پور میں وکٹوریہ سکول کا قیام

سرسید احمد خان کو مرادآباد سے غازی پور منتقل کر دیا گیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ سماجی اور تعلیمی بیداری کے بغیر مسلمانوں کی ترقی ناممکن ہے۔یہاں انہوں نے 'تبعین الکلام' مرتب کیا اور لوگوں کی حالت بہتر بنانے اور معاشرے سے ناخواندگی کو دور کرنے کے اقدامات پر غور کیا۔1863 میں اس نے سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور انگریزی کاموں کے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے ایک اسکیم تیار کی۔1864 میں انہوں نے غازی پور میں ایک مدرسہ قائم کیا ...اس مدرسہ میں پانچ زبانوں انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت میں تعلیم دی جاتی تھی۔۸

اپنے تعلیمی سفر میں آگے بڑھتے ہوئے "سائنٹیفک سوسائٹی" کے قیام کے دو ماہ بعد 1864 میں سید احمد نے غازی پور میں ایک اسکول قائم کیا۔"۹ اس اسکول کا سنگ بنیاد راجہ دیو نارائن سنگھ اور مولانا محمد فصیح الفت نے رکھا تھا۔جو ان کے تعلیمی پروگرام میں ہندو مسلم تعاون کو ظاہر کرتا ہے۔بعد میں، راجہ دیو نارائن سنگھ کو اسکول کا سرپرست اور نگہبان منتخب کیا گیا۔اس موقع پر سرسید احمد خان نے ایک طویل اور متاثر کن تقریر دی، جس میں انہوں نے نئی پیش رفت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''اپنے ہم وطنوں میں تعلیم کی روشنی پھیلانے اور چھائے ہوئے اندھیروں اور جہالت کے بادلوں کو ہٹانے کے لیے تعلیم ناگزیر ہے، جو نہ صرف ہمارے اور ہمارے ہم عصروں کے لیے بلکہ آنے والی نسلوں، ہمارے بیٹوں اور بیٹوں کے لیے بھی سودمند ثابت ہوگا۔وہ اس حقیقت کی زیادہ تعریف کرتے ہیں کہ یہ اسکول بغیر کسی بیرونی مدد کے قائم ہو سکتے ہیں۔''۱۰ اس مدرسہ میں انگریزی، اردو اور فارسی کے مضامین کے علاوہ تمام طلبہ کو سنسکرت بھی پڑھائی جاتی تھی۔یہ سب کچھ ہندو مسلم اتحاد، باہمی افہام وتفہیم اور بھائی چارے کے سرسید احمد کے گہرے وژن کی عکاسی کرتا ہے، جسے وہ ملک کی تعلیمی ترقی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ایک بار انھوں نے کہا تھا-''کسی قوم کی ترقی کے لیے سب سے پہلی ضرورت سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان بھائی چارہ اور اتحاد ہے۔''۱۱ بعد میں اس مدرسہ کو ہائی اسکول میں تبدیل کر دیا گیا، جسے غازی پور کے 'وکٹوریہ ہائی اسکول' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

سرسید احمد خان کو 1864 میں غازی پور سے علی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ یہیں انہیں اپنے تعلیمی، ثقافتی، سماجی نظریات اور امنگوں کو شکل دینے کا موقع ملا۔ لیکن سرسید احمد خان کی غیر موجودگی میں 'سائنٹفک سوسائٹی' نے اپنا وقار کھو دیا، اس لیے وہ اپنے ساتھ اپنا دفتر علی گڑھ لے آئے۔ علی گڑھ میں انہوں نے مسیح قبرستان کے قریب اپنی رہائش کے لیے ایک بنگلہ خریدا اور اس میں 'سائنٹیفک سوسائٹی' قائم کی۔[12] مارچ 1866 میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کا ایک رسالہ بھی شروع کیا جس کا نام 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' رکھا۔[13] شروع میں یہ ہفتہ وار تھا لیکن بعد میں یہ ہفتہ میں دو بار شائع ہونے لگا۔ اس کی ایڈیٹنگ اور پرنٹنگ کی ذمہ داری انہوں نے سنبھالی۔ سوسائیٹی کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری خود پر ڈالی، چند ایک کو چھوڑ کر انہوں نے خود مضمون لکھے۔ اگست 1867 میں بنارس منتقل ہونے پر انہوں نے سوسائٹی کا کام راجہ جے کشن داس کے سپرد کر دیا جو اس وقت علی گڑھ کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اس گزٹ کی پہلی جلد کو ان کے سیاسی کاموں کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ اس گزٹ کا بنیادی مقصد ایک طرف برطانوی حکومت کو ہندوستانیوں کی ابھرتی ہوئی سوچ اور ان کے حالات سے آگاہ کرنا تھا اور دوسری طرف ہندوستانیوں کو برطانوی حکومت کے طریقوں اور تکنیکوں سے روشناس کرانا تھا، تاکہ وہ سیاست میں حصہ لے سکیں۔ سرسید احمد کی وفات کے بعد یہ گزٹ اپریل 1898 میں کالج میگزین میں شامل کیا گیا اور اب اس کا پورا نام 'ایم۔ اے۔ او۔' کالج میگزین سے یہ ترقی کے ساتھ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بن گیا۔ 5 جنوری 1921 کو جب یہ ایک کالج سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنی تو اسے دوبارہ 'مسلم یونیورسٹی گزٹ' کا نام دیا گیا۔ لیکن مئی 2004 (جلد 41، نومبر 5) کے شمارے سے اس کا نام دوبارہ 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گزٹ' رکھ دیا گیا۔

تہذیب الاخلاق

ہندوستان میں مغربی تعلیم کے پھیلاؤ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں میں مذہبی توہم پرستی اور انگریزی تعلیم کے تئیں ان کی نفرت تھی۔ ان کے تعصّبات کو دور کرنے کے لیے سرسید احمد خان نے 'تہذیب الاخلاق' کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا، جس کا مقصد امت مسلمہ کو اپنی تنگ نظری سے نکل کر زمانے کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دینا تھا۔ انہوں نے 24 دسمبر 1870 کو رسالہ "تہذیب الاخلاق" نکالنا شروع کیا۔[14] ان کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی مذہبی سوچ میں بہتری لانا اور ان کی ترقی میں واپس لانا تھا۔ سرسید تقریباً 6 سالوں تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ اس اخبار کی مدد سے انہوں نے مسلمانوں کو ان کے بنیادی اصولوں سے واقف کروایا جن پر یورپی تہذیب قائم ہوئی۔ ہالانکی، یہ جرنل بنیادی طور پر جدید اور وقت کی ضرورت کے مطابق تھا۔

سرسید احمد کے کنٹرول کے بعد، اسے 1907 تک محسن-الملک کے زیر اثر اور شائع کیا گیا۔ محسن-الملک کے بعد، وحید-عود-دین سلیم نے جنوری 1909 تک آپ کی نشریات جاری رکھیں، لیکن پھر اس کی اشاعت بند کر دی گئی۔ فروری، 1982 میں، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید حامد نے تقریباً 73 سالوں کے بعد اس تحریر دوبارہ شروع کی۔

مدرسات العلوم

اگست 1867 کو سرسید احمد خان کو عدالت کے جج کے طور پر ترقی دے کر بنارس منتقل کر دیا گیا۔ جہاں فروری 1873 میں بنارس میں مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں سرسید احمد خان کے بیٹے سید محمود نے مدرسۃ العلوم کی سرپرستی میں ایک اسکول قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ 24 مئی 1875 کو مدرسۃ العلوم کا سنگ بنیاد علی گڑھ کے ماتحت جج مولوی سمیع اللہ خان نے رکھا۔[15] جس کی کلاسز کا آغاز یکم جون 1875 کو ہو گیا۔ 24 مئی 1875 تک چار طالب علموں کا داخلہ ہوا۔ سرسید نے ایک ایک کر کے چار طلباء کا تعارف کرایا۔"[16] اس وقت یہ اسکول میٹرک کے امتحان کے لیے کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک تھا اور اس کے پہلے بیچ کے چار طلبہ محبوب عالم، ہرناتھ سنگھ، عشرت حسین اور عبدالمجید 1877 میں حاضر ہوئے، اور ان سب کو پاس قرار دیا گیا، محبوب عالم ان میں پہلے نمبر پر آیا۔[17] وقت کے ساتھ ساتھ طلباء کی تعداد 1876 میں 71 سے بڑھ کر 1877 میں 123 ہو گئی۔

اسکول کو شروع سے ہی رہائشی سہولیات فراہم کی گئی تھیں اور بنگلہ نمبر 1، (موجودہ موریسن کورٹ) مدرسۃ العلوم کے بورڈنگ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔[18] 12 نومبر 1875 کو لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم مور، نے اپنی اہلیہ کے ساتھ اسکول کا دورہ کیا اور کمیٹی کے کام کی تعریف کرتے ہوئے تقریر کی اور

سرسید کو ان کی عمر بھر کی خواہش کی تکمیل پر خصوصی مبارکباد دی۔[19] مدرسۃ العلوم کے قیام کے صرف ایک سال بعد، سرسید کالج کی بہتری اور ہندوستانی مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر وقف کرنا چاہتے تھے، جس کے لیے انھوں نے جولائی 1876 میں 59 سال کی عمر میں سرکاری خدمات سے ریٹائرمنٹ لینے کا فیصلہ کیا۔[20]

سائنٹفک سوسائٹی

سرسید احمد خان نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جدید تعلیم کو اپنانے اور مغربی علم حاصل کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، جس کے لیے انہوں نے 1863 میں ایک مونوگراف لکھا۔

'APetition to the People of India Concerning the Development of Their Education'

جس میں انہوں نے سختی سے استدلال کیا کہ ہندوستانیوں کو مغربی علم کا انتخاب کرنا چاہئے کیونکہ یہ واحد راستہ ہے جس سے وہ اپنی ترقی کے دروازے کھول سکتے ہیں۔[21] مغربی نظام تعلیم کو اپنانے سے یقیناً باہمی افہام وتفہیم بڑھے گی اور اس کے لیے برطانوی اور ہندوستانی دونوں کو ملا کر ایک معاشرہ قائم کیا جانا چاہیے۔ اس لیے انھوں نے مشورہ دیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان مغربی فن اور سائنس سے اچھی طرح واقف ہو جائیں تو وہ یقیناً اپنی معاشی، سماجی اور سیاسی حالت کو بہتر بنا سکیں گے۔[22] درحقیقت ان کے لیے مغربی تعلیم ہی مستقبل کی خوشحالی کی کلید تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ کام انگریزی سے اردو میں چند اہم کتابوں کے ترجمے کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود، ان کے پروجیکٹ کا مقصد مسلم کمیونٹی کو سیکھنے سے حوصلہ شکنی کرنا نہیں تھا۔ اس کے لیے انگریزی زبان کی اہمیت صرف یہ تھی کہ مغربی علم کو ہندوستان کے لوگوں کی پہنچ میں لایا جائے۔[23]

علی گڑھ کی 'سائنٹفک سوسائٹی' کا آغاز سید احمد نے 9 جنوری 1864 کو غازی پور میں کیا تھا۔[24] سرسید احمد خان 1864 میں علی گڑھ آئے تھے۔ چونکہ وہ سماج کا محور تھا، اس لیے ان کی غیر موجودگی میں یہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر تھا، اس لیے اسے اپریل 1864 میں علی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ علی گڑھ کے جج ڈبلیو جے۔ برملے اس کا صدر منتخب ہوا۔ اب اس سوسائٹی کے لیے الگ عمارت تعمیر کی گئی۔ 14 فروری 1866 کو میرٹھ کے کمشنر .Mr ولیمز نے افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا اور ہندوستان میں علم اور تعلیم کو مقبول بنانے میں سید احمد خان کی مخلصانہ کوششوں کو شاندار خراج تحسین پیش کیا۔ اس معاشرے کا بنیادی مقصد "جہالت کے اندھیروں کو ختم کر کے ایک مہذب صبح کا آغاز کرنا تھا، جو کہ زمانے سے ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ سرسید احمد خان کے کاموں اور کوششوں کی تعریف کرتے ہوئے گراہم نے کہا، ''ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک مسلم شریف آدمی نے بغیر کسی مدد کے، اس کے بارے میں سوچا اور اس مقصد کے لیے ایک سوسائٹی کا آغاز کیا، جس نے مغربی دنیا کے ممالک اور ادب کو مشرقی لوگوں کی وسیع تر رسائی میں لانا تھا۔ کے۔ اے۔ نظامی اس سوسائٹی کے قیام کے پس پردہ روح کے بارے میں لکھتے ہیں۔'' یہ سرسید کی جانب سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مشترکہ غیر متنازعہ پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی مخلصانہ کوشش تھی۔[25]

یہ واضح ہے کہ اس معاشرے کا نقطہ نظر مذہب یا فرقہ پرستی سے پاک تھا، یعنی اس کا نقطہ نظر مکمل طور پر سیکولر تھا۔ سوسائٹی نے اپنے قیام کے دن سے ہی ترجمے کا کام شروع کیا تھا، اور اس نے بعض معتبر مغربی کتابوں کے اردو میں مستند ترجمہ کو یقینی بنانے، عام دلچسپی پیدا کرنے والے موضوعات پر لیکچرز کا اہتمام کرنے اور ملک کی سماجی سرگرمیوں سے لوگوں کو بیدار کرنے کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ سیاسی مسائل پر اخبارات کی اشاعت میں بہترین کام کیا۔ 1866 میں، سوسائٹی نے ایک دولسانی اخبار-'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' شروع کیا- سرسید احمد خان کی کوششوں سے انگریزی میں بہت سے اہم اور قیمتی کاموں کا اردو میں ترجمہ ہوا۔ سوسائٹی کے زیر اہتمام زراعت، الجبرا، بجلی، میکانکس، جغرافیہ، جیومیٹری، ہائیڈرولوجی، تاریخ، فلسفہ، پولیٹیکل اکانومی، پولیٹیکل سائنس اور نیومیٹکس وغیرہ پر چالیس سے زائد کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ 1866 میں سوسائٹی کی طرف سے سبسکرائب کیے گئے میگزین اور پیپرز کی تعداد 44 تک پہنچ گئی۔ ان میں سے 18 اخبارات اور رسائل انگریزی میں تھے اور باقی اردو، فارسی اور سنسکرت میں تھے۔ ان کاموں کے علاوہ، سوسائٹی نے خواتین کی تعلیم، شادی کے بل، مقامی ذریعہ سے سائنس کی تعلیم اور ریلوے کے کام کو بہتر بنانے وغیرہ پر بہت سے خصوصی لیکچرز کا بھی اہتمام کیا تھا۔ ایک باغ، لائبریری، ریڈنگ روم، پریس

اور لیبارٹری۔ درحقیقت، سرسید کے اطمینان کے لیے، 'سائنٹیفک سوسائٹی' کو برطانوی حکام کے ساتھ ساتھ کچھ مقامی سٹالورٹس، مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرف سے بہت ہی قابل تعریف جواب ملا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' اور 'تہذیب الاخلاق' کے علاوہ، جس نے مسلمانوں کو ثقافتی، سماجی اور تعلیمی طور پر بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا، یہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تھا۔ سرسید احمد خان جب اپنی تعلیمی تحریک کے عروج پر تھے، انہوں نے 8 جنوری 1877 کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی۔ بعد ازاں 1920 میں یہ کالج ایک یونیورسٹی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ میں تبدیل ہو گیا- تیسری، اور اہم بات، اگرچہ کالج کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تھا، لیکن یہ بنیادی طور پر مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقف تھا، پھر بھی ان کا خیال تھا کہ اس کے دروازے تمام ہندوستانیوں کے لیے کھلے ہونے چاہئیں۔ انہوں نے اسے ایک کمیونٹی ادارے کے طور پر تصور کیا نہ کہ ایک فرقہ وارانہ ادارے کے طور پر۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہاں ایک طرف یہ کالج ہندوؤں کے لیے کھولا گیا تھا وہیں دوسری طرف اس ادارے کی ترقی میں بھارتی ریاستوں کے حکمرانوں جیسے پٹیالہ اور وجیانگرم کے مہاراجہ نے بھی سہولت فراہم کی تھی، یعنی اس میں فرقہ واریت کا کوئی ٹنگ نہیں تھا۔[۲۶]

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

سرسید احمد خان نے 1886 میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا افتتاح کیا، جسے بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کہا گیا، یہ محسوس کیا گیا کہ ایک تعلیمی ادارہ ہندوستان کی پوری مسلم آبادی کی تعلیمی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔ مسلم کمیونٹی میں تعلیمی ماحول پیدا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مختلف علاقوں اور ریاستوں کے لوگ ایک دوسرے سے مل سکیں اور قومی تعلیم اور ترقی پر نظریاتی بات چیت کر سکیں۔ علی گڑھ کو اس کانفرنس کے مستقل ہیڈ کوارٹر کے طور پر چنا گیا، کیونکہ سرسید احمد خان اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج نے خود اپنی سرگرمیوں کی قیادت فراہم کی۔ اس کے سالانہ اجلاس دسمبر کے آخری ہفتے میں مختلف مقامات پر ہونے والے تھے، جب تقریباً تمام دفاتر کرسمس کے لیے بند ہوتے تھے۔[۲۷]

یہ کانفرنس سرسید احمد خان نے قائم کی تھی اور اس کا پہلا اجلاس ایم اے او کالج میں منعقد ہوا تھا۔ 27 دسمبر 1886 کو، علی گڑھ۔ الطاف حسین حالی کے مطابق، شروع میں، کانفرنس کا قیام مندرجہ ذیل مقاصد کے ساتھ کیا گیا تھا—

- مسلمانوں کو اعلیٰ ترین مغربی تعلیم فراہم کرنے کی کوشش کرنا۔
- انگریزی اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی حالت کی چھان بین کرنا جو مسلمانوں نے اپنی تعلیم کے لیے قائم کیے تھے اور تعلیمی حالت کو مزید بہتر بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا۔
- مشرقی تعلیم اور الٰہیات کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس طرح کے مطالعے کے تسلسل اور دیکھ بھال کے لیے مناسب منصوبہ بندی کرنا۔
- مکتبوں میں مروجہ تعلیم کے روایتی طریقوں کا جائزہ لینا اور ایسے اداروں کے معیار کو بلند کرنے اور بہتر بنانے کے لیے منصوبے بنانا۔[۲۸]

کانفرنس کے قیام اور اس کی ضرورتوں اور مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے، بی شیخ علی نے مختصراً کہا-"وہ (سرسید) چاہتے تھے کہ علی گڑھ میں تعلیم کی مشعل روشن ہوتا کہ اس کی روشنی ملک کے چاروں کونوں تک پھیل جائے۔ مسلمانوں کی جہالت، ہر گھر تک یہ پیغام پہنچانا تھا کہ تعلیم سے بڑی کوئی دولت نہیں، جہالت سے بڑی کوئی غربت نہیں اور تعلیم میں سرمایہ کاری سے بڑی کوئی سرمایہ کاری نہیں۔[۲۹] اس میں پرائمری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کی تعلیم شامل تھی۔ سرسید کو متفقہ طور پر کانفرنس کا سیکرٹری منتخب کیا گیا، اور یہ بھی طے پایا کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے اعزازی سیکرٹری اس باوقار ادارے کے سیکرٹری ہوں گے۔ 27 دسمبر 1886 کو مولوی سمیع اللہ خان کو کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا، جو کے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے چیئرمین منتخب ہوئے۔[۳۰]

اس طرح تعلیم میں سرسید احمد خان کی خدمات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سیاست سے ہٹ کر ان کا بنیادی زور ہندوستانی معاشرے کی سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور ثقافتی ترقی پر تھا، خاص طور پر مسلمانوں کی طرف مغربی تعلیم کے خلاف اپنے تعصّبات کی وجہ سے اس وقت سب سے زیادہ پسماندہ

تھے۔ وہ صحیح معنوں میں مسلم کمیونٹی کے لیے تعلیم کے میدان میں بڑی تبدیلیوں کے ساتھ پیش پیش تھے۔ اس طرح ان کی تحریکیں ہندوستان کے لوگوں میں جدید تعلیم کو مقبول بنانے اور فراہم کرنے میں بہت اہم ثابت ہوئیں۔ یہ درست ہے کہ ان کی خصوصی توجہ ملک کے مسلم عوام پر تھی، لیکن یہ کوشش کسی بھی طرح فرقہ وارانہ نہیں تھی۔

☆☆☆

حواشی:

۱ قریشی، عشرت علی: علی گڑھ: ماضی اور حال، اشاعت ونگ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1992، ص24

۲ محمد، شان: علی گڑھ تحریک (ایک مختصر مطالعہ)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1999، ص18۔

۳ قریشی، عشرت علی: علی گڑھ: ماضی اور حال، شائع شدہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1992، ص24۔

۴ شان، محمد: سرسید عماد خان (ایک سیاسی سوانح عمری)، میناکشی پرکاشن، میرٹھ، 1969، ص32۔

۵ چاند، تارا: تحریک آزادی کی تاریخ، اشاعت ڈویژن، وزارت اطلاعات ونشریات، نئی دہلی، 1967، ص87۔

۶ خان، سرسید احمد: لیکچررز، ص189۔

۷ علی، بی شیخ: ایک لیڈر از سرنو تشخیص (سرسید احمد کی زندگی اور کام)، سلطان شہید ایجوکیشن ٹرسٹ پبلی کیشن، میسور، 1999، ص 1 1۔

۸ . محمد، شان: سرسید احمد خان (ایک سیاسی سوانح)، میناکشی پبلی کیشن، میرٹھ، 1969، ص51

۹ نظامی، کے اے: سید احمد خان، وحی، ص71

۱۰ ایضاً، ص63۔

۱۱ ایضاً، ص71۔

۱۲ محمد، شان: سرسید احمد خان (ایک سیاسی سوانح)، میناکشی پبلی کیشن، میرٹھ، 1969، ص51

۱۳ حسین، سوریا: سرسید احمد خان اور ان کا مجموعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1993، ص.233

۱۴ نظامی، کے اے: سید احمد خان، وحی، ص92

۱۵ محمد، شان: سرسید احمد خان (ایک سیاسی سوانح عمری)، ص75۔

۱۶ کالج کی تاریخ، علی گڑھ، (پیش لفظ)، ص 47۔ .M.A.O بھٹناگر، ایس۔ کے

۱۷ محمد، شان: سرسید احمد خان (ایک سیاسی سوانح عمری)، ص79۔

۱۸ محمد شان: سید احمد خان، ص84۔

۱۹ حالی، الطاف حسین: ص200۔

۲۰ خان، یوسف حسن: علی گڑھ سے منتخب دستاویزات، بمبئی، 1967، ص51۔

۲۱ محمد شان: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس،

۲۲ نظامی، کے اے: سید احمد خان، ص89۔

۲۳ محمد شان: علی گڑھ تحریک: بنیادی دستاویزات (1864-1898)، 3 جلدیں، میناکشی پرکاشن، میرٹھ، 1978، ص۔

۲۴ گراہم، جی ایف آئی: سید احمد خان کی زندگی اور کام، ص72

۲۵؎ نظامی، کے اے: سید احمد خان، وحی، ص 18-19

۲۶؎ شیروانی، ایچ کے: مسلم پولیٹیکل تھاٹ اینڈ ایڈمنسٹریشن، منشیرام منوہرلال، نئی دہلی، 1977، صفحہ 171۔

۲۷؎ محمد شان: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، A . P . H . پبلشنگ کارپوریشن، نئی دہلی، 2003

۲۸؎ حالی، الطاف حسین: حیات جاوید (انگلش ورژن)، صفحہ 167۔

۲۹؎ علی، بی شیخ: ص 92۔

۳۰؎ محمد شان: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، صفحہ 72

متحدہ قومیت کا تصور اور سرسید احمد خاں

ہندوستان ایک وسیع وعریض ملک ہے یہاں مختلف مذاہب، نسل، کلچر اور زبانوں کا سنگم ہے یہاں کی سب سے بڑی خوبی اور خوبصورتی اس کی تہذیبی تکثیریت اور ثقافتی رنگارنگی ہے۔ عام طور سے ایک رنگ ونسل، ایک علاقہ، ایک دین ومذہب، ایک تہذیب وثقافت، ایک زبان وادب اور ایک سرزمین وسرگزشت کے حامل گروہ کو قوم کہا جاتا ہے۔ وطن کے علاوہ ان میں سے ہر چیز داخلی حیثیت رکھتی ہے اور اضافی بھی مانی گئی ہے لیکن ان ہی چیزوں کے سبب لوگوں کے اندر باہمی اتحاد واتفاق اور دوستی و محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ جذبۂ قومیت کا تصور پوری طرح داخلی حیثیت رکھتا ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے پہلے یہاں کے باشندے نہایت محبت اور بھائی چارگی، امن وامان اور صلح سے رہتے تھے لیکن جب یہاں انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تو انہوں نے اپنی حکومت کی مضبوطی اور بقا کے لیے Devide and rule کی پالیسی اختیار کی اور یہاں کے باشندوں میں نفرت کا بیج بو دیا جس سے یہاں کی فضا فرقہ واریت سے مسموم ہوگئی جس کے نتیجے میں پہلی جنگ آزادی رونما ہوئی اور ملک مذہب، خاندان، قبیلے، وطن خصوصاً ہندو اور مسلم میں تقسیم ہوگیا۔ غرض وطنیت اور قومیت نقلی بناوٹی یا پیدائیشی نہیں بلکہ تاریخی چیزیں ہیں۔ جس ملک اور قوم کی یکجہتی اور رنگارنگی پر لوگ رشک کرتے تھے اور اس کی مثالیں دیتے ہوئے بڑا فخر محسوس کرتے تھے، حالات کے بدلتے ہی، یہی وطنیت اور قومیت لوگوں کے لیے جان کا جنجال بن گئی اور اس وقت سے دور حاضر تک قومی سالمیت کا مسئلہ اسی طرح بنا ہوا ہے۔ بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے۔

چنانچہ ان گمراہی اور خرابیوں کو دور کر کے ہندوستانیوں میں یگانگت اور اتحاد واتفاق پیدا کرنے کے سلسلے میں جو کوششیں ہوئیں ان میں سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس انتشار اور افتراق کے دور میں سرسید ایک واحد شخص تھے جنھوں نے اتحاد واتفاق اور متحدہ قومیت کا مکمل تصور پیش کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اتحاد ایک ایسی نعمت ہے جو ہر اعتبار سے ہر زمانے میں بے حد مفید ہے اور اس کے بغیر کسی قوم کا بہ حیثیت مجموعی اپنی مادی اور اخلاقی بہبودی کی منزل تک پہنچنا ناممکن ہے اسی لیے وہ ہمیشہ فلاح عام اور اشتراک باہمی پر زور دیتے ہوئے بار بار کہتے رہے کہ ''اے لوگو! تمہارے ملک کی مضبوطی اور خوبصورتی اسی میں ہے کہ تم متحد رہو اور مذہب کو اپنے آپسی نفاق کا ذریعہ نہ بناؤ۔'' سرسید کے اس تصور قومیت کے متعلق پروفیسر خلیق احمد لکھتے ہیں:

> ''غالباً آج بھی متحدہ قومیت کا تصور اس سے آگے نہیں پہنچا جہاں سرسید نے پہنچا دیا تھا۔ سرسید کی بنیادی فکر میں فرقہ واریت کے لیے کوئی جگہ نہ تھی، وہ مختلف فرقوں میں اتحاد وربط اور یگانیت کے قائل تھے۔''

چنانچہ اس مقالے کا آغاز سرسید کے تصور قوم سے متعلق پھیلی ہوئی گمراہی، مبالغے اور مغالطے کے ازالے سے کیا جائے گا۔ کیونکہ آج بھی سرسید کو دو قومی نظریہ کا حامی، بانی مدرسہ، مسلمانوں کا لیڈر، کافر، ملحد اور انگریزوں کا حمایتی تک کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ سرسید احمد خاں نے لفظ ''قوم'' کی اصطلاح کو کن معنوں میں لیا ہے؟ اور کیا وہ قوم سے مراد محض مسلمانوں کو لیتے تھے؟ اس حوالے سے امرتسر میں دی گئی ان کی تقریر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو کہ لفظ قوم سے واقعی ان کی مراد کیا تھی؟ کہتے ہیں:

> ''لفظ ''قوم'' سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس سے میں لفظ ''نیشن'' (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں۔ ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ ''ہندو'' یعنی ہندوستان میں رہنے والی قوم۔''

سرسید نے لفظ قوم کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتا دیا کہ وہ ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہندوستانیوں کیا تم ایک ملک میں نہیں رہتے؟ ایک ہی زمین پہ جیتے مرتے ہو، ایک ہی گھاٹ کا پانی پیتے ہو تو آپس میں یہ نفاق کیسا؟ وہ کہتے تھے ہندو اور مسلمان محض مذہبی امتیاز کی نشانی ہے

رخسار پروین، (ریسرچ اسکالر) الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

اور یہاں رہنے والے ہندو مسلم اور عیسائی بھی سب ایک ہی قوم ہیں۔اسی مناسبت سے ۱۸۸۳ء میں لاہور میں دی گئی ان کی تقریر کا ایک حصہ ملاحظہ ہو جس میں وہ ہندوؤں کی ایک جماعت سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان میں رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں، ہندو نہیں سمجھتے اہل ہندو صاحبان اپنے تئیں ہندو یعنی باشندۂ ہند خیال کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اجنبی خیال کرنے لگتے ہیں حالانکہ ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ہندو یعنی اہل ہند کے خطاب کے مستحق ہیں۔صاحبو! وہ زمانہ اب نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے اپنے ملک کے باشندے دو قومیں سمجھے جائیں۔''

لہٰذا سرسید نے یہ واضح کر دیا کہ وہ فرقہ واریت سے بہت دور تھے اور تمام ہندوستانیوں کو ایک ہی قوم تصور کرتے تھے۔انہوں نے اپنی متعدد تحریروں اور تقریروں میں قوم کی وضاحت کرتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ملک کے باشندے ہونے کی حیثیت سے ایک قوم قرار دیا ہے اور قوم کی پہچان مذہب کے بجائے وطن کو قرار دیا ہے۔اس ضمن میں سرسید کی ۱۸۸۳ء میں پٹنہ میں دی گئی ایک تقریر کا وہ مشہور اقتباس پیش کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو ان کی متحدہ قومیت کی ایک عمدہ مثال ہے جس میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی پرزور حمایت کی ہے اور ہندوستان کو مثل دلہن کے تصور کیا ہے۔کہتے ہیں:

''ہندوستان ایک دلہن کے مانند ہے، جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں، ہندو اور مسلمان ہیں۔اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جاوے گی اور ایک دوسرے کو برباد کریں گے تو وہ کانی ہو جاوے گی، پس اے ہندوستان کے رہنے والو ہندو مسلمانو! اب تم کو اختیار ہے کہ چاہے اس دلہن کو بھینگا بناؤ، چاہے کانا۔''

چنانچہ سرسید نے اپنے اس نظریہ قومیت کو بارہا دہرایا ہے کہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل بھائی اور دلہن کی آنکھوں کی مانند سمجھتا ہوں اور ان دونوں میں ہرگز کوئی اختلاف پیدا کرنا نہیں چاہتا ہوں البتہ دونوں کو متحد کرنے کی کاوشیں کرتا ہوں کیونکہ ایک ملک میں رہنے کی وجہ سے سب ہندوستانی ہیں اس طرح سرسید نے ہمیشہ ملکی ترقی اور فلاح کی بات کی اور یہ بھی سچ ہے کہ انیسویں صدی سے دورِ حاضر تک ہم جائزہ لیں تو سرسید سے زیادہ کوئی بھی شخص یا کوئی بھی تحریک ہندو مسلمان کے درمیان اتحاد و اتفاق پر اس قدر زور نہیں دیتیں جیسا کہ سرسید نے دیا ہے۔سرسید اتحاد و اتفاق کے اس حد تک حامی تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں محبت اور بھائی چارگی برقرار رکھنے کے خاطر مسلمانوں کو گئوکشی بند کرنے کی تلقین کرتے تھے تاکہ آپسی بھائی چارہ برقرار رہے۔ اس حوالے سے کہتے ہیں:

''اس امر کا مجھ سے زیادہ کوئی خواہاں نہیں ہوگا کہ مذہبی معاملات میں بھی اتفاق اور دوستی پیدا ہونا چاہئے۔اپنی قوم کو میں نے اکثر سمجھایا ہے کہ ہندوؤں کی دل آزاری کی نیت سے گائے کی قربانی کرنا ایک غیر مہذب حماقت ہے۔ہم میں اور ان میں دوستی پیدا ہو سکے تو گائے کی قربانی سے وہ کہیں زیادہ قابل ترجیح ہے۔''

سرسید نے اسی زمانے میں علی گڑھ میں گائے کی قربانی پر پوری طرح پابندی لگا دی تھی۔اب اس سے زیادہ ان کی غیر جانب داری اور مذہبی رواداری کا کیا ثبوت ہوگا۔سرسید پوری کوشش کرتے تھے کہ وہ اتحاد کا ایسا ماحول بنا سکیں جو دونوں قوموں کے لیے ترقی اور خوشحالی کے اسباب مہیا کرے اور اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا کہ ایک قوم کا فائدہ دوسری قوم کے لیے نقصان کا سبب نہ بنے یعنی وہ دونوں مذاہب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے تھے۔اس حوالے سے کہتے ہیں:

''میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں، اس کہنے کو بھی پسند نہیں کرتا کیونکہ لوگ علی العموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دائیں آنکھ قرار دیں گے اور دوسرے کو بائیں آنکھ کہیں گے، مگر میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بطور ایک آنکھ سمجھتا ہوں۔اے کاش! میرے صرف ایک آنکھ ہوتی کہ اس حالت میں عمدگی کے ساتھ ان کو اس ایک آنکھ کے ساتھ تشبیہ دے سکتا۔''

سرسید کو اپنے ملک ہندوستان سے بے پناہ الفت اور محبت تھی البتہ انہوں نے تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ قوم کا وہ تصور ملک میں پیش کیا جس میں کسی قوم کی اصل پہچان مذہب وتہذیب کے بجائے ملک سے قائم ہوتی ہے اور قوم کا یہ ہمہ گیر تصور پیش کرنے کے ساتھ ہی ملک کو یہ پیغام دیا کہ اگر وہ واقعی ملک کی ترقی اور خوشحالی چاہتے ہیں تو مذہب اور نسل کے فرق سے اوپر اٹھ کر سیکولرزم کو زندگی کا مقصد بنائیں تبھی ہمارا ملک ترقی کر سکتا ہے۔اس ضمن میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ایک اشاعت میں لکھا ہے۔

''یہ ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان کے ہندو مسلمان میں اس قسم کی دوستی و برادری اور محبت روز بروز بڑھتی جائے اور سوشل حالات میں ایسی ترقی ہو کہ مسلمان بجز مسجدوں کے اور ہندو بجز مندروں کے پہچانے نہ جائیں۔''

اسی مناسبت سے دوسری جگہ کہتے ہیں:

''اے عزیزو! جس طرح ہندوؤں کی قومیں اس ملک میں آئیں، ہم بھی آئے ہم نے بھی اسے اپنا وطن سمجھا مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں دونوں نے مل کر ایک نئی زبان پیدا کر لی جو نہ ہماری تھی نہ ان کی بہ اعتبار اہل وطن ہونے کے دونوں ایک ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے۔''

عام طور سے سرسید تحریک خصوصاً علی گڑھ کالج کے قیام کو دو قومی نظریے کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے کہ یہ کالج محض مسلمانوں کی تعلیم کے لیے بنایا گیا ہے اس کی تردید میں سرسید کے تصور قومی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق کی سب سے بڑی مثال اور دلیل ان کا قائم کردہ یہی ادارہ ایم۔اے۔او کالج ہے جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔اس کالج کا سنگ بنیاد رکھتے وقت ہی سرسید نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ ادارہ جس کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا ہے، باہمی رواداری اور ترقی کے اصول پر مبنی ہوگا۔ چنانچہ سرسید نے اس کالج کی بنیاد میں قومی یکجہتی اتحاد غیر جانب داری، مذہبی رواداری اور بے تعصبی کی اینٹ لگا کر ایسی عمارت تیار کی جس کی مثال ہندوستان میں ملنا مشکل ہے۔سرسید کے غیر مسلم معاصرین سے بھی نہایت عمدہ مراسم تھے اور ایم۔اے۔او۔کالج کے چندے میں ہندو مسلم نے برابر سے چندے بھی دیئے نیز یہ بات بھی نہایت دلچسپ اور غور طلب ہے کہ ایم۔اے۔او۔کالج کے قیام کے بعد سب سے پہلا سپاس نامہ سرسید نے کسی مسلمان کو نہیں بلکہ ایک سکھ یعنی مہاراجہ سر مہندر سنگھ (پٹیالہ کے مہاراجہ) کی خدمت میں پیش کیا جو ان کی بے تعصبی کی ایک عمدہ مثال اور دلیل ہے۔اس سپاس نامے میں سرسید نے کالج کے متعلق جو پالیسی، تدبیر اور دور اندیشی کا اظہار کیا ہے وہ قابل غور ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اس مدرسے کے جو قواعد تعلیم قرار پائے ہیں ان کے موافق ہندو اور مسلمان دونوں اس مدرسے میں تعلیم پائیں گے۔اس کے بانیوں کا مقصد ہندوستان میں علم و روشن ضمیری پھیلانے کا ہے۔اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی دونوں قومیں یعنی ہندو اور مسلمان دونوں برابر ترقی کریں اور علم و ہنر سے فیض یاب ہوں۔''

اس سپاس نامے کا مہاراجہ پٹیالہ نے جو جواب دیا اس کا ایک حصہ پیش کیا جا رہا ہے:

''اس سوسائٹی کا یہ مقصد ہے کہ اہل ہند خواہ کسی ملت و مشرب کے ہوں، ان کو فائدہ پہونچے اور مدرسۃ العلوم کی تدبیر میں اس سے بھی عمدہ اصول کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس میں تعلیم علوم عقلیہ کی بلا اختلاف ملت و مذہب یکساں ہو۔میری دانشت میں آپ بانیوں کی یہ دانش مندانہ تدبیر بالتخصیص نہایت عمدہ ہے۔''

مدرسۃ العلوم کے قیام کے متعلق سرسید کی امرتسر میں دی گئی تقریر کا ایک حصہ ملاحظہ ہو جو ان کے تصور قومیت کی ایک عمدہ مثال اور متعصب و تنگ نظر لوگوں کے لیے جواب بھی ہے اور ان کے متعلق پھیلی ہوئی گمراہی و مغالطے کا بھرپور ازالہ بھی کرتی ہے۔کہتے ہیں:

''مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہے بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی سے ہیں اس میں ہندو مسلمانوں پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے دونوں کو دی جاتی ہے۔ہم لوگ

آپس میں کسی کو ہندو کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹو (Native) یعنی ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ غیر ملک والے خدا بخش اور گنگا رام دونوں کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ غیر ملکوں میں جب ہم لوگ جاتے ہیں تو ہندو اور مسلمان کے نام سے نہیں پکارے جاتے ہیں بلکہ نیک دل لوگوں سے نیٹو یعنی ہندوستانی کا اور تنگ دل لوگوں سے نیگرو یعنی کالے منھ یا وحشی ہندوستانی کا لقب دونوں کو برابر ملتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پاویں۔ ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں، ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پاویں ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لیے موجود نہ کیے جاویں ہماری عزت نہیں ہوسکتی مدرسۃ العلوم قائم کرنے میں میرا یہی مطلب تھا ۔میں ان لوگوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس میں مدد کی۔ اس مد میں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں ہوں جس قدر ہندوؤں کا ہوں۔''

چنانچہ سرسید نے خود متعدد جگہ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہ ادارہ ہندو اور مسلمان دونوں کی فلاح و ترقی کے لیے ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارے ملک اور وہاں کے باشندوں کے لیے ہندو مسلم اتحاد ہی راہِ نجات ہے اور اسی اتحاد کے لیے انہوں نے تاعمر کوششیں کیں تاکہ ہندوستان ترقی کی راہوں پر گامزن ہو۔ اس ضمن میں سرسید کے چند غیر مسلم دانشوروں کی رائے بھی ملاحظہ ہو۔ لالہ بھگت سنگھ رام نے سرسید کے متعلق کہا تھا:

''جناب سرسید صاحب صرف ایک قوم یا خاص فرقے کے مددگار نہیں ہیں بلکہ وہ جناب کشیپ چندر سین اور سری سوامی دیانند سرسوتی کے پیروؤں کو بھی نظر عنایت سے دیکھتے ہیں۔ وہ خالص مسلمانوں ہی کے معاون نہیں بلکہ وہ کل ملک کے جاں نثار ہیں۔''

اسی طرح سرسید کے متعلق آریہ سماج اور برہموسماج کے نظریات بھی قابل توجہ ہیں جو آریہ سماج اور برہموسماج کی ایک جماعت نے اپنے سپاس نامہ میں پیش کیا تھا۔ لکھتے ہیں:

''ہم تمام آپ کی ان کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو آپ نے قومی کونسل میں نیز مختلف اوقات میں ہندوستان کے لیے کی ہے۔ ہندو راجا مہاراجا جن سے بہت کچھ امید کی جاتی تھی ملک کے خیر خواہ ثابت نہ ہوئے لیکن آپ نے حب الوطنی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور البرٹ بل اور دیگر ملکی تجویزوں کی کونسل میں استقلال کے ساتھ حمایت کی۔''

اس سلسلے میں لاہور سے نکلنے والے ایک اخبار نے بھی اپنے اداریے میں لکھا تھا:

''ہم اس شخص کے کلمات سن کر جیسے کہ ہم اکثر اپنے مسلمان ہم وطنوں سے نہیں سنتے، دل سے خوش ہوتے ہیں۔ جو نظیر سرسید احمد خاں نے قائم کی ہے وہ صرف ان کے ہم مذہبوں کی پیروی کے لائق نہیں بلکہ ہندوؤں کے پیروی کے سبھی لائق ہے۔''

چنانچہ سرسید نے اپنے لاہور کے دورے میں آریہ سماج کی جماعت سے جو گفتگو کی اور ہندو مسلم اتحاد پر جس قدر زور دیا اور اس کے جواب میں آریہ سماج کے حامیوں نے اظہار خیال کرتے ہوئے سرسید کی ستائش کی ہے، اس سے سرسید کے دوقومی نظریہ سے متعلق الزام کی نفی ہوتی ہے اور ان کو متحدہ قومیت کا علمبردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں متعدد مثالیں ہیں جو اس مختصر وقفے میں پیش کرنا ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ سرسید احمد خاں نے بنارس میں ہندی اردو زبانوں کے متعلق پیدا شدہ تنازعہ کے حوالے سے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا تھا، لیکن اسے سیاسی سیاق و سباق میں دیکھنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ کیونکہ وہ محض ان کی وقتی ناراضگی تھی اور اس کی ایک طویل تاریخ ہے کیونکہ اس تنازعے کے بعد وہ مزید طور سے اتحاد و اتفاق اور متحدہ قومیت کی پرزور حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے تعلقات ہر مذہب و ملت کے ماننے والوں سے بدستور جاری رہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ بالکل نہیں تھا کہ ملک میں انتشار، تناؤ اور ٹکراؤ کا ماحول پیدا ہو۔ وہ ملک و قوم کی بھلائی خیر خواہی اور اتحاد کے خواہاں تھے۔ بلکہ انہوں نے ملک کی ترقی کا راز مشترکہ تہذیب و ثقافت کی پاسبانی کو قرار دیا۔

سرسید ہندوستان کے تمام باشندوں کو بلا کسی تفریق و تعصب ایک قوم، ایک گھر اور مثل بھائی کے سمجھتے تھے اور اس میں ذرہ برابر بھی تعصب اور جانب داری نظر نہیں آتی۔ یہاں تک کہ اپنے ملازمت کے زمانے میں بھی انہوں نے بے تعصبی اور کشادہ دلی کی ایسی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور

ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے عدالت میں جج کی حیثیت سے تمام مذاہب اور قوم کے ہر شخص کو ہمیشہ ایک نگاہ سے دیکھا اور ان میں کبھی کوئی فرق نہیں جانا اور اپنے مذہب کے آدمی کو دوسرے مذہب کے شخص پر کبھی ترجیح نہیں دی۔ بقول تاراچند:

''سرسید احمد خاں ہندو مسلم تعاون میں یقین رکھتے تھے۔ یہ حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف ہے اگر انہیں اس نظریہ کا بانی کہا جائے کہ ہندو اور مسلم دو مختلف قومیں تھیں۔ دراصل وہ ہندو اور مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ ان کی نظر میں اس اتحاد کی راہ میں مذہب مزاحم تھا اور نہ ہی وہ کسی عقیدے کے مخالف تھے۔''

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ان کے قومی اتحاد کی بہترین مثال ہمارے سامنے آتی ہے کہ وہ بلا کسی تفریق و تعصب دونوں مذہب کو ایک قوم قرار دیتے تھے۔ انھوں نے اس کالج میں پڑھانے کے لیے ہندو اساتذہ کو کشادہ دلی سے دعوت دی۔ کالج میں غیر مسلم اساتذہ کو اعلیٰ مقام عطا کیے گئے کالج میں سات اساتذہ میں دو ہندو تھے پنڈت شیوشنکر اور پروفیسر چکرورتی جو سرسید کے دست راست بھی تھے اور ان ساتوں میں سب سے زیادہ تنخواہ چکرورتی صاحب کو ہی ملتی تھی۔ کالج کے انتظامیہ میں گیارہ ممبر تھے جن میں تین غیر مسلم تھے۔ اس کالج کا پہلا فارغ طالب علم بھی ایک ہندو تھا۔ اسی طرح طلباء کی تعداد پر بھی نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کی تعداد جہاں ۷۔۸ طالب علموں سے شروع ہوئی تھی ۱۸۸۳ء تک وہ تعداد بڑھتے بڑھتے ۸۸ تک پہنچ جاتی ہے اور مسلم کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی ہے ان کی غیر جانب داری کی دوسری عمدہ مثال یہ ہے کہ غیر مسلموں خصوصاً ہندوؤں کے جذبات کا خاص خیال رکھتے ہوئے اس ادارے میں سنسکرت کی تعلیم پہلے ہی دن سے ہوتی تھی۔ وظیفوں کے تعلق سے ہندو مسلمان دونوں کو برابر وظیفے ملتے تھے بلکہ کچھ وظائف تو محض ہندوؤں کے لیے ہی مختص کیے گئے تھے۔ چنانچہ ان کی بے تعصبی کشادہ ذہنی، کشادہ قلبی، قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی سیکڑوں مثالیں ان کی تحریروں، تقریروں اور کارناموں میں ملتی ہیں۔ کہیں بھی انہوں نے ہندو مسلم میں امتیاز تفریق نہیں کی بلکہ دونوں کو یک جان دو تن تسلیم کیا۔ چنانچہ اسی مناسبت سے تہذیب الاخلاق اکتوبر ۲۰۰۱ء کے شمارے میں ڈاکٹر سید مشرف علی لکھتے ہیں کہ ''دارالعلوم یا اب یونیورسٹی کی اقامتی زندگی میں یہ بات مشاہدے اور تجربے میں آتی رہی ہے کہ یہاں کے بچوں میں ''علی گڑھ برادر ہڈ'' اور ایک اسپرٹ کا جذبہ قائم ہے۔ اس ادارے کے بچے بلا تفریق مذہب ایک ساتھ ہوسٹلوں میں رہتے ہیں، ایک ساتھ کھاتے ہیں، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک پلیٹ میں مسلم اور غیر مسلم بچے کھاتے ہیں..... یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ رمضان المبارک جو مسلمانوں کے لیے روزہ (Fast) رکھنے کا مہینہ ہے اس میں مسلمان بچوں کے ساتھ ہندو ساتھی ..... بھی روزہ دار کی طرح رہتے ہیں اور روزہ کھولنے کے وقت ساتھ میں روزہ کھولتے ہیں۔ انتہائی لطف اور محبت بھرے جذبات کا ماحول ہوتا ہے مسلمان طالبات ہندو لڑکوں کی بہن بنتی ہیں راکھی باندھتی ہیں ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے ہیں اور تحفے دیتے ہیں۔

.....اگر بغور جائزہ لیا جائے تو سرسید کے نظریہ اتحاد اور دارالعلوم کے قائم کرنے کے مقاصد کی آج کے دور میں زیادہ معنویت ہے جس کا تحفظ قوم اور ملت دونوں کے لیے قابل ستائش اور باعث فخر ہے۔''

متعصب ذہن کے لوگوں نے ان کی ایک الگ اور منفی تصویر بنا کر پیش کی لیکن بقول گاندھی جی:

''ان (سرسید) سے زیادہ بے تعصب اور اتحاد قومی کا دلدادہ اس وقت کوئی نہ تھا۔''

بقول پروفیسر شان محمد:

''سرسید کی درجنوں تقاریر ہیں جن میں انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک ہی قوم تصور کیا۔ انہوں نے نہ تو فرقہ وارانہ تقاریر کیں، نہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسایا اور نہ ملک کے بٹوارے کی بات کی اور نہ مسلمانوں کے لیے سروس میں ریزرویشن مانگا اور نہ انتخاب جداگانہ کو ہوا دی بلکہ اس بات کی نصیحت کرتے رہے کہ مسلمان اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں تاکہ وہ ملک کو ترقی کی راہوں پر لے جائیں۔''

چنانچہ سرسید کے متحدہ قومیت کے تصور اور قوم ملت کے متعلق ان کے کارناموں اور اصلاحات کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید

قوم وملت اور ملک کو بلا کسی تفریق کے اعلیٰ مقام پر فائز کر ملک کی ترقی چاہتے تھے۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ملک میں امن وسکون قائم کرنا چاہتے تھے اور قوم کو بار ہا آگاہ کرتے رہے کہ نفرت ونفاق کا ماحول چاہے زبان کے مسئلے پر ہو یا مذہب ونسل یا علاقائی برتری پر اس کا مجموعی اثر ملک پر ہی آتا ہے۔ سرسید کے اس اجتماعی تصور قومیت کو دور حاضر کے حوالے سے دیکھا جائے تو یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ملک وقوم کی ترقی وترویج اور فلاح و بہبود کے لیے مذہب نسل وتہذیب وثقافت سے ہٹ کر ملک کے باشندوں کو متحد کرنے کی کوشش کی اپنے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کے تحفظ کے لئے انہوں نے جو پیغام دیا تھا وہ آج بھی ہمارے لئے اتنا ہی مفید ہے جتنا کہ اس دور میں تھا سرسید نے ۲۷ دسمبر ۱۸۹۴ کو محمڈن اینگلو ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڑھ) میں ایک تقریر میں کہا تھا:

''ہماری مثال ان تیلیوں کی مانند ہے جو بترتیب ایک بندش سے بندھیں ہوں اور وہ بندش ٹوٹ جاویں اور تمام تیلیاں متفرق و پریشان ہو جاویں اور ان کا کچھ انتظام نہ رہے۔ اگر ہم پھر بھی اپنی قوم کو قوم بنانا چاہتے ہیں تو پھر ان متفرق تیلیوں کو جمع کر کے ایک بندش سے باندھنا ہم کو ضرور۔ افسوس کہ پرانا ڈورا جس سے وہ بندھی ہوئیں تھیں ٹوٹ گیا اور ایسا پرانا اور بودا ہو گیا جس سے اب وہ متفرق تیلیاں بندھ نہیں سکتیں۔ اور اس لئے ہم کو ضرورت ایک نیا ڈورا پیدا کرنے اور ان متفرق تیلیوں کو جمع کرنے اور بترتیب دوبارا باندھنے کی ہیں۔ اے دوستو! اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو نہ قوم کو قوم بنا سکیں گے اور نہ ان میں انسانیت، آدمیت اور قومیت پیدا کر سکیں گے۔''

آج سے اگر ہم قوم کو ان تمام خوبیوں سے مزین کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مصلح قوم سرسید کے پیغام کو نہ صرف عام کرنا ہوگا بلکہ ان پر عمل بھی کرنا ہوگا۔ ورنہ بقول اقبال

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سرسید احمد خان نے ملک کی خوشحالی اتحاد اور ترقی کا جو تصور پیش کیا وہ دور حاضر پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ آج ہمیں کل سے زیادہ سرسید کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ان کے افکار کو عملی طور پر اختیار کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس وقت دنیا میں قوم، مذہب، معاشرت، معیشت، تہذیبی و ثقافتی کشمکش کی جو صورتحال ہے وہ بہت پریشان کن ہے۔ سرسید کے افکار ونظریات کی بازیافت اس دور کی بڑی ضرورت ہے جس کے بغیر ملک کی ترقی اور خوشحالی دشوار ہے۔ بقول نذیر احمد

اب اس کے بعد لشکر ہے مگر افسر نہیں کوئی
بھٹکتا پھر رہا ہے قافلہ رہبر نہیں کوئی

☆☆☆

سرسید احمد خان اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق''

سرسید احمد خاں کا شمار ہندوستان کی عہد ساز شخصیات میں ہوتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندستان کو اپنے جن مایہ ناز سپوتوں پر ناز ہے ان میں ایک نام سرسید احمد خاں کا بھی ہے،موصوف نے اپنی پوری زندگی،قوم وملت کی خدمات کے لئے وقف کردی تھی،اگر موصوف کا ایک ہاتھ ملت کی نبض پر تھا تو دوسرا ہاتھ زمانے کی رفتار پر،سرسید ایک حقیقت پسند انسان تھے وہ تعلیم کی ترقی کو ملت کی ترقی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ہندوستان میں جس شخص نے تعلیم کو نئی شکل اور اردو نثر کو نئی صورت عطا کی اس شخصیت کا نام سرسید احمد خاں ہے۔جدید تعلیم کے محرک اور جدید اردو نثر کے بانی سرسید احمد خاں نے صرف طرز تحریر ہی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کے طرز احساس کو بھی تبدیل کیا۔انہوں نے سائنسی،معروضی اور منطقی طرز فکر کو فروغ دیا،عقلیت پسندی کی بنیادیں مضبوط کیں۔ان کی تحریک نے شاعروں اور نثر نگاروں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا۔سرسید کا شمار ہندوستان کے عظیم ریفارمرس میں ہوتا ہے۔سرسید انیسویں صدی کے رہنما،عملیت کے حامل،مصلح اور فلسفی تھے۔آپ کو برصغیر میں مسلم قوم پرستی کا سرخیل مانا جاتا ہے۔سرسید احمد خاں کے خیالات وافکار اپنی قوم کے لئے کتنے مخلص اور اعلی تھے اس کا اندازہ آپ ان اس اقتباس سے لگا سکتے ہیں۔

''میں اپنی قوم کو اس آسمان کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو اس کے اس حصہ کو جو نیلا نیلا سیاہ رو،ڈراؤنا دکھائی دیتا ہے۔کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمک رہے ہیں اور مسروقہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جن کے سبب اس تمام سیاہ رو آسمان کو عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوئی ہے۔اے صاحبو! کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کیے بغیر،جو تمہاری قوم میں ایسے چمکتے ہوں جیسے تارے،اپنی قوم کو معزز اور اور دوسری قوموں کی آنکھ میں باعزت بنا سکتے ہو؟''

سید احمد کی پیدائش 17 اکتوبر 1817 میں دلی کے ایک مشہور ومعروف اور خوددار سادات گھرانے میں ہوئی۔وہ حسینی سید تھے خان کا لقب خاندانی تھا اور 'سر' کا خطاب برطانوی حکومت نے 1888 میں عطا کیا۔ ان کے والد سید متقی محمد شہنشاہ اکبر ثانی کے مشیر خاص تھے۔دادا سید ہادی عالمگیر شاہی دربار میں اونچے منصب پر فائز تھے اور نانا جان خواجہ فریدالدین شہنشاہ اکبر ثانی کے دربار میں وزیر تھے۔پورا خانوادہ مغلیہ دربار سے وابستہ تھا۔ان کی والدہ عزیز النساء نہایت مہذب خاتون تھیں۔سرسید کی ابتدائی زندگی پر ان کی تربیت کا بہت گہرا اثر ہے۔اپنے نانا خواجہ فریدالدین سے انہوں نے تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے خالو مولوی خلیل اللہ کی صحبت میں عدالتی کام کاج سیکھا۔

سرسید کو پہلی ملازمت آگرہ کی عدالت میں بطور نائب منشی ملی اور پھر اپنی محنت سے ترقی پاتے رہے۔مین پوری اور فتح پور سیکری میں بھی خدمات انجام دیں۔دلی میں صدر امین ہوئے۔اس کے بعد بجنور میں اسی عہدے پر فائز رہے۔مرادآباد میں صدر الصدور کی حیثیت سے تعینات کئے گئے۔یہاں سے غازی پور اور پھر بنارس میں مامور رہے۔ان علاقوں میں حسن خدمات کی وجہ سے بہت مقبول رہے۔جس کا اعتراف کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے 1888 میں 'سر' کا خطاب عطا کیا۔

1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی پر مسلمانوں میں احساسِ شکست،احساسِ کمتری اور ایک عام مایوسی پھیلتی جارہی تھی۔اس نازک دور میں دو قسم کی قیادتیں ابھر کے سامنے آئیں،پہلی قیادت مولانا قاسم نانوتویؒ کررہے تھے،دوسری قیادت جس کا پرچم سرسید احمد خاں کے ہاتھ میں تھا۔ مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی رقم طراز ہیں''سرسید کی تعلیم پرانے اصولوں پر ہوئی،مذہب کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی تھی،انہوں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو سلطنت مغلیہ کا آفتاب لبِ بام آچکا تھا،ان کا خاندان عرصہ سے دربار مغلیہ سے متعلق تھا،وہ خود ابتدائی زمانہ میں دربار میں آتے جاتے تھے،اس طرح انہیں زوال پذیر سلطنت مغلیہ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا،انہوں نے وہ ابتری اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی،جس کا ہلکا سا نقشہ انہوں نے اپنے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین خاں کے حالات''سیرت فریدیہ''میں کھینچا ہے،ان کے کانوں میں وہ آوازیں گونج رہی تھیں،جب مغل شہزادے محلات کی چھتوں پر چڑھ چڑھ کر چلاتے تھے،ہم بھوکے مرتے ہیں ہم بھوکے مرتے ہیں،ان کی نظر اس اخلاقی،سیاسی،سماجی اور اقتصادی بیماری پر تھی،جو گھن کی طرح

ڈاکٹر کہکشاں عرفان

مغلیہ سلطنت کو کھا رہی تھی۔

سرسید احمد خاں کی عمر ۳۱، ۴۱ سال کی ہوگی، جس وقت حضرت سید احمد شہیدؒ نے اصلاح و حریت کا علم بلند کیا، اس تحریک کو انہوں نے قریب سے دیکھا تھا، شاہ عبدالعزیز دہلوی کا خاندان ان کی عقیدت کا مرکز تھا، شاہ اسماعیل شہیدؒ کے وعظوں میں انہوں نے شرکت کی تھی، اپنی کتاب ''آثار الصنادید'' میں حضرت سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے حالات جس محبت اور جوش سے انہوں نے لکھے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان بزرگوں سے انہیں بڑی عقیدت و محبت کا تعلق تھا، سیر سید احمد خاں دہلی کالج میں مولانا مملوک علی کے شاگرد رہ چکے تھے، جو مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) کے استاذ اور رشتے میں چچا ہوتے تھے، یہ عجیب واقعہ ہے کہ غدر کے طوفان نے ہندوستان کے سماجی اور سیاسی زندگی کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا، اور ایسے وقت میں دو متضاد تحریکیں یا مکتب خیال و دبستان فکر وجود میں آئے تو ان کا سرچشمہ ایک ہی تھا، دونوں تحریکوں کے بانی ایک درس گاہ اور ایک استاذ کے فیضاب، دہلی اجڑی، دلی کالج بند ہوا تو اس کے عوض دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے بقول شخصے:--''جس طرح مولانا محمد قاسمؒ دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اسی طرح سرسید احمد خاں نے دہلی کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہونچا دیا''

(تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول، ص ۵۴، ۶۴)

قوم کی مجموعی صورت حال نے سرسید کو بے چین کر دیا۔ بغاوت اور شورش نے بھی ان کے ذہن کو بہت متاثر کیا۔ قوم کی فلاح کے لیے وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے۔ اس اندھیرے میں انہیں نئی تعلیم کی روشنی ہی واحد سہارا نظر آئی جس کے ذریعہ وہ پوری قوم کو جمود سے نکال سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہ تہیہ کیا کہ اس قوم کے ذہن سے انگریزی زبان اور مغربی علوم سے نفرت کو ختم کرنا ہوگا۔ تبھی ان پر بند کئے گئے سارے دروازے کھل سکتے ہیں ورنہ یہ پوری قوم خانساماں اور خدمت گار بن کر ہی رہ جائے گی۔ اسی جذبے اور مقصد کے تحت انہوں نے 1864 میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ 1870 میں 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی کا مقصد مغربی زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا اور 'تہذیب الاخلاق' کی اشاعت کا مقصد عام مسلمانوں کی ذہن سازی تھا۔ 1875 میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم پھر محمڈن اورینٹل کالج کے قیام کے پیچھے بھی یہی جذبہ اور مقصد کارفرما تھا۔ سرسید کو اپنے اس مقصد میں کامیابی ملی اور آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں سرسید کے خوابوں کا پرچم پوری دنیا میں لہرا رہا ہے۔ سرسید نے کہا تھا۔''میں ہندوستانیوں کی ایسی تعلیم چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعہ ان کو اپنے حقوق حاصل ہونے کی قدرت ہو جائے، اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک نہیں دیے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہو تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ مخواہ طوعاً و کرہاً ہم کو دلا دے گی''۔

سرسید نے علی گڑھ تحریک کو جو شکل عطا کی تھی اس نے ہندوستانی قوم اور معاشرہ کو بہت سی سطحوں پر متاثر کیا ہے۔

اس تحریک نے اردو زبان و ادب کو نہ صرف نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا بلکہ اسالیب بیان اور موضوعات کو تبدیل کرنے میں بھی اس کا اہم کردار رہا ہے۔ اردو نثر کو سادگی، سلاست سے آشنا کیا، ادب کو مقصدیت عطا کی، ادب کو زندگی اور اس کے مسائل سے جوڑا۔ اردو نظم میں فطرت نگاری کو رائج کیا۔

سرسید نے اپنی نثر میں سادگی اور معروضیت کو قائم کیا اور سرسید کے رفقا نے بھی اس طرز کو اختیار کیا۔ خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی، مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ سبھی نے تحریک علی گڑھ سے روشنی حاصل کی اور اردو زبان و ادب کو فکر و نظر کے نئے زاویے دیے۔

سرسید نے بھی اپنی تصانیف میں اس کا التزام رکھا ان کی تصانیف میں آثار الصنادید، اسباب بغاوت ہند، خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن، تاریخ سرکشی بجنور بہت اہم ہیں۔ 'آثار الصنادید' دلی کی قدیم تاریخی عمارتوں کے حوالے سے ایک قیمتی دستاویز ہے تو 'اسباب بغاوت ہند' میں غدر کے احوال درج ہیں۔ اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے انگریزوں کی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'خطبات احمدیہ' میں اس عیسائی مصنف کا جواب ہے جس نے اسلام کی شبیہ مسخ کرنے کی کوشش کی تھی۔ 'تفسیر القرآن' سرسید کی متنازعہ کتاب ہے جس میں انہوں نے قرآن کی عقلی تفسیر کی اور معجزات سے انکار کیا۔ سرسید کے سفرنامے اور مقالات بھی کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ایک عظیم تعلیمی تحریک کے بانی سرسید احمد خان کا انتقال 27 مارچ 1898 میں ہوا۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جامع مسجد کے احاطے میں مدفون ہیں۔

سرسید کو اردو کا پہلا باقائدہ مضمون نگار بھی مانا جاتا ہے۔سرسید نے اردو ادب ۔ میں سادہ زبان کو رواج دیا۔انہوں نے اگرچہ تہذیب الاخلاق رسالے میں علمی اور معاشرتی مسائل بیان کیے لیکن ان کی تحریر کے انداز نے بھی آنے والی ادبی اور صحافتی زبان کو نئی راہ دی۔ان کے دوست الطاف حسین حالی سرسید کے طرز تحریر کے بارے لکھتے ہوئے سرسید پر لکھی ہوئی اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ "ان کا مقصد اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانا ہوتا تھا۔سرسید احمد خاں چوں کہ ایک مصلح تھے اور ان کی علمی تحریک بھی بنیادی طور پر اصلاحی تھی چنانچہ یہ ضروری تھا کہ بات صاف اور آسان الفاظ میں دوسروں تک پہنچائی جائے۔سرسید احمد خاں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مبالغے کی حد تھ سہل گو تھے یہاں تک کہ ان کی تحریروں میں اکثر فقرات سیدھے سادے بلکہ ڈھیلے ڈھالے ہی ہوا کرتے تھے۔"ان کے مضمون اپنی مدد آپ کی عبارت کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ "اپنی مدد آپ ایک عمدہ آزمودہ مقولہ ہے جس میں انسانوں کا، قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔"رسالہ تہذیب الاخلاق کے مضامین سے اردو کے قارئین اور محررین کو اظہار کی ایک نئی راہ ملی۔یہ ایک ایسی شاہراہ تھی جس پر دبستان لکھنؤ کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا اور ساتھ ہی عربی اور فارسی کی قید بھی نہیں تھی۔اگر یہ کہا جائے کہ آج کی ادبی اور صحافتی زبان سرسید کے اسلوب کی مرہون منت ہے تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔اسی طرح سرسید نے اپنی تحریروں سے اردو زبان وادب میں نڈر اور بے باک رویے کو رواج دیا۔ان کے دوست الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ:

''وہ خود راست باز تھے اور راست بازوں کی دل سے قدر کرتے تھے۔''

جب ۱۸۶۹ء میں سرسید نے لندن کا سفر کیا تو انگریزوں کی تہذیب وشائستگی دیکھ کر ان کو مسلمانوں کی پستی اور تنزلی کی حالت پر بہت ہی دکھ اور قلق ہوا۔اپنی قوم کی اس زبوں حالی کا باعث انھوں نے ان غلط اور باطل خیالات کو سمجھا جن میں مسلمان مبتلا تھے۔چوں کہ ان کے دل میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔اس لئے "سرسید نے مسلمانوں کی اصلاح وترقی کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب زمین مسلمانوں پر تنگ تھی اور انگریز اُن کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ وہ توپوں سے اڑائے جاتے تھے،سولی پر لٹکائے جاتے تھے،کالے پانی بھیجے جاتے تھے۔اُن کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی۔اُن کی جائدادیں ضبط کرلیں گئیں تھیں۔نوکریوں کے دروازے اُن پر بند تھے اور معاش کی تمام راہیں مسدود تھیں۔وہ دیکھ رہے تھے کہ اصلاح احوال کی اگر جلد کوشش نہیں کی گئی تو مسلمان ''سائینس،خانساماں،خدمتگار اور گھاس کھودنے والوں کے سوا کچھ اور نہ رہیں گے۔... سرسید نے محسوس کرلیا تھا کہ اونچے اور درمیانہ طبقوں کے تباہ حال مسلمان جب تک باپ دادا کے کارناموں پر شیخی بگھارتے رہیں گے۔۔۔اور انگریزی زبان اور مغربی علوم سے نفرت کرتے رہیں گے اُس وقت تک وہ بدستور ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے۔اُنکو کامل یقین تھا کہ مسلمانوں کی ان ذہنی اور سماجی بیماریوں کا واحد علاج انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم ہے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر وہ تمام عمر جد وجُہد کرتے رہے۔"سرسید کے خیالات وافکار ملاحظہ فرمائیں۔''جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے۔۔۔مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں''

سرسید نے اپنی قوم کی بیداری اور فلاح وبہبود کے لئے بہت سے اقدامات کئے ان میں سے ایک کام اخبار اور رسالہ جاری کرنا بھی تھا۔کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ اخبار ورسائل کے ذریعے خیالات وافکار کی ترسیل اور توسیع ذہنوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔سرسید نے عام تقریروں کے بجائے اخبار ورسائل کے ذریعے اپنے خیالات کو لوگوں تک پہنچایا۔اور اس طرح سے ان کے اثرات نسبتا گہرے ہوے۔اور لوگوں کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ سرسید قوم کے لئے نئے خطوط پر کام کر رہے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید نے اس زمانے میں قوم کے لئے ایک بہتر راستے کا انتخاب کیا۔کہ اپنی قوم کو نئی تعلیم کی طرف رجوع کیا۔نئی تعلیم کے توسط سے نئے زمانے اور انگریزی زبان کی طرف راغب کیا۔اگر سرسید نئے طرح کا اسکول قائم نہ کرتے تو آج ہماری قوم میں نئی طرز تعلیم اور نئے علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہوتا۔اسی لئے اکبر الہ آبادی نے بھی کہا تھا۔

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو ہو توپ مقابل تو اخبار نکالو

1869ء میں سرسید احمد خان کو انگلستان جانے کا موقع ملا۔یہاں پر وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ ہندوستان میں بھی کیمرج کی طرز کا ایک تعلیمی ادارہ قائم

کریں گے۔ وہاں کے اخبارات اسپکٹیٹر اور گارڈین سے متاثر ہوکر سرسید نے تعلیمی درسگاہ کے علاوہ مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں انقلاب لانے کے لیے اسی قسم کا اخبار ہندوستان سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اور ''رسالہ تہذیب الاخلاق'' کا اجرا اس ارادے کی تکمیل تھا۔ اس رسالے نے سرسید کے نظریات کی تبلیغ اور مقاصد کی تکمیل میں اعلیٰ خدمات سرانجام دیں۔

تہذیب الاخلاق اردو زبان کا مشہور و مقبول، معاشرتی اور اصلاحی ماہنامہ تھا جسے سرسید احمد خان نے انگلستان سے واپسی پر 24 دسمبر، 1870ء کو علی گڑھ سے جاری کیا۔ اس ماہنامہ کا انگریزی نام محمڈن سوشل ریفارمر تھا۔ اس ماہنامہ میں تمام مضامین اردو میں چھپتے تھے۔ آٹھ یا بارہ صفحات پر مشتمل پرچہ چار آنے میں فروخت ہوتا تھا۔ اس کا مدعا مسلمانان ہند کو جدید تہذیب اور سائنس کے فیوض سے روشناس کرانا تھا۔ تاکہ وہ ایک تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ قوم بن سکیں۔ پہلی مرتبہ۔ تہذیب الاخلاق 1876ء میں بند ہوا۔ چھ سال سات ماہ کی زندگی میں کل 226 مضامین اس میں شائع ہوئے۔ جس میں سے 112 سرسید نے تحریر کیے تھے۔ تین سال بعد تہذیب الاخلاق دوبارہ جاری ہوا۔ لیکن وہ تین برس پانچ مہینے کے بعد پھر بند ہوگیا۔ تیرہ چودہ برس بعد اس کا تیسرا دور شروع ہوا۔ جو تین برس بعد ختم ہوگیا۔ سرسید احمد خاں ہندوستان میں جدید طرز زندگی کے حامی تھے ان کی تحریروں میں بار بار اس بات کا تذکرہ ملتا ہے کہ ہندوستانیوں کو پرانی روش چھوڑ کر انگریزوں جیسا انداز زندگی اپنانا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے اسی نکتہ نظر کی وجہ سے انہیں ملک کے مختلف گروہوں کی طرف سے تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن ان کی اسی سوچ نے ہندوستان کے ایک بڑے طبقے کو بلاشبہ متاثر کیا۔ تہذیب الاخلاق کے کئی مضامین پر تنقید بھی ہوئی لیکن سرسید احمد خاں نے مخالفت کے باوجود اپنا مشن جاری رکھا۔ سرسید اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''جو طریقہ وضع لباس کا، شغل کا تمھاری اولاد کے لیے ہے اس سے ان کے شخصی چال چلن اخلاق و عادات میں ہرگز ترقی نہیں ہوسکتی۔''

درج بالا نکات کی روشنی میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کی سرسید نے تہذیب الاخلاق کی صورت میں جو چراغ روشن کیا اس نے اردو زبان اور ہندوستانی تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو تعلیم کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

اس پرچے کی وساطت سے سرسید نے انگریزی تعلیم کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی اور محمڈن کالج قائم ہوا۔ نیز سادہ و سلیس زبان لکھنے کا رواج بھی شروع ہوا اور تحریری تجزیے کا رواج پیدا ہوا اور مسلمانوں میں اسلامی اخوت اور قومیت کا احساس بیدار ہوا۔ اس کی اشاعت 1960ء میں ایک بار پھر شروع ہوئی۔ اسے اس کا چوتھا دور قرار دیا جاسکتا ہے اور اب یہ پابندی سے جاری ہو رہا ہے۔ اس پرچے کی وساطت سے سرسید کا مقصد مسلمانان ہند کو جدید تہذیب اور سائنسی علوم فنون کے فیوض سے روشناس کرانا تھا۔ تاکہ وہ ایک تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ قوم بن سکیں۔ اور مسلمانوں میں اسلامی اخوت اور قومیت کا احساس بیدار ہو۔ اکبر الہ آبادی نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا ہے

☆☆☆

استفادہ اور حوالہ جات

۱۔ تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ اول، ص ۵۴، ۶۴

۲۔ انتخاب مضامین سرسید، پبلیکیشنز مکتب جامعہ دہلی اور بااشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو

۳۔ مضمون اپنی مدد آپ صفحہ ۶۲

۴۔ ''الطاف حسین حالی'' حیات جاوید

۵۔ مقالات سرسید، مصنف مولانا اسماعیل پانی پتی، ناشر احمد ندیم قاسمی، مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ، لاہور

ہندوستانی نشاۃ الثانیہ اور سرسید

نشاۃ الثانیہ کا اثر کسی ایک برِّ اعظم یا کسی ایک ملک تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس کا اثر دنیا کے زیادہ تر ملکوں پر پڑا۔ بعض ملکوں میں اٹلی کے ساتھ ہی اور بعض ملکوں میں اس کے اثرات دیر سے دیکھنے کو ملے۔ دیگر ایشیائی ملکوں کی بہ نسبت نشاۃ الثانیہ کی تحریک کی شروعات ہندوستان میں سب سے پہلے ہوئی۔ ہندوستانی طالب علم یورپ کے مختلف ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جانے لگے اور یورپ کے افکار ونظریات سے متاثر ہونے لگے۔ جب وہ اپنے ملک لوٹے تو وہاں کے تہذیب وثقافت اور مختلف افکار ونظریات سے اپنے ملک کے باشندوں کو متعارف کرایا۔ کئی مقامات پر مختلف طرح کی سوسائیٹیوں اور اکادمیوں کی بنیاد رکھی گئی۔ اسکول، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام نے اسے اور زیادہ فروغ دیا۔ ہندوستان میں چھاپے خانے کھولے گئے جہاں بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہونے لگیں اور عوام تک وہ ساری کتابیں پہنچنے لگیں جو پہلے اس کی دسترس سے باہر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کو ہندوستان میں مذہبی اور سماجی نشاۃ الثانیہ کی صدی مانا جاتا ہے۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت کے پاؤں جمنے کے بعد یہاں کی عوام جدید تعلیم اور تہذیب کے حلقۂ اثر میں آئی۔ نتیجتاً نشاۃ الثانیہ کی شروعات ہوئی۔ ہندوستانی سماج کے اندرونی کمزوریوں کا پتہ چلا۔ انگریزی تعلیم نے ہندوستان کے مذہبی اور سماجی حلقے میں انقلابی تبدیلی پیدا کی۔ انگریزی تعلیم و تہذیب کا اثر ہندوستانی متوسط طبقے پر پڑا۔ موجودہ ہندوستانی سماج میں جو خامیاں، دکھاوا، مذہبی کمزوریاں، فرسودہ مذہبی رسم ورواج رائج تھے اس کو جدید تعلیم نے ختم کر دیا یا بہت حد تک کم کر دیا۔ انگریزی تعلیم کے اثر میں آکر ہی ہندوستانیوں نے غیر ملکی تہذیب وتمدن کے بارے میں بہت سی جانکاریاں جمع کیں اور اپنے تہذیب وتمدن کا ان سے تقابل کر کے صداقت کو جانا۔ شروع میں

یعنی 1813ء تک کمپنی حکومت نے ہندوستان کے سماجی و مذہبی، تہذیبی وثقافتی معاملات میں مداخلت نہیں کی بلکہ وہ اس بات سے خوفزدہ تھے کہ ان معاملات میں مداخلت کرنے سے ہندوستانی کمپنی حکومت کے لیے خطرہ پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن 1813ء کے بعد برطانیہ حکومت نے اپنے صنعتی وتجارتی منافع کے لیے محدود مداخلت شروع کر دیا، جس کی وجہ سے بعد میں سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکوں کی شروعات ہوئی۔

یہاں ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب میں سماجی اور مذہبی دونوں تحریکیں چلائی گئیں۔ راجا رام موہن رائے (1772 سے 1833)، جدید ہندوستان میں نشاۃ الثانیہ اور سماجی بیداری کی اہم شخصیت تھے۔ اس لیے انہیں Father of Modern India جدید ہندوستان کا بانی، نشاۃ الثانیہ کا علم بردار اور نشاۃ الثانیہ کا بنیادگزار کہا جاتا ہے۔ راجا رام موہن رائے پہلے ایسے ہندوستانی تھے جنہوں نے اپنے سماج میں پھیلی بُرائیوں کو دور کرنے کے لیے تحریکیں چلائیں۔ ان کے ساتھ دیوندر ناتھ ٹیگور، کیشو چندر سین وغیرہ تھے جنہوں نے بعد میں آدی برہمو سماج 1865ء میں قائم کیا۔ اس کے بعد 1867ء میں ممبئی میں مہادیو گووندرانا ڈے، آتمارام پانڈورنگ، چندرورکر جی، آر بھنڈارکر وغیرہ نے مل کر پرارتھنا سماج کی بنیاد ڈالی۔ ان کا مقصد ذات پات کی مخالفت، عورت مرد کی شادی میں عمر کا لحاظ، بیوہ کی شادی، عورتوں کی تعلیم وغیرہ کو آگے بڑھانا تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں بنگال میں ہینری ڈیرا جیو (1809 سے 1831) نے بنگالی نوجوان مفکروں کی ایک ٹولی کے ذریعے اسکول، کالج کے طالب علموں میں تنقیدی نظریات اور سائنسی نظریات کو فروغ دینے کا بیڑا اٹھایا۔ ہینری ڈیرا جیو Enlightenment ،اور Renassance کا حامی تھا۔ اس نے زوال شدہ رسم ورواج پر چوٹ کیا۔ سماج اور مذہب کے ڈھانچے اور تانے بانے پر سوالیہ نشان لگایا۔ وہ تمام موضوعات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا عادی تھا۔

ہندوستانی نشاۃ الثانیہ میں ایشور چندر ودّیا ساگر، سوامی دیانند سرسوتی، ویویکانند، سرسید، اقبال، محمد علی جوہر وغیرہ جیسے مفکر اور مصلحین ہوئے جنہوں نے زیادہ سے زیادہ عقل کے استعمال پر زور دیا اور اس وقت سماج میں پھیلی گمراہیوں کی نہ صرف پُرزور مخالفت کی بلکہ اس کو ختم کرنے کی سبیل بھی تلاش کی۔ ان مفکروں نے شعوری طور پر سماج کو سائنس اور عقلیت سے قریب لانے کا لائحۂ عمل تیار کیا۔ تعلیم کی طرف لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی۔ مذہبی امور کو عقل سے پرکھنے

محمد فیاض، پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، ویر بہادر سنگھ، پروانچل یونیورسٹی، جون پور

کی صلاح دی۔ تعلیم نسواں کی طرف توجہ دی۔ گوپال ہری دیش مکھ (1882-1823)، روندر ناتھ ٹیگور (1941-1861)، پریم چند (1936-1880)، سرت چندر چٹر جی (1938-1876) وغیرہ نے اپنے قلم کے ذریعے ہندوستانی سماج کو نشاۃ الثانیہ کی طرف راغب کیا اور سماج میں پھیلی تمام برائیوں کو اپنے مضامین، ناولوں اور افسانوں میں اجاگر کرنے کی کوشش کی۔

ہندو مذہب کے ساتھ ساتھ سکھوں اور مسلمانوں کے یہاں بھی اس نئی روشنی سے متاثر ہو کر نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ اس میں خاص طور سے دیو بند اسکول، احمدیہ تحریک، وہابی تحریک اور علی گڑھ تحریک قابل ذکر ہیں۔

علی گڑھ تحریک کی شروعات اتر پردیش سے ہوئی جس کی بنیاد سرسید احمد خاں نے ڈالی۔ ان کے رفقاء میں مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، چراغ علی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، ذکا اللہ وغیرہ تھے۔ اس میں انہوں نے مغرب سے آئے ہوئے منافع بخش مغربی افکار کی حمایت کی۔ انہوں نے تہذیب الاخلاق کے ذریعے اس قوم میں نشاۃ الثانیہ لانے کی کوشش کی۔ انہوں نے مذہب کو سائنس اور عقل سے پرکھنے کی کوشش کی۔ سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ ان کے رفقاء کاروں نے اردو ادب پر بہت بڑا احسان کیا۔ سرسید تحریک کے زیر اثر اردو میں مغربی ادب سے ناول، تنقید، نظم جدید کے اصناف، انشائیے وغیرہ کی بنیادیں پڑیں۔ سرسید تحریک کے زیر اثر جدید اردو نثر کی بنیاد پڑی۔ ان کی ٹرانسلیشن سوسائٹی اور سائنٹفک سوسائٹی میں مغربی ادب اور سائنس کی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ وہیں بڑے پیمانے پر مشرقی ادبیات کا بھی ترجمہ ہوا۔

علی گڑھ تحریک ایک ادبی تحریک تھی جو اردو زبان و ادب کے تہذیبی قومی، ادبی و اجتماعی تصورات سے متعلق تھی۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی ادبی خدمات اور اردو ادب پر ان کے وسیع تر اثرات نے اسے مکمل ادبی تحریک کی صورت عطا کی۔ اور اگر ان کاوشوں کا ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کے رخ سے جائزہ لیا جائے تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ سرسید کے تمام کارناموں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کی تمام تر کاوشوں کو چار حصوں یعنی تعلیم، صحافت، سیاست اور مذہب جیسے میدانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میدانوں میں ان کی جنونی کاوشوں نے انہیں ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کے فروغ میں ایک اہم شخصیت کا درجہ عطا کر دیا اور ہندوستان میں نشاۃ الثانیہ کے نظریات کو عام اور مستحکم بنانے میں انہی انتھک کاوشوں نے اہم رول ادا کیا۔

عوام میں تعلیم کو عام کرنا سرسید کے اہم مقاصد میں سے ہے جس کے لیے انہوں نے 24 مئی 1875ء نئے طرز پر مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ سر سید احمد خان کی نظر میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے علاوہ اگر ایشیا کے کسی ملک کی تعلیمی میدان میں تقلید کی جاسکتی تھی تو وہ ترک تھا اس لیے کہ وہ مغربی و مشرقی روایات کے امتزاج کی عمدہ مثال تھا۔ اس لیے انہوں نے طالب علموں کے یونی فارم میں ٹرکش کوٹ اور ترکی ٹوپی کو شامل کیا تھا۔ سرسید کے مدرسۃ العلوم کا بنیادی مقصد انگریزی تعلیم تھا اس لیے انگریزی زبان کا ذوق و شوق بڑھانے کے لیے ایک کلب ''انٹرنس ڈبیٹنگ کلب'' کے نام سے قائم کیا گیا تھا جس میں مضمون نویسی کے مقابلے کروائے جاتے۔

سرسید نے اس مدرسے کی ابتدا سے ہی وضاحت کر دی تھی کہ اگر چہ یہ مسلمانوں کا ادارہ ہے لیکن یہاں تحصیل علم کے لیے ہندو مسلمان طالب علموں میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی، اس لیے یہاں تعلیم حاصل کرنے والے دیگر مذاہب کے طالب علموں کو مساوی حقوق حاصل تھے۔ سرسید نے مدرسۃ العلوم کی رپورٹ میں کہا تھا:

> ''اس وقت ہمارے کالج میں 158 طلب علم داخل ہیں جن میں سے 129 مسلمان 37 ہندو اور ایک پارسی ہے ۔۔۔جس سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کے بانی۔۔۔کا کبھی یہ خیال نہ تھا کہ اس کے علم کے فائدے کسی خاص فرقہ پر محدود رکھے اور جو روشنی انسانی ہمدردی کی ان کے دل میں ہے اس کو تعصب کے سیاہ دھبوں سے داغدار کرے۔''
>
> (سید احمد خان، رپورٹ ترقی تعلیم مدرسۃ العلوم مسلمانان، واقع علی گڑھ 1877ء، ص۔3)

پرنسپل کی سالانہ رپورٹ بابت 99-1898ء ملاحظہ ہو:

''۔۔۔ ہندوستان میں ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا ہماری علت غائی ہے اور جو فوائد اس قسم کی یونیورسٹی سے پیدا ہوں گے وہ اس قسم کے ہیں:

(۱) اس کے ذریعے مسلمانوں کی قوم میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت ہوگی اور جس کے نہ ہونے سے وہ ملکی تمدنی اور دماغی ترقی میں اس درجہ پس ماندہ ہیں۔

(۲) ہم امید کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے ہندوستان میں اس قسم کی اعلیٰ تعلیم رائج ہوگی جو موجودہ یونیورسٹی میں حاصل نہیں ہوسکی۔

(۳) اس کے ذریعے سے علم کے بعض خاص شعبوں میں ترقی ہو سکے گی جس کو صرف محمڈن یونیورسٹی معقول طور پر ترقی دے سکتی ہے اور اس طرح اس کے ذریعے اسلام کی تہذیب اور شائستگی کو اس قسم کی ترقی مل سکے گی جو عیسیائی ممالک میں یورپ کی یونیورسٹیوں کے ذریعہ سے ظہور میں آئی ہے۔''

(رپورٹ پرنسپل، مدرسۃ العلوم علی گڑھ بابت 1899ء مطبع مفید عام آگرہ، بہ اہتمام محمد قادر علی خاں صوفی، ص 16-3)

سرسید کی تعلیمی مہم میں سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی متحرک تمازت نے ٹھہرے ہوئے جمود کو توڑا اور عوام میں علمی بیداری پیدا کی۔ سرسید کا خیال تھا کہ سماج کی اصلاح ترقی کے خواب کی اس وقت تک مکمل اور مثبت تعبیر ممکن نہیں ہے جب تک عوام کے خیالات میں تبدیلی کے لیے مسلسل جدوجہد نہ کی جائے۔ نئے خیالات کی روشنی سے پرانے جمود کو توڑا جا سکتا ہے اور نئی روشنی کے سوتے بہائے جا سکتے ہیں۔ انہی نظریات کو عملی پیکر میں ڈھالنے کے جنون نے 1863 میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کو سرسید کے ہاتھوں ایک عملی وجود ملا جس کے تحت تقریریں، علمی مباحث اور سائنسی تجربے کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی اہم کتابوں کو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے کا ایک عظیم منصوبے نے اس سوسائٹی کو نشاۃ الثانیہ کے فروغ کی راہ میں میل کا پتھر بنا دیا۔

راجا جے کشن نے سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

''یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک کوئی سہل طریقہ علوم وفنون مروجہ یوروپ کے حاصل ہونے کا سمجھ میں نہیں آتا لیکن اب جو یہ تدبیریں یعنی تقرر سائنٹیفک سوسائٹی کا سید احمد خان نے اپنی اعلیٰ ہمتی سے محض اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کے لیے کیا ہے یہ نہایت عمدہ تدبیر ہے، اس میں صرف تھوڑا صرف کرنے سے آپ کو اور اپنی اولاد کو اور اپنے جمیع ہم وطنوں کو نہایت عمدہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔''

(روئداد نمبر 5، ص 304)

سائنٹفک سوسائٹی کے بنیادگزار سرسید کے چند اہم نظریات سوسائٹی کی کارگزاریوں کی تکمیل کے میدان میں نیو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرسید کا خیال تھا کہ ایشیا کے ان تمام علوم کی حفاظت کرنی چاہیے جن کی کوئی بھی افادیت اب بھی باقی ہے اور جو ترقی کی راہ میں آگے بڑھتے رہنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اس لیے سوسائٹی کا ایک یہ مقصد تھا کہ:

''ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب اور نفیس کتابوں کو تلاش کر کے بہم پہنچانا اور چھاپنا۔''

(قانون سوسائٹی، ص۔ 1)

سرسید مغرب کی ترقی کا راز اس کی سائنس کی ترقی کا نتیجہ تسلیم کرتے تھے۔ اس لیے اس سوسائٹی کا ایک بڑا مقصد ہندوستانیوں کو ان تمام علوم وفنون کی طرف رغبت دلانا تھا جو انہیں مغرب کے ساتھ دوڑ لگانے میں ممد ومعاون ثابت ہو سکتی تھی۔ 16 اگست 1864ء کو سوسائٹی کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا:

''علم فلاحت ہم ہندوستانیوں میں بالکل معدوم ہو گیا ہے۔ زمین دار انہیں اصولوں پر کاشت کرتے آئے ہیں جو ہزاروں برس ہوئے کہ ان کے باپ دادا کے استعمال میں تھے اور ان قباحتوں سے جو مناسب تردد اور برے موسموں اور ان بری رسموں سے کہ زمین کو کچھ فرصت نہیں دیتے۔۔۔۔۔ جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں ان سے ناواقف ہیں اور نئے نئے طریقے جو ترقی زراعت کے لیے یورپ میں ایجاد ہوئے ہیں اور نئی نئی کلیں جو یورپ میں لگائی گئی ہیں اور جس سے زراعت کے کاروبار میں بہت آسانی ہو گئی ہے، ہندوستانی ان سے مطلق پرواہ نہیں رکھتے۔ اگر ان کا رواج دیا جائے اور ہندوستانی بھی علم فلاحت سے جو یورپ میں ایجاد ہوا ہے اور ان مفید کلوں سے واقف ہوں تو کچھ شبہ نہیں کہ بذریعہ ترقی پیداوار زمین کے ہندوستان کی دولت کو بھی بہت ترقی ہو۔''

(روئداد نمبر 6، ص 10۔9)

اس طرح سوسائٹی کے زیر اہتمام ہر مہینے متعدد لیکچر ہوتے تھے، سائنسی آلات باقاعدہ دکھائے جاتے تھے اور موضوعات ایسے اختیار کیے جاتے جن سے سامعین کی ذہنی بیداری اور آزادئ فکر و عمل پر متعدد مواد مل سکے۔ اسی سوسائٹی کے زیر اہتمام 1866ء میں جو اخبار نکلنا شروع ہوا تھا وہ آخر میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے نکلتا رہا۔ سماجی، اخلاقی، علمی عناوین پر سرسید اس اخبار میں مستقل لکھتے رہے۔

تعلیم نسواں یا آزادئ نسواں کے متعلق سرسید کا یہ قول لائق تعظیم ہے جو انہوں نے فراہمی چندہ برائے مدرسۃ العلوم پنجاب کے دورے میں خواتین کے ایڈریس کے جواب میں کہا تھا:

''اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہو گئی ہو اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہو گئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو۔۔۔ تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔''

(سرسید کا سفرنامۂ پنجاب، مرتبہ سید اقبال علی، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس 1884ء، ص۔103)

مرد اساس معاشرہ یعنی حاکم طبقے کی روشن خیالی ہی عورت کی مظلومیت کو سرے سے ختم کر سکتی تھی، جاہل قوم کے روبرو عورت اپنی آزادی کے لیے کس حد تک خود کو لہولہان کر سکتی تھی۔ جہالت کی انتہا ہی عورت کی محرومیت کا اولین سبب ہے، سرسید اسی جہالت کو دور کرنے کی مہم میں عمر بھر کوشاں رہے، اور ان کی کوششوں سے ایک ایسا روشن خیال طبقہ وجود میں آیا جس نے عورت کو اپنا ہم قدم بنایا اور اس کی تعلیمی آزادی پر معقول توجہ دی۔

انہوں نے صحافت کو اپنا اعلیٰ کار بنایا اور اپنے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے عوامی بیداری اور جذبۂ حب الوطنی، سیاسی نظریات کی تشکیل کی اور عوام میں احساس بیداری، جذبۂ حب الوطنی اور مذہبی روشن خیالی کو فروغ دیا۔ اس رسالے کے متعلق سرسید یوں رقم طراز ہیں:

''تہذیب الاخلاق کے جاری کرنے سے ہماری قوم کی حالت، معاشرت کی اصلاح مقصود و مطلوب ہے اور اسی واسطے سوشل رفارمر یعنی تہذیب الاخلاق اس کا نام رکھا۔''

(رسالہ تہذیب الاخلاق، جلد اول، شمارہ۔1، 1870ء مطبع انسٹی ٹیوٹ بمقام علی گڑھ، اہتمام محمد مشتاق حسین، ص۔2)

اس کے پہلے شمارے کی تمہید میں کہا تھا:

''اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و

مہذب قومیں کہلاویں۔''

(تہذیب الاخلاق، جلداول، 1870ء علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ بہ اہتمام منشی مشتاق، ص۔1)

اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے اس رسالے میں متعدد مضامین لکھے اور دیگر اہل قلم کی معتبر تحریروں کو بھی شامل کیا اور ساتھ ساتھ چند مغربی دانشوروں کے انگریزی مضامین بھی اردو میں منتقل کر کے شائع کیے گئے۔ سرسید نے رسم و رواج، ہمدردی، آزادیٔ رائے، تربیت اطفال، عورتوں کے حقوق، علوم جدید، کاہلی، تعلیم و تربیت، طریق تناول طعام، اخلاق، ریاکاری، خوشامد جیسے مضامین لکھ بہتر زندگی کا تصور قوم میں عام کرنے کی کوشش کی۔ ان کے مضامین میں مذہب کو جدیدیت کے تناظر میں دیکھنے کا رجحان ملتا ہے جن میں عام زندگی سے متعلق مذہبی مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔ اسلام کے بنیادی عقائد کے متعلق سائنٹفک انداز میں بحث کی گئی ہے۔ انہوں نے احادیث، کتب احادیث، اقسام احادیث اور قصص احادیث و تفاسیر جیسے عنوانات پر مضامین لکھے۔ قرآن مجید کی زبان کے متعلق بھی انہوں نے انقلابی خیالات کا اظہار کیا:

''جس طرح انسانوں کی زبانوں میں استعارہ اور کنایہ اور مجاز اور حقیقت پایا جاتا ہے اسی طرح کلام اللہ میں بھی موجود ہے۔ یہاں تک کہ عربی زبان میں غیر قوموں کے جو الفاظ شامل ہو گئے تھے وہ بھی قرآن مجید میں موجود ہیں۔ زمانہ نبوت میں جو طرز کلام عرب میں تھا اور جس طرح کہ وہ بات چیت کرتے تھے یا اپنے کلام کے استحکام اور سچ ہونے پر زور دیتے تھے اور جس قدر الفاظ غیر قوموں کے ان کی زبان میں مل گئے تھے اسی طرز کلام پر قرآن مجید نازل ہوا۔''

(آخری مضامین، مرتبین امام الدین گجراتی اور مولوی احمد بابا مخدومی، منزل نقشبندیہ، منصور پریس، بازار کشمیری، لاہور، 1924ء، ص۔8)

سرسید نے قرآنی زبان کے متعلق اس نقطۂ نظر کی روشنی میں قرآنی آیات کی تفسیر پیش کی۔ ''آدم کی سرگذشت'' میں لکھتے ہیں:

''تم نے قرآن شریف پڑھا ہے اس میں صاف لکھا ہے کہ خدا نے تم کو پیدا کیا پھر تمہاری صورتیں بنائیں۔۔۔۔ قرآن میں تو عجیب و غریب باتیں لکھی ہیں جو اُس زمانے کے لوگوں کے خیال میں بھی نہ تھیں اب جس قدر حقائقِ موجودات کھلتے جاتے ہیں قرآن مجید کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے بے شک یہ خدا کا کلام ہے۔''

(تہذیب الاخلاق، یکم ربیع الاول 1312ھ بمقام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس، ص۔20)

انہوں نے سورۂ فیل، سورۂ جن اور السمٰوات پر تفسیری مضامین لکھے۔ دیگر علمائے اسلام مثلاً امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کے مضامین کے تراجم بھی تہذیب الاخلاق میں شائع کیے گئے۔ اس طرح علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے بانی سرسید احمد خان کو بہ حیثیت صحافی بلند مقام حاصل ہے۔

المختصر سید احمد خان نے چاروں طرف پھیلی ہوئی سیاسی ابتری، معاشی بحران، تعلیمی کم مائیگی اور تہذیبی شکست و ریخت کا علاج مغربی تعلیم میں دیکھا اور روایتی تصورات و فکر و نظر کو جدیدیت کے انقلابی تناظر اور عصری تقاضوں کے اصول کے تحت نئی صورت عطا کرنے کے احساس کو فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہوں نے قوم کی ابتری کے اسباب تلاش لیے تھے، مختلف سمت سے روایتی پتھراؤ کے باوجود جن مسائل کے حل کی کوشش میں وہ زندگی بھر کوشاں رہے۔ میں اپنے اس مقالے کو سرسید کے اس نظریے پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے اپنے موقف کی وضاحت میں پیش کیا ہے:

''اس زمانے میں مذہبی آدمی وہ سمجھے جاتے ہیں جن کے دل تعصب سے پتھر سے زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ سوائے اپنے اہل مشرب کے سب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تمام دنیا کو بلکہ اپنے اہل مذہب میں سے بھی ان کے مشرب کے بر خلاف ہیں حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں غیر مذہب کے لوگوں سے دوستی و محبت اور ان کے ساتھ ہمدردی کو کفر و الحاد جانتے ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ سوائے اپنے اور کسی کو دیکھ نہیں سکتے۔''

(ریمارک از طرف ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق، 1880ء، مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ، ص۔

گردشِ ایام میں سرسیّد کا درخشندہ کردار

غدر کی جنگ وقوع پذیر ہونے کے بعد ملک میں بدامنی اور بدحالی کی بدلی چھا گئی تھی۔قتل وغارت گری اور خوں ریزی کا دورِ دورہ تھا۔ بالخصوص ملت اسلامیہ کے حالات ناگفتہ بہ ہو گئے تھے۔قوم مسلم تنزلی کی شکار ہو گئی تھی۔ ہر طرف مسلمانوں کو زدوکوب کیا جار ہا تھا ان پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے تھے۔وہ غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ان کے گلے میں مغربی طوق ڈال دیا گیا تھا۔تہذیبِ نو اپنانے کا انہیں پابند کیا جار ہا تھا اور مشرقی تہذیب وتمدن سے دور کرنے کے لئے ہزاروں حربے اپنائے گئے تھے۔ان پر تعلیمی اداروں کے دروازے تقریباً بند کر دیئے گئے تھے۔دینی تعلیم کے حصول یابی کے لئے انگریز حکمراں ان پر قدغن لگا دیے تھے۔وہ سیاسی، سماجی اور سائنسی تعلیم سے بھی محروم کر دیے گئے تھے۔جس کے باعث سماجی، سیاسی، سائنسی اور مذہبی اداروں کے ساتھ ساتھ ادبی ادارے بھی زد میں آ گئے تھے۔ بالخصوص دہلی کالج اور فورٹ ولیم کالج تعصب کے بھینٹ چڑھ گئے تھے۔کیوں کہ غدر(انگریزوں سے غداری) کا وقوع پذیر ہونے کا الزام انگریزوں نے بالخصوص مسلمانوں کو قرار دیا تھا۔جس کے باعث ان کے خلاف نہایت ظالمانہ اقدامات کیے گئے۔غیر مسلم جو جنگ آزادی میں شریک تھے۔انہیں بالکل زدوکوب نہیں کیا گیا۔انگریزوں کی اس دہری پالیسی کی وجہ سے مسلمان معاشرتی طور پر تباہ ہو گئے تھے اور ان کی معاشی حالت ابتر ہو گئی تھی۔انگریزوں نے فارسی کی بجائے جو مسلمانوں کی زبان تھی، انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا تھا۔ جہاں مسلمان کسی صورت بھی انگریزی زبان سیکھنے کے حق میں نہ تھے، وہیں دوسری طرف غیر مسلموں نے فوری طور پر انگریزی زبان کو اپنے گلے لگا لیا تھا اور اس طرح تعلیمی میدان میں مسلمانوں سے آگے نکل گئے تھے۔ان اقدامات نے مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حالت کو بہت متاثر کیا تھا۔مسلمان جو کبھی ہندوستان کے حکمراں تھے، وہ ادنیٰ درجے کے شہری ہو گئے تھے۔جنہیں ان کے تمام حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔غدر کے رونما ہونے کے بعد مسلمانوں پر بغاوت کے مقدمے چلائے گئے اور ان کے لیے سخت سے سخت سزائیں منتخب کی گئیں۔اس جنگ آزادی میں انگریزوں کا قہر بنسبت غیر مسلم مسلمانوں پر زیادہ گرا اور یہی ان کی نظر میں غدار قرار دئے گئے۔ایسی صورتِ حال میں مسلمانوں کو ان الله مع الصابرین [1] (بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) کا دامن گیر ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ کیوں کہ ان کا نہ بظاہر کوئی پرسانِ حال تھا اور نہ غم گسار، نہ کوئی درددل تھا نہ ہی یار و مددگار۔انھیں اپنا ضائع کیا ہوا وقار اور عظمت کی بحالی کی کوئی سبیل دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔باوجود وہ خدا کی رحمت ومشیت سے قطعی نبردآزما نہ ہوئے۔ بلکہ لا تقنطوا من رحمة الله [2] (اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو) کے پیکر بنے رہے۔ایسے پرفتن دور اور نازک تر حالات میں مسلمانوں کی ڈوبتی ناؤ کو سہارا دینے کے لئے درددل اور حساس رکھنے والے چند اشخاص منظر عام پر آئے جن میں سرسید احمد خان کا نام سرفہرست ہے۔جس نے مسلمانوں کی حمایت اور بقا کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا۔خود جنگِ آزادی میں جن کا گھر تاراج ہو گیا تھا، تمام دولت وثروت کو لوٹ لیا گیا تھا اور مال واسباب کو نذرِ آتش کر دیا گیا تھا، دہلی میں ان کے اعزا واقربا انگریزوں کے ہاتھوں قتل گئے تھے۔جس کے باعث ان کی والدہ محترمہ بھی جاں بحق ہو گئیں تھیں۔جس سے انہیں گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ان کے دل میں قوم کا درد تھا۔وہ ایک حساس مند انسان تھے۔قوم کی فکر انہیں دامن گیر تھی۔قوم کی زبوں حالی اور مایوسی کی کیفیت کو دیکھ کر سرسید کو بڑا رنج ہوا۔چناں چہ انگریزوں کی جانب سے مسلمانوں کے جو استحصال ہو رہے تھے اس کے تدارک کے لئے انہوں نے ایک لائحہ عمل تیار کیا اور انگریزوں کے تعلیمی، تحقیقی، ادبی، سیاسی، سماجی زندگی کے ہر قسم کے علمی اور قومی مشاغل میں حصہ لیا۔کیوں کہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ انگریزوں پر اپنی بات مسلط کرنے کے لیے پہلے ان سے قریب تر ہونا لازمی ہے۔لہذا مصلحتاً انگریزوں کے ساتھ مفاہمت اور صلح پسندی کے لیے دست دراز کیے۔ان کا خیال تھا کہ 'کاک چیسٹا اور بکو دھیانم' کی خصلت رکھنے والے عیار انگریز کے ساتھ مفاہمت کر کے مسلمانوں کو پہلے تعلیمی اور معاشی طور پر مضبوط کیا جائے تا کہ مسلمان اپنا ضائع کیا ہوا تشخص وعہدہ دوبارہ حاصل کر سکیں۔چناں چہ 1859ء میں سرسید نے مرادآباد اور 1862ء میں غازی پور میں مدرسے قائم کیے۔بقول شخصے۔

علی گڑھ کے سید مدرسہ بنانے

چلے بھیک مانگے دوارے دوارے

محمد ریحان الحق، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

ان مدرسوں میں فارسی کے علاوہ انگریزی زبان اور جدید علوم پڑھانے کا بندوبست بھی کیا گیا تھا جس سے مسلمان برانگیختہ ہوگئے اور ان سے غم و غصے کا اظہار کرنے لگے۔حتیٰ کہ مدرسہ کے لئے چندہ دینے سے بھی انکار کردئے اور بجائے چندہ دینے کے انہیں جوتے اور چپل سے زدوکوب کرتے۔باوجود وہ صبر وتحمل کا پیکر بنے رہے اور اپنے کام میں ہمہ وقت مصروف رہے۔1863ء میں غازی پور میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔اس ادارے کے قیام کا مقصد مغربی زبانوں میں لکھی گئیں کتب کے اردو تراجم کرانا تھا۔بعدازاں 1876ء میں سوسائٹی کے دفاتر علی گڑھ میں منتقل کردیے گئے۔ سرسید نے نئی نسل کو انگریزی زبان سیکھنے کی ترغیب دی تاکہ وہ جدید مغربی علوم سے بہرہ ور ہوسکے۔یوں دیکھتے ہی دیکھتے مغربی ادب سائنس اور دیگر علوم کا بہت سا سرمایہ اردو زبان میں منتقل ہوگیا۔سوسائٹی کی خدمات کی بدولت اردو زبان کو بہت ترقی نصیب ہوئی۔1859ء میں ایک کتاب "اسباب بغاوت ہند" لکھی اور یہ کتاب ارکان پارلیمنٹ تک بھی روانہ ارسال کیا جو محض اس غرض سے کہ انگریزوں کی جانب سے لگایا گیا مسلمانوں پر غدر کے الزام کا سدباب اور دفاع کیا جائے۔پہلی جنگ آزادی کے بعد ان کا تبادلہ بجنور سے مرادآباد ہوگیا تھا۔اس دوران وہ مسلمانوں کو غدر میں شرکت کے الزام سے بری الزمہ کرنے کے فراق میں مشغول ہوگئے تھے اور اس کے ازالہ کے لیے تگ ودو کرنے لگے تھے۔چناں چہ کئی کتابیں تصنیف کر منظر عام پر لائے۔جن میں "تاریخ سرکش بجنور"، "اسبابِ بغاوت ہند" اور "رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا" وغیرہ اہم ہیں۔اس دور میں انہوں نے "تاریخ فیروز شاہی"، "تبین الکلام"، "سائنسٹی فک سوسائٹی اخبار" (جو بعد میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ہوگیا) اور "رسالہ احکام طعام اہل کتاب" وغیرہ بھی اخذ کیں۔تیسرے دور میں ان کے مصلحانہ خیالات میں بڑی شدت پیدا ہوگئی تھی۔اب وہ اپنے اظہار خیال میں نڈر اور بے خوف ہوگئے تھے اور عوام الناس کی مخالفت کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ان کے ذہن پر جدید انداز فکر نے غلبہ پالیا تھا۔انگریزوں کی صحبت ورفاقت نے جو رنگ ان پر چڑھایا تھا وہ تیز تر اور شوخ ہوگیا تھا۔اس رجحانات کو ان کی اس دور کی تصانیف میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔اس دور کی اہم تصانیف سفرنامہ لندن، خطبات احمدیہ، تہذیب الاخلاق، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو وغیرہ ہیں۔پھر 1869ء میں اپنے بیٹے سید محمود کے ہمراہ انگلینڈ گئے۔وہاں آکسفورڈ و کیمرج یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم کا مشاہدہ کیا اور ہندوستان میں بھی اسی طرز کی یونیورسٹی اور کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا۔جب ولیم میور نے 1861ء میں اپنی ایک کتاب 'دی لائف آف محمدؐ' تصنیف کی۔جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بے جا اعتراضات کیے گئے تھے۔تو سرسید احمد خان نے ان کا جواب دینا لازم وملزوم سمجھا اور ایک کتاب خطبات احمدیہ لکھی۔جو 1870ء میں لندن سے شائع ہوئی۔جس پر مخالفین نے بھی کہا کہ سرسید میدان حشر میں 'خطبات احمدیہ' کی وجہ سے ہی بخشے جائیں گے۔اسی تناظر میں انہوں نے نئے علم الکلام کی بنیاد ڈالی اور نئے نظریات کے پیش رو تفسیر القرآن لکھنی شروع کی۔اس غرض سے کہ انگریزوں کے ذہن میں جو غبار بھرے ہیں جس سے ان میں نفرتیں پنپ رہی ہیں اس کا سدباب کیا جائے اور ان کے دل ودماغ کو صاف کرکے انگریزوں اور مسلمانوں کے مابین تطابق پیدا کی جائے تاکہ مسلمانوں پر مزید ظلم نہ ڈھائے جائیں۔ان کے ساتھ صلہ رحمی سے پیش آئیں اور اسلام کی حقانیت سے بھی روشناس ہوں۔ارادہ تو ان کا نیک تھا مگر سرسید چوں کہ کسی مدرسہ کے فارغ نہیں تھے۔وہ محض اسکول اور کالجز کے طالب علم تھے،اس لئے ان سے اغلاط کا سرزد ہونا تو فطری تھا اور غلطیاں سرزد بھی ہوئیں اور اغلاط اس طرح ہوئے کہ گرفت میں آگئے۔در اصل انہوں نے سائنس اور جدید تعلیم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کتاب اللہ کی تفسیر کی۔اس لئے علما اسلام کے گرفت میں آگئے۔توبہ واجب ہونے سے ان پر کفر کا فتوہ صادر ہوا۔دراصل علما کی جانب سے اس قدر شدت اختیار کی گئی تھی کہ سرسید کا رجوع کرنا محال تھا اور سرسید بجائے توبہ کرنے کے انانیت کے شکار ہوگئے۔ جس سے انہیں دہریہ، شیطان اور زندیق تک کہا گیا۔مگر وہ اپنے کام کو الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا کے مترادف قرار دئے اور مصروف عمل رہے۔جس سے ان کے خلاف تبرے پڑھے جانا انہیں ہدف تنقید بنانا اور ان پر لعنت ملامت بھیجنا، سب فضول ثابت ہوا۔اس ضمن میں ڈاکٹر قدسیہ ایک جگہ احاطۂ تحریر ہیں:

''مذہبی خیالات میں اس نئے طرز فکر نے ان کے خلاف شورش کا ایک نیا طوفان کھڑا کردیا۔انہیں نیچری، دہریہ، کافر، زندیق اور کیا کچھ نہ کہا مگر وہ کسی مخالف اور دشنام طرازی کی پرواز کئے بغیر اس مقصد کی تکمیل میں انتہائی سرگرمی سے مصروف رہے۔''[۳]

1870ء میں رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔جس میں مسلمانوں کی مطلوب اصلاح معاشرتی پہلوؤں کی نشاندھی کی اور مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ اپنی خامیوں کو فوری دور کرنے کی کوشش کریں۔مزید انہوں نے پیغام دیا کہ مسلمان گرچہ اپنی بقا چاہتے ہیں تو اپنے پیکرِ خاکی میں جان پیدا کریں، لاعلمی،

کم ہمتی، پستی، بے رغبتی، تعطل اور جمود وسکوت کے عناصر کو بالائے طاق کریں۔ ورنہ ہستی سے ان کا وجود تک مٹ جائے گا۔ نیز انہیں پستی اور خوابیدگی کے دلدل سے نکال کر ان میں بیداری پیدا کی۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ قوم مسلم علم وعمل سے نابلد ہے۔ جس کی وجہ وہ پستی کی جانب گامزن ہیں۔ بقول ڈاکٹر قدسیہ

''ان کا خیال تھا کہ صرف تعلیمی ترقی ہی قوم کا دماغ روشن کرسکتی ہے اور یہی ہر قوم کی ترقی کا زینہ ہے۔ ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی صرف اعلیٰ تعلیم پر منحصر ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ہمیشہ ذہنی روشنی اور صلاحیت بیدار ہوتی ہے جو زندگی کے میدان میں صحیح رہبری کرتی ہے اور عزت کے لائق بناتی ہے۔ ایسی ترقی یافتہ قوم کبھی محکوم وغلام نہیں رہ سکتی۔ بلکہ آزادی اور عزت قدم چومنے لگتی ہے۔ اس خیال کے پیش نظر سرسید نے جلد سے جلد اور کم سے کم وقت میں قوم کی اعلیٰ تعلیم کو وقت کا اہم ترین تقاضہ اور قومی ترقی کا بنیادی جز تصور کیا۔''[۴]

وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ حالت کی زیادہ ذمہ داری خود مسلمانوں کے انتہا پسند رویے کی وجہ سے ہے۔ مسلمان انگریزی تعلیم کا حاصل کرنا اپنے مذہب کے برخلاف تصور کرتے تھے کیوں کہ اس سے عریانیت اور فحاشی کی انہیں بو آتی تھی۔ جس کے باعث عرصہ دراز تک انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان میں ایک خلیج حائل رہی، سرسید احمد خان نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ جب تک مسلمان انگریزی تعلیم اور انگریزوں کے متعلق اپنا رویہ تبدیل نہ کریں گے ان کی حالت بہتر نہ ہوسکے گی اور وہ تعلیمی میدان میں ہمیشہ غیر مسلموں سے پیچھے رہیں گے۔ اس لئے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ انگریزوں کے متعلق اپنا رویہ تبدیل کریں کیوں کہ انگریز ملک کے حکمران ہیں اور ان کے ہاتھوں میں ملک کی باغ ڈور ہے۔ وہ اپنی تحریک کا آغاز مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان میں غلط فہمی کی فضا کو ختم کرنے سے کیا۔ ان کا نقطۂ نظر تھا کہ مسلم قوم کی ترقی کی راہ تعلیم کی مدد سے ہی ہموار کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور دوسری اقوام کے شانہ بشانہ آگے بڑھیں۔ انہوں نے محض مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ مسلمانوں کے لیے جدید علوم کے حصول کی سہولتیں بھی فراہم کرنے کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے سائنس، جدید ادب اور معاشرتی علوم کی طرف مسلمانوں کو راغب کیا اور انگریزی کی تعلیم کو مسلمانوں کی کامیابی کے لیے زینہ قرار دیا تاکہ وہ غیر مسلموں کے مساوی ومعاشرتی درجہ حاصل کرسکیں۔ ان کی تعلیمی ترقی کے لئے "انجمن ترقی مسلمانان ہند" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ 1875ء میں اس ادارے نے ایم اے اور ہائی اسکول قائم کیا۔ جس میں جدید اور مشرقی علوم کا بندوبست کیا گیا۔ 1877ء میں اس سکول کو کالج کا درجہ دیا۔ جو ان کی وفات (27/مارچ 1898ء) کے بعد 1920ء میں یونیورسٹی کا درجہ اختیار کر گیا۔ جس سے آج بھی ہزاروں طلبا وطالبات مستفیض ہو رہے ہیں اور دنیا میں نام پیدا کر رہے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی محض برصغیر میں ہی اپنی پہچان نہیں رکھتی ہے بلکہ دنیا بھر میں اپنی اعلیٰ شناخت رکھتی ہے۔ آج دنیا میں اس نے اپنا ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔

سرسید کے تعلق سے یہ بات بڑی شدومد کے ساتھ عام کی جاتی ہے کہ وہ مسلمان نہیں بلکہ دہریہ تھے۔ انہیں کافر، مرتد نیچری اسلام دشمن عیسائی فروغ غدار انگریز نواز اور انگریز دوست جیسے اسما سے موسوم کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی داڑھی کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ انہیں گھینگھا کا مرض لاحق تھا جسے پوشیدہ رکھنے کے لیے لمبی داڑھی نہیں داڑھا رکھا تھا۔ جیسا کہ الہ آباد یونیورسٹی کے ایک اسسٹنٹ پروفیسر کو کہتے ہوئے راقم الحروف نے سنا جو بغیر کسی دلیل کے ہوا میں بات کر رہے تھے۔ حالاں کہ یہ بات بے بنیاد ہے جو سرے سے غلط ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ یہ فقط لغو اور حسد پر مبنی ہے۔ ہم انہیں محض عقائد کی بنیاد پر ان کی خدمات کو قطعاً فراموش نہیں کرسکتے ہیں۔ جیسا کہ بریلی اور دیوبند مکتبۂ فکر کے لوگوں نے ان پر کفر کا فتویٰ بھی صادر کیا ہے۔ جو صد فیصد درست ہے۔ ہم ان فتووں کے منکر نہیں ہیں۔ کیوں کہ خدا کی وحدانیت کا منکر ہونا، قرآن مجید کے آیات ناسخ اور منسوخ کا انکار کرنا، انبیا کی نبوت ورسالت پر ایمان نہ رکھنا موت کے بعد زندگی اور قیامت پر ایمان نہ رکھنا، قدرت معجزہ وحی اور الہام کو خواب اور بچوں کے کھیل سے تعبیر کرنا، معراج النبی کا منکر ہونا اور خود کو نیچری مذہب سے وابستہ کرنا وغیرہ کفر کی واضح علامت ہیں۔

تاہم یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ گردشِ ایام میں سرسیّد نے جو گوناگوں قربانی پیش کی ہے اور جو درخشندہ کردار بروئے کار لائے ہیں وہ یقیناً قابلِ صد تحسین ہیں۔ انہوں نے قوم کے فلاح وبہبود کے لئے جو خدمات انجام دی ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ رہتی دنیا تک تاریخ

کے اوراق میں ان کا نام سنہرے حروف میں لکھا جا تا رہے گا۔انہیں غیروں سے کم اپنوں سے زیادہ رنج پہنچا۔لیکن ان کے پایۂ استقلال میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ مزید انہیں تقویت حاصل ہوتی رہی اور عزم مصمم سے منزل مقصود تک رسائی حاصل کر مسلمانوں کے پیکر خاکی میں جان پیدا کی۔انہیں لاعلمی کے دلدل سے نکال کر علم وعمل کا پیکر بنایا جس سے مسلمانوں کے مستقبل روشن ہوئے اور آج بھی علم کے لازوال دولت سے آراستہ وپیراستہ ہورہے ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

(1)القرآن،البقرہ،153/2

(2)القرآن،الزمر، 53/24

(3)سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ،ڈاکٹر قدسیہ بانو،اسرار کریمی پریس الہ آباد،1931ء ،ص136

(4)ایضاً ص128

اردو زبان وادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات

سرسید ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ان کی عظمت کا اعتراف اس وقت کے تمام ادباء وشعراء، دانشوروں اور یہاں تک کی ان کے مخالفین نے بھی کیا۔سرسید احمد خاں ایک بڑے ریفارمر تھے۔ بڑا ریفارمر وہ ہوتا ہے جس کے اندر دوراندیشی ہوتی ہے۔ جسے نبض شناسی آتی ہے۔ جو حکمتِ عملی سے کام لیتا ہے۔ جو مہم جو ہوتا ہے اور کسی بھی حال میں مایوس اور نا امید نہیں ہوتا۔ جو دھن کا پکا ہوتا ہے اور مزاحم قوتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے اور جسے تقریر اور تحریر دونوں وسیلوں پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔سرسید احمد خاں میں یہ ساری خوبیاں موجود تھیں اسی لیے وہ اتنی بڑی اصلاحی تحریک چلانے اور اسے اچھے انجام تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔

اچھے ریفارمر کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کی نظر معاشرے کی خرابیوں کی جڑ تک پہنچتی ہیں اور اسی لیے وہ بیماری کو جڑ سے مٹانے کی تدبیریں تلاش کرتا ہے۔سرسید کی اصلاحی تحریک کی ترکیبوں میں سب سے زیادہ کارگر ترکیب وہ تھی جو اردو زبان وادب کے لیے اپنائی گئی۔

اردو زبان وادب کی تاریخ میں تحریکوں کا اہم مقام ہے۔ابتدا سے لے کر آج تک اردو زبان کے ارتقا میں مختلف موڑ پر مختلف تحریکوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔جس تحریک نے براہِ راست اور بلا واسطہ دونوں طرح سے اردو ادب کو آگے بڑھایا وہ علی گڑھ تحریک ہے۔اس تحریک کے وجود میں آنے کا سبب 1857ء کے آس پاس کی وہ سیاسی اور سماجی صورتِ حال ہے جس سے مسلم قوم دوچار تھی اور اس کا محرک وہ دردمند دل اور اعلا دماغ رکھنے والا شخص تھا جس نے قوم کی تباہ حالی کو نہ صرف یہ کہ محسوس کیا بلکہ اس زبوں حالی سے نکال کر قوم کو ترقی کے راستے پر لے جانے کے بارے میں سوچا بھی اور اس سوچ کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ یہ وہی شخص ہے جسے دنیا سرسید احمد خاں کے نام سے جانتی ہے۔ ویسے تو اپنی قوم کی بدحالی کو دیکھ کر اس زمانے کے سبھی باشعور اور دردمند انسان پریشان تھے مگر مسلم قوم کی پستی اور زبوں حالی نے سب سے زیادہ دکھی سرسید احمد کو کیا۔ وہ اس قدر رنجیدہ ہوئے کہ ان کے دل اور دماغ دونوں بے چین ہو اُٹھے اور اس بے چینی کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے اس دکھ سے قوم کو نجات دلانے کا بیڑا اُٹھا لیا۔ چوں کہ وہ حساس ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت باشعور اور اہلِ نظر بھی تھے اس لیے انھوں نے اس پستی کے اسباب اور ان کے سد باب دونوں پہلوؤں پر غور کیا اور ان خطوط پر کام کرنا شروع کر دیا جن کے سہارے قوم پستی سے نکل کر ترقی کے راستے پر جا سکتی تھی۔ چوں کہ سرسید احمد خاں نے اپنی اس مہم یا تحریک کا آغاز علی گڑھ سے کیا اور یہیں سے اس کی سرگرمیاں تیز ہوئیں اس لیے اس تحریک کو علی گڑھ سے جوڑ دیا گیا اور یہ علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہو گئی۔

سرسید احمد خاں نے قوم کی پستی اور تنزلی کے اسباب پر غور کیا تو پتا چلا کہ قوم علم کے میدان میں کافی پیچھے ہے۔توہم پرستی اور قدامت پسندی کی شکار ہے اور اس کا تہذیبی اثاثہ خصوصاً ادبی سرمایہ جو کسی قوم کو بنانے اور بگاڑنے میں کلیدی رول ادا کرتا ہے، خامیوں اور خرابیوں سے بھرا ہوا ہے۔اس لیے ان تینوں اسباب پر سرسید نے کھل کر بات کی اور ان کو دور کرنے کی تدبیروں پر روشنی ڈالی۔انھوں نے بتایا کہ مسلمانوں کے تمام امراض کی واحد علاج جدید طرزِ تعلیم ہے۔انھوں نے زور دے کر کہا کہ نئے زمانے کو سمجھنے اور ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ نئے علوم وفنون سیکھے جائیں۔انھوں نے تعلیم پر اس لیے زور دیا کہ اسی سے جہالت کے اندھیرے چھٹ سکتے تھے۔اسی کی روشنی میں قوم آگے بڑھ سکتی تھی اور اسی کے سہارے قوم اپنی منزل تک پہنچ سکتی تھی۔

سرسید کا نقطہ نظر تھا کہ مسلم قوم کی ترقی کی راہ تعلیم کی مدد سے ہی ہموار کی جا سکتی ہے۔انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور دوسری اقوام کے شانہ بشانہ آگے بڑھیں۔انہوں نے مسلمانوں کے لیے جدید علوم کے حصول کی سہولتیں بھی فراہم کرنے کی پوری کوشش کی۔انہوں نے سائنس، جدید ادب اور معاشرتی علوم کی طرف مسلمانوں کو راغب کیا۔اسی لیے سرسید نے مرادآباد اور 1862ء میں غازی پور میں مدرسے قائم کیے اور 1864ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تاکہ یورپ میں لکھی گئی کارآمد کتابوں کا دیسی زبان میں ترجمہ ہو سکے۔ساتھ ہی ایشیا کے قدیم مصنفین کی نایاب اور مفید کتابیں بھی دوبارہ چھپ سکیں تاکہ ان کتابوں میں بند علم کی روشنی کو منظرِ عام پر لایا جا سکے۔اسے عوام تک پہنچایا جا سکے۔اس سے قوم کے دل ودماغ کے اندھیروں کو دور کیا جا سکے۔اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے سرسید نے ''اخبارِ سائنٹفک سوسائٹی'' جس کا آگے چل کر نام ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' ہو گیا، نکالا اور

نہاں، ریسرچ اسکالر، الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

انگلستان سے واپسی پر 1870ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ تہذیب الاخلاق میں شامل مضامینِ سرسید نے مسلمانان ہند کے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کے لیے سرسید نے ولایت کا سفر طے کیا تا کہ وہ انگریز قوم کی ترقی کے راز کو پاسکیں اور اس ترقی یافتہ قوم کے ان رسالوں تک رسائی حاصل کر سکیں جنھوں نے اس قوم کو آگے بڑھانے میں نمایاں رول ادا کیا تھا۔ ان کے مشہور جریدے ٹیٹلر، اسپیکٹیٹر اور گارڈین کا ہی مطالعہ ہے کہ سرسید انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق جیسے معلم الاخلاق رسالے نکال سکے اور ان ہی کے طرز پر اپنے دانشور دوستوں سے اصلاحی مضامین لکھوا سکے اور اسی مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیمی ماحول کو غور سے دیکھا، نہایت قریب سے اس کا معائنہ کیا اور اس کے طرز پر ہندوستان میں ایم۔اے۔او۔ ہائی اسکول کی بنیاد رکھی جو بعد ازاں ایم۔اے۔او۔ کالج آگے چل کر یونیورسٹی میں تبدیل ہوا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانا گیا۔ مسلم قوم کی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر سرسید سے متاثر ہو کر مختلف شخصیات نے اپنے اپنے علاقوں میں تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ لاہور میں اسلامیہ کالج، کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام، پشاور میں اسلامیہ کالج اور کانپور میں حلیم کالج کی بنیاد رکھی۔

سرسید اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ قوم کی بدحالی اور اس کی تنزلی کا ایک بڑا سبب توہم پرستی اور مذہب کی اندھی تقلید تھی۔ ان کے خیال میں بعض عقائد مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکتے تھے اور روڑا بن کر ان کی ترقی کی راہ میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ اسی لیے سرسید نے سائنس کی روشنی میں مذہب کی نئی تعبیریں پیش کیں اور عقل کی روشنی میں مذہب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ اسی لیے انھوں نے نیچر پر زور دیا اور ایسی بہت سے امور کا انکار کیا جنھیں عقل کی کسوٹی پر پرکھنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ انھوں نے دلیلوں سے یہ واضح کرنا چاہا کہ جسے لوگ مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں وہ دراصل محض رسم ہے۔ سرسید نے یہ استدلالی طریقہ اس لیے اپنایا تا کہ قوم خود بھی عقل کو اپنا رہنما بنائے اور توہم پرستی کے اس اندھیرے سے باہر نکل آئے جو اسے نئی روشنی میں آنے اور اس کی برکتوں کو پانے سے روکتی ہے مگر مذہبی معاملات میں عقل کا یہ عمل دخل بیش تر لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ چنانچہ سرسید کے مذہبی افکار اور ان کے اس نئے اپروچ کی شدّت سے مخالفت بھی ہوئی حالانکہ ایک ایسے زمانے میں جب مذہب کے روایتی تصور نے ذہنوں کو زنگ آلودہ کر دیا تھا، سرسید احمد خاں نے عقل سلیم کے ذریعے اسلام کی مدافعت کی اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلام زمانے کے نئے تقاضوں کو نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ نئے حقائق کی عقلی توضیح کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ علی گڑھ تحریک نے سرسید کے مذہبی افکار سے نہ صرف داخلی قوت حاصل کی بلکہ تنگ نظری، تعصب اور انتشار کو بھی کم کیا۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ علی گڑھ تحریک سے دانشوروں کے ایک بڑے طبقے کو جوڑنے کا کام سرسید احمد خاں کے اسی عقلی اپروچ نے کیا۔

سرسید احمد خاں نے نہ صرف اس مشکل وقت میں مسلمانوں کی ڈوبتی نیا کو سنبھالنے کی کوشش کی بلکہ اس زوال پذیر قوم کی زبان کو غیر معمولی ترقی دے کر اردو ادب کے ارتقاء میں بھی حصہ لیا اور اردو نثر کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا۔ بقول سرسید:۔

''ہم نے جو نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا قافیہ کیچڑ تو نہیں رہا۔ بلکہ شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی۔ ہماری زبان کے علم و ادب میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں اور قصہ کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہئے تھا۔ نہیں وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں اور جودت طبع و تلاش مضمون کے لئے نہایت مفید ہیں۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھی۔ دوسرے قسم کے مضامین جو درحقیقت وہی اصل مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں نہ تھے نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے ردیف اور قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔۔۔۔۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔''

(مقالات سرسید: حصہ دہم، مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی: ص ۱۱۲)

سرسید احمد خاں کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ قوم کا تہذیبی سرمایہ خصوصاً ادب جھوٹ، مبالغہ اور سستی تفریح کا سامان بن کر رہ گیا ہے۔ ادب جو زندگی کا ترجمان اور معلم اخلاق ہوتا ہے، خود زندگی سے دور اور اخلاقی پستی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ سرسید احمد خاں ادب کی طاقت کو پہنچانتے تھے اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ قوم کی اصلاح کا کوئی سب سے کارگر اور آسان حربہ ہو سکتا ہے تو وہ ادب ہے۔ اسی لیے انھوں نے اردو نثر کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ مختلف انداز سے مختلف

موقعوں پر انھوں نے اس پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ سرسید نے اردو زبان وادب کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا اگر ان کو سمیٹا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ:۔

''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں اپنے اس ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ دوستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیال سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی میں رہتی ہے اور دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفٰی عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے، اور دل ہی میں بیٹھے۔''

(مقالات سرسید: مرتبہ عبداللہ خاں خویشگی: ص ۲۲۷)

سرسید چاہتے تھے کہ زبان کو اظہارِ مطالب کا ذریعہ بنایا جائے۔ تصنع اور بیان کی پیچیدگی سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ بات اس طرح کہی جائے کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ علمی مضامین اور اخلاقی حکایتوں پر توجہ دی جائے۔ روایتی شاعری کو خیر باد کہا جائے اور شاعری کو قوم و معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔ ساتھ ہی نیچر کو شاعری میں جگہ دی جائے۔ حالی کی ''مسدس'' اس کا بہترین نمونہ ہے۔ جو بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:۔

''تہذیب الاخلاق کی منظوم شرح ہے۔''

(مضمون ''سرسید کا اثر ادبیاتِ اردو پر'' مشمولہ علی گڑھ میگزین، علی گڑھ تحریک نمبر، مرتبہ نسیم قریشی، ص ۲۷)

سرسید احمد کے یہ خیالات ادیبوں کے لیے مشعل راہ بن گئے۔ اس زمانے کے لکھنے والے زیادہ تر مصنفین سرسید کے ان خیالات سے ایسے متاثر ہوئے کہ اردو زبان کا اظہار واقعی آسان اور سادہ ہو گیا اور ادب اصلاح کا ذریعہ بن گیا۔ جھوٹ اور مبالغہ کی جگہ ادب میں صداقت اور خلوص کو جگہ ملنے لگی۔ اس اصول کی روشنی میں انجمن پنجاب کی نظمیں بھی کہی گئیں اور دوسری قومی نظمیں بھی۔ مولانا حالی کی مشہور نظم ''مسدس حالی'' سرسید کے انھیں خیالات کا ترجمان بن کر سامنے آئی۔ محمد حسین آزاد کی نظم ''خوابِ امن'' اور انجمنِ پنجاب کی بنیاد بھی سرسید کے انھیں افکار کے نتیجے میں سامنے آئی۔ معین احسن جذبی کے خیال میں:۔

''نظم بھی اس کی (سرسید) کچھ کم احسان مند نہیں۔ مولانا محمد آزاد اگر چہ نئی اور نیچرل شاعری کے بانی ہیں لیکن اس کی رخ کو سادگی اور افادیت کی طرف موڑنے میں سرسید کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔''

(حالی کا سیاسی شعور، معین احسن جذبی، ص ۱۸)

گویا علی گڑھ تحریک نے اپنے اصلاحی مشن کی کامیابی کے لیے اردو زبان وادب پر خصوصی توجہ دی اور اس تحریک کے زیرِ اثر اصلاح معاشرہ کے ساتھ ساتھ زبان وادب کی اصلاح بھی ہوتی گئی اور اس میدان میں ایسی اصلاح ہوئی کہ اردو زبان نکھرتی اور سنورتی چلی گئی اور اس زبان کا دامن طرح طرح کے ادبی نمونوں سے پھرتا چلا گیا۔ خود سرسید نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق طرح طرح کی تحریریں قلم بند کیں۔ علمی مضامین تو لکھے ہی انشائیے بھی لکھے، اخلاقی اور تمثیلی کہانیاں بھی تحریر کیں اور اپنے قلم کار دوستوں کو بھی اس راہ پر لگا دیا اور ان کے احباب اس میدان میں ایسے مستعد ہوئے کہ اردو زبان میں نئے انداز کے شعر وادب کا ڈھیر لگتا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سرسید کی اصلاحی تحریک ایک طرح سے ادبی تحریک بن گئی۔ اس تحریک کے زیرِ اثر لکھے گئے ادب کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ سرسید احمد خاں کی اس تحریک نے اردو ادیبوں سے سوانح عمریاں بھی لکھوائیں اور تاریخی کارنامے بھی قلم بند کروائے۔ تخلیقی نثر کے نمونے بھی تحریر کروائے اور تنقیدی نگارشات کی جانب بھی توجہ مبذول کرائی۔ اس کے زیرِ اثر ناول بھی لکھے گئے اور نئے انداز کی شاعری بھی کی گئی۔ اس تحریک کے ادبی پہلو کو ٹھیک سے سمجھنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے دوران لکھے گئے ادب کا یہاں تفصیلی جائزہ بھی پیش کر دیا جائے۔

سرسید تحریک میں گرچہ مرکزی حیثیت قومی وملکی اعلا مغربی علوم کا حصول تھا مگر اس تحریک کا ایک جز سرسید کی نثری خدمات کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ سرسید نے اُردو نثر کو سہل اور سلیس بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس سے قبل

فورٹ ولیم کالج کے ادبا نے بھی اردو نثر کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا اور اردو نثر کو الفاظ پرستی سے نجات دلا کر اس کو بے تکلف اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ مگر اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ فورٹ ولیم کالج کی نثر کی زبان تو سادہ تھی لیکن اس نثر کو صرف قصوں سے سروکار تھا۔ عام آدمی کی زندگی، اس کے مسائل، اس کی اصلاح اس نثر کا موضوع نہ بن سکی۔ مرزا غالب نے بھی نثر کے میدان میں طبع آزمائی کی اور سرسید کی نثر پر مرزا کے اسلوب کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ چوں کہ اس تحریک کا بنیادی مقصد اصلاح معاشرہ تھا اس لیے اس نے اپنی پوری توجہ خواص کے بجائے عوام کی جانب مبذول کی اور اس مقصد کے لیے اس نے جب ادب کو اپنا وسیلہ بنایا تو شاعری کے بجائے نثری اظہار کی طرف زیادہ توجہ دیا۔ اس لیے کہ شاعری اس تحریک کی ضرورت کی کفیل نہیں ہوسکتی تھی۔ چوں کہ اس تحریک نے سستی جذباتیت کو فروغ دینے کے بجائے گہرے تعقل، تدبّر اور شعور کو پروان چڑھانے کا عہد کیا تھا، اس لیے نثری پیرایہ بیان ہی ان مقاصد کی تکمیل میں معاونت کرسکتا تھا، چنانچہ ادبی سطح پر اس تحریک نے اردو نثر کا ایک باوقار، سنجیدہ اور توازن معیار قائم کیا اور اسے شاعری کے مروجہ مقفّٰی اور مسجّع اسلوب سے چھٹکارا دلا کر سادگی اور متانت کی صاف ستھری اور کشادہ ڈگر پر ڈال دیا۔ اس طرح ادب کی افادی اور مقصدی حیثیت اُبھر کر سامنے آگئی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اردو زبان خصوصاً نثر کو وسعت ملی بلکہ اردو ادب کے اسالیب بیان کو سائنٹفک اپروچ، استدلالی انداز اور سادہ طریقہ اظہار بھی ملا، ساتھ ہی اس کے موضوعات کا دائرہ بھی وسیع ہوا۔

اس تحریک کے مقصد اور ادبی مشن کے زیر اثر جن اصناف پر خصوصی توجہ کی گئی ان میں سوانح یا سیرت نگاری، انشائیہ نگاری، مضمون نگاری اور تنقید نگاری اہم ہیں۔ سوانح نگاری ایک ایسی صنفِ ادب تھی جس میں اپنے اسلاف کے کارنامے بیان کیے گئے تھے چنانچہ اس صنف کو اظہار کا ذریعہ بنا کر اسلام کے نامور ہستیوں کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی تا کہ قوم اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم کو اپنے لیے مشعل راہ بنا سکے اور دین و دنیا دونوں میں ترقی کر سکے۔ اسی مقصد کے پیش نظر شبلی نعمانی کی سیرت النبی، سیرت النعمان، المامون، الفاروق، مولانا حالی کی حیات سعدی، حیات جاوید اور یادگار غالب جیسی سوانحی کتابیں تحریر ہوئیں۔ سرسید احمد خاں کی خطباتِ احمدیہ، مولوی چراغ کی بی بی حاجرہ، ماریہ قطبیہ اور ڈپٹی نذیر احمد کی امہاتِ الاّ بھی اسی مقصد کے زیرِ اثر لکھی گئیں۔ خطبات احمدیہ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے کہ وہ زن وشوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو اور اس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کی تمام تلخیاں دفع ہو جائیں اور بغیر اس کے حالتِ معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بجائے اس کے حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو وہ زن وشوہر دونوں کے حق میں برکت اور حسنِ معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی، ہاں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابلِ نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہو پس ان کے افعال کی نفریں انہی پر ہونی چاہئے نہ کہ مذہب اسلام پر جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے۔ وہ عقل، انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی استاد کا بنایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کرنے کے لئے، اس کا جوڑا پیدا کیا تا کہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔''

(خطبات احمدیہ، سرسید احمد خاں، ص ۲۶۳)

مختصر یہ کہ سرسید کی علمی و ادبی تحریریں حسن بیان، خوبی خیالات اور زبان کی سلاست وفصاحت کے اعتبار سے اردو ادب میں کافی اہم ہیں۔ اصلاحی مقصد کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کے سنہرے اوراق بھی لوگوں کے سامنے کھولے جائیں تا کہ قوم اپنے روشن ماضی کی روشنی میں اپنی زندگی کو سجا سنوار سکے اور اپنے دل و دماغ کی تاریکیوں کو دور کر سکے۔ اسی نقطۂ نگاہ کے پیش نظر سرسید احمد خاں نے آئینہ اکبری، تزکِ جہاں گیری اور تاریخ فیروز شاہی مرتب کیں۔ مولانا شبلی نے ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' اور مولوی ذکاء اللہ نے ''تاریخِ ہند'' ترتیب دیں۔ اس تحریک نے تاریخ نگاری کی ایک نئی راہ نکالی اور اس بات کی کوشش کی کہ ایسا اسلوب اپنایا جائے جس میں قوم اور معاشرے کا دھڑکتا ہوا دل محفوظ ہو جائے اور جب اُسے پڑھا جائے تو رگوں میں خون کی گردشیں بڑھ جائیں۔

اصلاحی مشن میں تنقیدی شعور بھی بڑا اہم کردار نبھاتا ہے اور اسی تنقیدی شعور کی بدولت اچھے برے اور کھرے کھوٹی کی پہنچان ممکن ہو پاتی ہے۔ سرسید

احمد کا شعور بھی کافی بالیدہ تھا۔ انھوں نے اپنے اس تنقیدی شعور کا استعمال زبان وادب کے میدان میں بھی کیا اور اسی کی بدولت اردو زبان وادب کو جانچنے پرکھنے کا ایک نیا معیار دے دیا۔ سرسید احمد خاں نے ایسی تحریروں کو پسند کیا جن میں جمالیاتی پہلو کے بجائے زندگی کے افادی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ سرسید کی یہی پسند یا ان کا تنقیدی شعور دراصل ترقی پسند تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ان کے تنقیدی نظریے کے مطابق اعلا تحریر وہی ہے جس میں سچائی ہو اور جو دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے۔ اگر دیکھا جائے تو سرسید کے بعد آنے والے تمام تنقیدی تصورات کی اساس سرسید کا ہی تنقیدی شعور ثابت ہوا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادب کو افادی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا سلسلہ سرسید نے جو شروع کیا اور علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر آگے بڑھا وہ اور آگے جا کر ادب کو تنقید حیات کا مسلّمہ اصول بن گیا۔ غالباً سرسید کی اسی پہل کو نظر میں رکھ کر سید عبداللہ نے لکھا:۔

''سرسید سب سے پہلے ترقی پسند ادیب اور نقاد تھے''

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ سرسید نے اگرچہ تنقید کی کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی مگر اپنی تنقیدی تحریروں سے ادبی تنقید کی جو فضا ہموار کی اور اس راہ پر اپنے رفقا کو چلنے کی جو تلقین کی اور ان کے رفقا نے جو عملی نمونے پیش کیے انھیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر لکھی گئی تنقید سے قبل تنقید صرف ذاتی تاثرات تک محدود تھی لیکن سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے ادب کو بھی زندگی کے مماثل قرار دے دیا اور اس پر نظری اور عملی دونوں زاویوں سے تنقید کر کے اردو میں نئی تنقید کی راہیں ہموار کر دیں۔ اگر علی گڑھ تحریک نہ ہوتی اور سرسیدی بصیرت کام نہ کرتی تو مقدمہ شعر وشاعری، یادگارِ غالب اور شعرالعجم جیسی کتابیں اردو میں نہیں لکھی جاتیں۔

اصناف نثر میں سرسید اور علی گڑھ تحریک کا ایک اہم کارنامہ مضمون نویسی بھی ہے۔ مضمون نویسی کے اوّلین نمونے بھی علی گڑھ تحریک نے ہی فراہم کیے اور سرسید احمد خان کو اردو مضمون نگاری کا بانی تصور کیا گیا۔ انہوں نے ایک مغربی نثری صنف Essay کی طرز پر اردو میں مضمون نگاری شروع کی۔ وہ بیکن، ڈرائڈن، ایڈیشن اور سٹیل جیسے مغربی مضمون نگاروں سے کافی حد تک متاثر تھے۔ انہوں نے بعض انگریزی انشائیہ نگاروں کے مضامین کو اردو میں منتقل کیا۔ انھوں نے اپنے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں انگریز انشائیہ نگاروں کے اسلوب کو کافی حد تک اپنایا اور دوسروں کو بھی اس طرز پر لکھنے کی ترغیب دی۔ سید صاحب کے سارے مضامین کی حد میں داخل نہیں ہو سکتے، مگر مضامین کی کافی تعداد ایسی ہے جن کو اس صنف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً تہذیب الاخلاق کے کچھ مضامین تعصب، تعلیم وتربیت، کاہلی، اخلاق، ریا، مخالفت، خوشامد، بحث وتکرار، اپنی مدد آپ، عورتوں کے حقوق، ان سب مضامین میں ان کا اختصار قدر مشترک ہے۔ جو ایک باقاعدہ مضمون کا بنیادی وصف ہے۔

علمی اور سائنٹفک موضوعات کے علاوہ سرسید اور ان کے رفقا نے ہلکے پھلکے تخلیقی نوعیت کے مضامین بھی تحریر کیے جو انشائیہ کے اوّلین نمونے ثابت ہوئے، ''گزرا ہوا زمانہ''، ''امید کی خوشی'' اور ''بحث وتکرار'' اسی نوعیت کے مضامین ہیں جنھیں انشائیہ کے زمرے میں بھی رکھا جاتا ہے۔ امید کی خوشی کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:۔

''اے آسمان کی روشنی اور نا امید دلوں کی تسلی امید۔ تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک کو محنت کا پھل ملتا ہے تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے۔ تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے، عقل کے درمیان جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کی راگ بہتی نہروں کی لہریں اس کے دل کو راحت دیتی ہیں۔ اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں اور دور دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں سب آ موجود ہوتی ہیں۔''

(انتخاب مضامین سرسید: ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ص ۸۶)

مضمون نویسی اور انشائیہ نگاری کے میدان میں رسالہ تہذیب الاخلاق نے کلیدی کردار ادا کیا۔ علی گڑھ تحریک سے جڑے تقریباً تمام ادیبوں کے مضامین زیادہ تر اسی رسالے میں شائع ہوئے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک اور تہذیب الاخلاق کی بدولت اردو ادب کا تعارف ایک ایسی صنف سے ہو گیا جس کی جہتیں بے شمار تھیں اور جس کے اظہا کے رنگا رنگ قرینے موجود تھے۔

علی گڑھ تحریک کا اصلاحی وسیلہ ناول کو بھی بنایا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اسی اصلاحی مقصد کے تحت لکھے گئے۔ چونکہ سکوت دہلی کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی کے پیشِ نظر اس وقت مثالی کرداروں کو پیش کرنے کی ضرورت تھی اس لیے نذیر احمد نے اپنا سارا زور بیان کرداروں کو مثالی نمونے کی تخلیق میں صرف کیا۔ چونکہ مولوی نذیر احمد کے ناول داستانوں کے تخیلی اسلوب سے ہٹ کر لکھے گئے تھے اور ان میں حقیقی زندگی کی جھلکیاں بھی موجود تھیں اس لیے انھیں ایک بڑے طبقے میں قبولیت بھی حاصل ہوئی اور ان ناولوں کے ذریعے علی گڑھ تحریک کے متعدل اور متوازن عقلیت کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح نذیر احمد کی کاوشوں سے نہ صرف یہ کہ علی گڑھ تحریک کے مقاصد کے حصول میں مدد ملی بلکہ اردو ناول کی صنف بھی پروان چڑھی۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ علی گڑھ تحریک کے فروغ کے لیے نثری اظہار زیادہ موزوں اور مناسب تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تحریک سے اردو نثر کو فروغ ملا مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اس تحریک نے شعری اظہار کی طرف سے آنکھیں موند لی ہوں، اس تحریک نے شاعری کی اصلاحی کی جانب بھی توجہ کی اور غزل کے بجائے نظم پر زور دیا اور نظم پر اس لیے زور دیا کہ اخلاقی اور اصلاحی مضامین کے اظہار کے لیے منظّم زیادہ مناسب تھی۔ سرسید کے خیال میں نظم غزل کے مقابلے میں زیادہ طاقتور وسیلہ اظہار ثابت ہو سکتی تھی۔ اسی لیے انھوں نے ایک جگہ لکھا بھی:۔

''ہماری زبان کے علم و ادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی''

اسی بنا پر سرسید احمد خاں نے غزل کی ریزہ خیالی کے برعکس نظم کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے کہ نظم میں خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا جا سکتا تھا۔ نظم کے فروغ میں سرسید کے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مولانا حالی سے ''مسدسِ حالی'' لکھوائی اور محمد حسین آزاد سے انجمن پنجاب کے بنیاد ڈلوادی جس کے جلسوں میں صرف نظمیں پیش کی گئیں۔ مختصر یہ کہ علی گڑھ تحریک ایک ادبی تحریک بھی ثابت ہوئی اور اس لحاظ سے اس کے اثرات کا دائرہ بہت دور تک گیا۔ اس تحریک کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اردو زبان و ادب کی اصلاح کی گئی، ادب کو افادی بنایا گیا بلکہ اسلوب کو آسان، عام فہم اور پر اثر بھی بنایا گیا۔ نئی نئی اصنافِ سخن کا تعارف کرایا گیا، اور ان کے عمدہ نمونے پیش کیے گئے۔ یہ اسی تحریک کی دین ہے کہ اردو نثر سائنسی اور علمی موضوعات کے اظہار کے قابل بن سکی۔ اردو میں انشائیہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بھی اسی تحریک سے ہوا اور جدید تنقید کی داغ بیل بھی اسی کے زیرِ اثر ڈالی گئی اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سوانح نگاری، مضمون نویسی وغیرہ اصناف کے فروغ میں سب سے زیادہ کردار اسی تحریک نے ادا کیا۔

اس تحریک کے سلسلے میں ایک آخری بات یہ ہے کہ بے شک اس تحریک کے بانی سرسید احمد خاں تھے مگر یہ تحریک تیزی سے پروان نہیں چڑھتی اگر اسے سرسید کے رفقا کا ساتھ نہ ملا ہوتا سرسید کے علاوہ جن ادیبوں اور دانشوروں نے اس کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ان میں مولوی ذکاء اللہ، چراغ علی، محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد، وقار ملک، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی، مولوی سمیع اللہ وغیرہ کے نام نمایاں ہیں ان سب نے اپنی اپنی سطح سے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ کسی نے عملی سطح پر بیداری پیدا کی تو کسی نے سماجی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ کسی نے اصلاح معاشرہ کے لیے قلم کو ہتھیار بنایا تو کسی نے مضامین لکھے، کسی نے کہانیاں لکھیں۔ کسی نے نظمیں کہیں، کسی نے مضامین تحریر کیے، کسی نے تنقید نگاری کو اپنا پیشہ بنایا، تو کسی نے اچھی کتابوں کے ترجمے کیے، کسی نے مذہب کو سائنس کی روشنی میں پیش کیا تو کسی نے اخلاق کی درستگی کے نئے اصول مرتب کیے۔ اس طرح اس تحریک دائرہ کامیابی کی طرف بڑھتا گیا اور وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اسی لیے اکبر الہ آبادی نے سرسید کے متعلق اپنے خیالات کا مظاہرہ کچھ اس انداز میں کیا:۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو کہتا ہوں کہ اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اکبر نے صرف ہماری تہذیب کی اس روایت کی پاسداری ہی نہیں کی جس میں مرنے والے کے تعلق سے برا کہنا بہتر نہیں مانا جاتا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاں کے اندر بہت سی ایسی خوبیاں تھیں جن کی آج امت مسلمہ کو اشد ضرورت ہے۔

سرسید احمد خان کی انفرادیت

سرسید احمد خاں کسی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، یہ ایک رسمی جملہ ہوسکتا ہے لیکن حقیقت پر مبنی ہے۔ سرسید احمد خان کی شخصیت اوران کی گراں قدر کارناموں کی بیشتر جہتوں اور رخوں پر نامورانِ علی گڑھ کے علاوہ ہندو پاک کے مشاہیر نے اردو اور انگریزی میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ اب میں یہ نہیں سمجھتی ہوں کہ ان پر کوئی نئی منفرد تحریر سامنے لائی جاسکے گی۔ لیکن ان سارے امور کے باوجود مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ان پر لکھی گئی کتابیں یا ان پر لکھے گئے مضامین کے بطن یا متن کے اندرون بھی ایسے بہت سارے گوشے مخفی ہیں جو تحقیق طلب ہی نہیں بازیافت کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔

سرسید احمد خاں کی زندگی کی کئی حیثیتیں ہیں۔ انھیں بحیثیت مصنف اور محقق و مورخ و مفسر و مفکر کے ساتھ بحیثیت مصلح مذہبی اور بحیثیت ماہرِ تعلیم کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو زبان وادب میں اتنی اعلیٰ شخصیت دیکھنے کو نہیں ملتی جس نے پورے ایک عہد کو ہی نہیں بلکہ کئی نسلوں کو متاثر کیا ہنوز اس کا سلسلہ حالات کی تبدیلیوں اور آشوب زمانہ کے مطابق مزید توجہ طلب بنتا جارہا ہے اور فی الحقیقت آنے والی نسلیں ان پر ہمیشہ فخر کریں گی۔

سرسید احمد خاں کے تصنیفی اور علمی کارناموں اوران کی دیگر عملی سرگرمیوں کی درجہ بندی تین عہد کے دور میں کیا جاسکتی ہے۔

(۱) ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک

(۲) ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک

(۳) ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۸ء تک

چونکہ سرسید احمد خان عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے علاوہ کئی زبانوں سے واقف تھے۔ اس لئے ان زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کے متواتر مطالعے اوران سے حاصل شدہ علمیات نے ان کے اندر ایسا کیمیائی ذوق پیدا کردیا تھا کہ ان کی تحریروں میں تازگی کے ساتھ ایک انقلابی لب ولہجہ پیدا ہوگیا تھا۔ مذہبیات کے حوالے سے لکھی جانے والی ان کی کتابیں اب بھی حوالے کے کام آتی ہیں اور اہلِ علم ان سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ سرسید احمد خان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ان کی تحریروں میں حضرت سید بریلویؒ اور حضرت شاہ عزیزؒ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ وہ امام غزالیؒ کے بھی پیروکار تھے۔ ان سے بھی بے حد متاثر تھے۔ ان کی تحریروں میں ان علماء کے اثرات دکھائی پڑتے ہیں۔

۱۸۶۹ میں انگلستان کے سفر کے دوران انھوں نے مغربی تہذیب وتمدن کو بڑے قریب سے دیکھا، ان کی ترقیات کے اسباب پر غور وفکر کیا۔ نئے اذہان کی پرداخت کے طور طریقوں کو دیکھتے ہوئے اپنی ذہنی روش میں تبدیلی پیدا کی۔ انگلستان میں دوران قیام مغربی تعلیم کے اثرات اوران کے دوررس نتائج ان پر کھل کر واضح ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے پالیسیوں کے خلاف رہتے ہوئے بھی سماجی طور پر تعلیمی ترقی کو فوقیت دیتے ہوئے مغربی تعلیم کی بھرپور حمایت کی۔ ان کا پختہ ارادہ تھا کہ تعلیمی ترقی کے بغیر کوئی بھی قوم اپنے پسماندہ حالات سے باہر نہیں نکل سکتی۔ انھوں نے تعلیم وتدریس کے نئے منہاج ومعیار قائم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کی تعلیمی خدمات کے تعلق سے سب سے زیادہ لکھا گیا ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تو اس کی زندہ وتابندہ مثال ہے۔

ان کی مشہور زمانہ کتاب ''آثار الصنادید'' جس کی پہلی اشاعت ۱۸۴۷ء میں ہوئی تھی۔ یہ کام انھوں نے اپنے قیام دہلی کے دوران کیا تھا۔ اردو تحقیق کے تذکرے میں اس کتاب کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ جس میں دہلی کے اہم اور تاریخی عمارت کے تعلق سے تحقیقی مواد یکجا کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ جس میں مشہور ماہر لسانیات اور محقق ''گارساں دتاسی'' نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ تاریخ سے سرسید احمد خان کی دلچسپی بہت زیادہ رہی ہے اور اس حوالے سے انھوں نے کئی کتابیں تصنیف وتالیف ومرتب کی ہیں۔ یوں تو ان کی کتابوں کی فہرست طویل ہے لیکن ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی ان کی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کو کافی مقبولیت ملی تھی اس کتاب کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ سرسید احمد خان پر یہ الزام ہے کہ انھوں نے انگریزوں کی ہمیشہ حمایت کی۔ لیکن ان کی تمام تحریروں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات

خوشگوار ہو جائیں۔

اس کے لئے ضروری تھا کہ ان دونوں قوموں کی مذہبی وحدت کا اصل تسلیم کرایا جائے۔اس نظریے کے تحت انھوں نے کئی مضامین اردو اور انگریزی میں بھی لکھے۔ان کی تصانیف اور مضامین کے فہرست خاصی طویل ہے یہاں سب کا تذکرہ ممکن نہیں۔حالانکہ شروع میں سرسید پر امام غزالی کی فکریات کا گہرا اثر دکھائی پڑتا ہے۔جس کا ثبوت امام غزالی کی کتاب کیمیائے سعادت کے کئی ابواب کا ترجمہ ملتا ہے۔حالانکہ کئی علماء نے شدید اختلاف کیا یہی نہیں بلکہ ان کی تعلیمی تحریک کی بھی اس وجہ سے سخت مخالفت ہوئی تھی۔

سرسید احمد خان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جدید نثر اردو کے بانی ہیں۔انھوں نے سادہ اسلوب نگارش اور سلیس طرزِ بیان سے اردو نثر کو ایک نیا لب ولہجہ عطا کیا۔یہی سبب ہے کہ ان کے بیان میں تاثیر اور دلکشی سے ہر صاحب طرز متاثر ہوا۔اور اردو نثر میں منشیانہ تکلفات کے خلاف اپنی راہ بنائی۔اس کے ساتھ ہی سرسید احمد خان نے اردو نثر کو قصوں، کہانیوں کے حدود سے نکال کر نئے فکری اور سنجیدہ علمی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

سرسید احمد خان ایک ایسی آفاقی وعبقری شخصیت تھی جنھوں نے اپنی ۸۱ سالہ زندگی میں ایسے ایسے معرکہ آرا کام کئے کہ ان کے مخالفین اور معترضین بھی بعد کے زمانے میں معترف ہو گئے کہ سرسید جیسی شخصیت کا کارنامہ ایک بڑے ادارے جیسا رہا ہے ایک ادارہ جو اپنا فریضہ انجام نہیں دے پاتا انفرادی طور پر سرسید نے کر دکھایا۔یہ ماضی اور حال کا عہد اس کا گواہ ہے۔اردو زبان کے فروغِ اشاعت میں اور اس کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے میں سرسید نے اہم رول ادا کیا۔سرسید نے اپنی بصیرت اور ژرف نگاری سے ایسے ایسے جید رفقاء کو ساتھ رکھا جنھوں نے تاریخ کے نئے باب رقم کئے۔سیاسی، سماجی، علمی، تحقیقی اور ادبی سطح پر ایسے کارہائے نمایاں کام انجام دیئے کہ تاریخ اسے فراموش نہیں کر سکتی۔

سرسید کی شخصیت کے اندرون کئی شخصیتوں کا اجتماع تھا۔ان کے کارناموں کا پہلا اعتراف عالمی سطح پر Colonel G. F. I. GRAHAM نے ۱۸۸۵ء میں اپنی کتاب The Life and work of Syed Ahmed Khan میں کیا۔حالانکہ ۱۹۰۱ء میں مولانا الطاف حسین حالؔی نے ''حیات جاوید'' لکھ کر سرسید کی زندگی اور ان کے تمام اہم کارناموں کو اہلِ زمانہ سے روشناش کرایا۔بعدازاں سرسید پر کتابیں اور مضامین لکھنے کا سلسلہ تیز تر ہو گیا۔سرسید احمد خان کے تعلیمی تصورات، مذہبی فکریات، ادبی تحقیقات، علمی تصنیفات کو موضوعِ گفتگو بنایا جاتا رہا ہے جو تا حال قائم ہے۔اس کی تازہ ترین مثال Professor Shafey Kidwai کی کتاب SIR SYED AHMAD KHAN. :REASON, RELIGION AND NATION میں ملتی ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ باشندگاں عالم بالخصوص مسلمان طبقہ تا حال عہد سرسید میں جی رہے ہیں یا جینا پڑ رہا ہے۔۲۱ ویں صدی کے تناظر میں سرسید کی فکریات کو راہِ عمل میں لانا ایک مخصوص طبقے کے لئے اس لئے لازمی ہو گیا ہے کہ وہ ناخواندگی کے ساتھ ساتھ پس ماندگی کے حالات میں جی رہا ہے۔یہ بھی غور طلب امر ہے کہ سرسید نے صرف زبانوں کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ علم ریاضی، علم ہیئت اور علم طب سے بھی فیض یاب ہوئے اور ان علوم سے خود کو بہرہ ور کیا۔

سرسید احمد خان نے اپنے سفر لندن کے دوران وہاں کی معیاری صحافتی زندگی کو دیکھتے ہوئے ہندوستان پہنچ کر ۱۸۷۰ میں ایک رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔اس رسالہ کا نام انھوں نے ابن مسکویہ کی مشہور کتاب ''تہذیب الاخلاق وتطہیر الاعراق'' سے مستعار لیا تھا۔انھوں نے تہذیب الاخلاق کے سرنامے پر یہ جملہ لکھا تھا:

> ''قوم کی محبت ایمان کا جز ہے۔پس جو شخص اپنی قوم کی سربلندی کی کوشش کرتا ہے وہ دراصل اپنی دین کی سربلندی کی کوشش کرتا ہے۔''

سرسید کا یہ تجویز کردہ جملہ قوم کی اہمیت اور ضرورت کا اظہار یہ رہا ہے۔اس رسالے کے ذریعے مسلمانانِ ہند کے حوالے سے اس وقت کے انگریزی حکومت کو آگاہ کر کے کہ جدید تعلیم کے فائدے سے ہندوستانی مسلمان کیوں محروم رہے تھے۔اس کے اسباب دریافت کر کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری شروع کرنے کی تحریک پیدا کی۔انھوں نے اس رسالے کے توسط سے مختلف نوع موضوعات پر مضامین لکھے۔جن میں مذہب اور عام تعلیم، رسوم ورواج کی

پابندی کے نقصانات، دین اور دنیا کا رشتہ، علوم جدید، عورتوں کے حقوق، مصلحانِ معاشرت، مسلمانِ تعلیم وتربیت، انسان میں تمام خوبیاں تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں، تہذیب قوموں کی پیروی، غرض کہ سیکڑوں مضامین لکھ کر انھوں نے ملتِ اسلامیہ کو ہر طرح سے ذہنی طور پر بیدار رہنے کی تلقین کی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ رسالہ تہذیب الاخلاق سرسید شناسی میں اہمیت کا حامل ہے۔

سرسید احمد خان کی شخصیت کی تصویر حالی نے یوں کھینچی ہے:

''سرسید کا رنگ سرخ وسفید، پیشانی بلند، سر بڑا اور موزوں، بھویں جدا جدا، آنکھیں روشن، نہ بہت بڑی نہ چھوٹی، ناک نسبتاً چھوٹی، کان دراز، گلے میں آگے کی جانب بڑی رسولی جو داڑھی میں چھپی رہتی تھی۔ جسم بہت فربہ، قد لمبا، ہڈی چکلی، سینہ چوڑا، ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء نہایت قوی اور زبردست، وزن ساڑھے تین من تھا، عنفوان شباب میں رسولی نہ تھی اور بدن بھی زیادہ فربہ نہ تھا۔ بڑھاپے کی وجاہت صاف دلالت کرتی تھی کہ جوانی میں بہت خوبصورت ہوں گے۔ ان سے ملنے والے ان کی شکل وصورت سے بہت متاثر تھے۔ دن رات لکھنے پڑھنے کا کام جوانوں کی طرح بلا تکان کرتے تھے۔ آخری ایام میں بیمار رہنے لگے۔ اٹھنے بیٹھنے میں دشواری پیش آنے لگی تھی۔ نسیان بھی بڑھ گیا تھا، خوراک گھٹ گئی تھی تاہم اپنے کام میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔''

(حیات جاوید، ص ۶۶۱)

سرسید نے صرف کتابیں تصنیف وتالیف نہیں بلکہ دوسرے اپنے معاصرین کی کئی ہم کتابوں کی تصحیحات بھی کیں اور کئی بے حد کارآمد دیباچے لکھے۔ تحقیق وتدوین کے سلسلے میں ہمیشہ مصروف رہتے۔ محنت اور کاوش سے جی نہیں چراتے۔ دوسروں کو مشورے دینے اور دوسروں کے مشوروں کو قبول کرنے میں انھیں کوئی قباحت نہ تھی صرف اس لئے کہ ان کے مزاج میں استقلال تھا اور یہی استقلالی طبیعت اور مزاج نے انھیں ایک یگانۂ روزگار اور نابغہ عہد بنا دیا۔ ان کی کتابوں کی فہرست تو طویل تر ہے ہی ساتھ ساتھ ان کی عملی زندگی کے نمونے بھی صاف طور پر امت مسلمہ کو دکھائی پڑ رہے ہیں۔ انھوں نے جو خطبات دیے، ملک اور بیرون ملک جو اسفار کئے اور امت مسلمہ کو ذہنی طور پر بیدار کرنے کے لئے جو حکمت عملی اپنائی وہ ناقابل فراموش ہے۔ ان کا اس پر پختہ ایمان تھا کہ مذہب اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے۔ انھوں نے مغربی مصنفین کی جانب سے پھیلائی جانے والی اسلام مخالف گمراہوں کے شافی جوابات انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں دے کر نمایاں کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے مسلمانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا یہی سبب ہے کہ حالی نے بھی اعتراف کیا کہ ''پنجاب کے مسلمان سرسید کی منادی پر اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر دوڑتا ہے۔''

سرسید کی تحریریں علمی حقایق اور لطائف پر مبنی ہیں جن میں مزاح کا لطف ہے تو آہ وکرب وزاری بھی۔ ان میں پند ونصائح ہیں تو تذکرۂ ماضی بھی۔ اس وقت کے حالات سے دلچسپی بھی ہے اور مسلم اقوام کے روشن اور تابناک مستقبل کی خواہش اور تمنا بھی۔

سرسید نے مضمون نویسی یا کتاب نویسی میں جو طرزِ تحریر اپنایا ہے وہ سلیس، سادہ اور واضح رہا۔ سرسید کی نثر کا جادو ان کے معاصرین کے ساتھ ساتھ مخالفین پر بھی پڑا۔ ایک زمانے سے جاری پر تکلف انداز تحریر آہستہ آہستہ متروک ہو گیا اور زیادہ تر مصنفین نے سرسید کا انداز بیان اختیار کیا۔ غرض ان کی نثر نے پورے ماحول کو متاثر کیا۔ انھوں نے اپنی مضمون نویسی کے حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے:

''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں کوشش کی۔ مضمون کے ادا کرنے کا ایک سیدھا اور صاف ستھرا طریقہ اختیار کیا۔ رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیال سے بھری ہوتی ہیں اور جس کے شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہی ہے اور دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی ہے ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا، سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں

پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں پڑے۔''

(تہذیب الاخلاق، یکم شوال ۱۲۹۲ھ۔ ۱۸۷۶ء)

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید سے پہلے اردو ادب کی نثری تحریریں تصوف، تاریخ اور تذکرہ تک محدود تھی۔ طبعی علوم، ریاضیات اور فنون لطیفہ کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ سرسید نے ایک انقلاب لا کر اہل علم کو اس جانب بھی متوجہ کیا اور نثر میں موضوعات کا تنوع کے ساتھ ساتھ سادگی پیدا ہوئی لیکن سب سے اہم امر یہ ہے کہ ان کا طریق کار فکر سے زیادہ عمل کی ترغیب دلاتا ہے۔ انھوں نے ادب سے انجماد، فرسودگی اور تعطل کو ختم کیا اور واضح مقصدیت، سنجیدگی، معقولیت اور ہمہ گیری کے راستے وضع کئے۔

سرسید نے ۱۸۵۷ کے بعد جب مسلمانوں کی تباہی کے اسباب پر غور و فکر کرنا شروع کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت صرف اس صورت میں حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ جدید تعلیم کی طرف مبذول ہو جائیں کیونکہ سرسید کا اولین مقصد مسلمانوں کی سماجی، سیاسی، معاشرتی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کرنا تھا یہی سبب ہے کہ ان کو ماضی کی بیشتر فرسودہ روایات سے بغاوت کرنی پڑی۔ حالانکہ اس دوران انھوں نے مصائب کا بھی سامنا کیا لیکن امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات نے ان کی ذہنی رو اور فکریات کو اس قدر ٹھوس اور مستحکم کر دیا تھا کہ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

سرسید ایک شخص کا نام نہیں، ایک تحریک، ایک ادارہ، ایک عہد کا نام ہے۔ جو اپنے عہد میں بھی زندہ تھا، حال میں بھی زندہ ہے اور مستقبل میں بھی زندہ رہے گا۔

☆☆☆

اشاریہ نقش نو (الہ آباد)

(۲۰۰۸۔۲۰۲۳)

۱۹۳۲ میں بیگم خورشید خواجہ نے الہ آباد میں حمیدیہ گرلس پرائمری اسکول کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ ادارہ ۱۹۷۵ میں ترقی کر انٹرمیڈیٹ کالج کے درجہ کو پہنچا اور اب یہاں ماسٹر ڈگری تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔''نقوش نو'' اسی کالج سے شائع ہونے والا سالانہ ادبی جریدہ ہے۔ نقش نو کا پہلا شمارہ ۲۰۰۹۔۲۰۰۸ ناصحہ عثمانی صاحبہ کی ادارت میں شائع ہوا۔ان کے علاوہ مجلس ادارت میں پروفیسر عبدالحق (سرپرست و مدیر اعزازی)، مسز تزئین احسان اللہ، (مدیر اعلی)، ڈاکٹر ریحانہ طارق، (نگراں) اور معاون مدیر کے طور پر مسز زرینہ بیگم کا نام شامل ہے۔ اسکی مجلس مشاورت میں شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر حنیف نقوی اور پروفیسر محمود الہی جیسے گراں قدر مشاہیر ادب شامل رہے ہیں۔آگے چل کر اس میں مامون ایمن (نیو یارک)، عارف نقوی (ماریشش)، آصف علی (جرمنی)، اسلم جمشید پوری، احمد محفوظ اور ریحانہ طارق جیسے ملکی اور ملکی مشاہیر ادب شامل ہوئے۔

ناصحہ صاحبہ اس ادارہ سے ۱۹۸۸ میں وابستہ ہوئیں اور ہنوز تدریسی خدمات کے ساتھ نقوش نو کے مدیر کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔آپ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تنقیدات وترجیحات'' بھی ۲۰۱۹ شائع میں ہو چکا ہے۔

نقوش نو کا ہر سال ایک شمارہ شائع ہوتا ہے اور اب تک اس کے ۱۵ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ان میں عام شمارہ کے علاوہ میر تقی میر، محمود الہی، انیسویں صدی میں اردو صحافت: دوارکا پرساد افق، غالب اور عہد غالب، شمس الرحمٰن فاروقی، ترقی پسند ادب اور خطوط نگاری نمبر بھی شائع ہو چکے ہیں۔

نقوش نو کے علاوہ اس کالج سے انگریزی رسالہ'' کاوش' ۱۹۹۷ سے شائع ہو رہا ہے۔اسکے ساتھ ہی ۲۰۰۴ میں بزم ادب کے نام سے ادبی تنظیم قائم کی گئی جو ہر سال نومبر میں نوائے اردو کا بھی انعقاد کرتی ہے۔جدید ٹیکنالوجی سے بھی یہ ادارہ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔کالج سے شائع ہونے والے دونوں رسالے ان کی ویب سائٹ پر مطالعہ کے لئے دستیاب ہیں۔یہ قابل ستائش بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

اس اشاریہ کو موضوع وار مرتب کیا گیا ہے۔تذکرے کے ذیل میں تخلص اور نام کو الفبائی ترتیب سے رکھا گیا ہے اور انہیں نمایاں کرنے کے لئے جلی کر دیا گیا ہے۔موضوع وار کے تحت مضمون کی عنوان وار الفبائی ترتیب دی گئی ہے۔عنوان کے بعد مضمون نگار اور پھر شمارہ نمبر اور صفحہ نمبر کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس

اشاریہ میں کراس ریفرنس کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔اگر کوئی مضمون ایک سے زیادہ موضوعات کو احاطہ کرتا ہے تو اسے دوسرے موضوعات میں بھی جگہ دی گئی ہے۔مثلاً ''سرسید اور صحافت'' کو ''تذکرہ مشاہیر' میں بھی رکھا گیا ہے اور ''صحافت'] میں بھی۔

اس اشاریہ کے آخر میں مضمون نگار کا بھی اشاریہ شامل ہے جس میں مضمون نگار کے ناموں کو الفبائی ترتیب دی گئی ہے اور نام کے بعد مضمون کا شمار نمبر درج ہے۔امید ہے یہ اشاریہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر سید مسعود حسن، خدا بخش لائبریری، پٹنہ (بہار)

۱	اُفق اور آرزو لکھنوی	عصمت نیلو انصاری	شمارہ نہم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۱۱۶
۲	جاں نثار اختر کے گھر آنگن کی عورت	ارشد جمیل	شمارہ یازدہم، ۲۰۱۸۔۲۰۱۹ص ۱۰۸
۳	اختر الایمان: نظم گوئی کی ایک منفرد آواز	زرینہ بیگم	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۱۱۴
۴	غالب کے تلامذہ میرٹھ: اسماعیل میرٹھی کا تصورعلم	فوزیہ بانو	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۶۸
۵	۱۹ویں صدی کا ادبی لکھنؤ اور منشی دوارکا پرساد افق	بشریٰ بانو	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۱۷
۶	دوارکا پرشاد افق کی تقدیسی شاعری	سید یحیٰ نشیط	شمارہ نہم، ۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص ۵۳
۷	اُفق اور آرزو لکھنوی	عصمت نیلو انصاری	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۱۱۶
۸	اقبال اور آرزوئے انقلاب	عبدالحق	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲ص ۱۷
۹	اقبال کا نظریہ اشتراکیت، تنقید اور ردتنقید	عبدالرحمٰن	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲، ص ۲۴۷
۱۰	ترقی پسند تحریک اور علامہ اقبال	طالب اکرام محمد	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲، ص ۳۴۱
۱۱	ساقی نامہ کا سیاسی اور سماجی پس منظر (محمد اقبال)	رشدیٰ قدسیہ	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰، ص ۱۸۴
۱۲	قرآن اور اقبال کی شاعری	ندرت محمود	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰، ص ۱۲۸
۱۳	کلام اقبال میں آدم علیہ السلام	محمد شاہد خاں	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۱۲۰
۱۴	کلام اقبال میں عربی کا منظوم ترجمہ	محمود الٰہی	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ص ۱۱۷
۱۵	اقبال کی نعت گوئی: ایک نیا انداز	عبدالقادر جعفری	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۵۹
۱۶	اقبال کے اردو اشعار میں ذکر انبیاء	ندرت محمود	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۵۹
۱۷	علامہ اقبال کے کلام میں عورت	شبانہ عزیز	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۲۷
۱۸	علامہ اقبال کا نظریہ خودی	طالب اکرام	شمارہ دہم، ۲۰۱۷۔۲۰۱۸ص ۱۱۰
۱۹	لالہ صحرا (محمد اقبال)	طالب اکرام	شمارہ دہم، ۲۰۱۷۔۲۰۱۸ص ۱۱۰
۱۹	لالہ صحرا (محمد اقبال)	توقیر احمد خاں	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰، ص ۵۵
۱۹/۱	خطوط اقبال میں تصوف کے مباحث	طالب اکرام	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۱۴۲
۲۰	اکبر الہ آبادی کی شاعری میں احتجاجی شعور	زرینہ بیگم	شمارہ دہم، ۲۰۱۷۔۲۰۱۸ص ۸۰
۲۰/۱	اکبر الہ آبادی فن خطوط نویسی کے آئینے میں	شیخ عمران	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۷۰
۲۱	کلام اکبر کی عصری معنویت	سفینہ سماوی	شمارہ دہم، ۲۰۱۷۔۲۰۱۸ص ۱۳۳
۲۲	اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ (لطیف النساء امتیاز)	محمد علی اثر	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹، ص ۹۳
۲۳	لکھنوی عہد کے ممتاز شعراء: صفی لکھنوی اور ثاقب لکھنوی	احسان حسن لکھنوی	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۳۰
۲۴	جلال لکھنوی کی غزل گوئی کے امتیازی عناصر	ای۔اے۔حیدری	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۳
۲۵	جوش کسان کے آئینہ میں	زرینہ بیگم	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹، ص ۲۱۴

۲۶	برج نرائن **چکبستؔ**: ایک قومی شاعر	رضیہ کاظمی	شمارہ یازدہم، ۲۰۱۸۔۲۰۱۹ص ۳۶
۲۶/۱	حسرت موہانی خطوط کے آئینے میں	فرح ہاشم	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۲۱۰
۲۷	امیر **خسروؔ**	شبانہ عزیز	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰، ص ۱۶۵
۲۸	خواجہ میر **دردؔ** اور ان کے عہد کا سیاسی اور سماجی پس منظر	عبدالقادر جعفری	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰، ص ۶۲
۲۹	خواجہ میر دردؔ کی عشقیہ شاعری	شہناز صبیح	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۷۸
۳۰	ن۔م۔ **راشدؔ** اور غزال شب	شمس الرحمٰن فاروقی	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۶
۳۱	علی **سردارؔ جعفری**: ایک تعارف	لائق فاطمہ	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۹۵
۳۲	علی سردارؔ جعفری کی ذات اور صفات خطوط کی روشنی میں	ابراہیم افسر	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲، ص ۱۷۳
۳۳	علامہ **شبلی** کی قومی شاعری	خالدہ خاتون	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۱۷۹
۳۴	**شمس الرحمٰن فاروقی** کا جہان 'رباعیات'	صالحہ صدیقی	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰۔۲۰۲۱، ص ۲۰
۳۵	فن شاعری کے مہرتاباں: **شمس الرحمٰن فاروقی**	زرینہ بیگم	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰۔۲۰۲۱، ص ۱۹۸
۳۶	منتخب اشعار **(شمس الرحمٰن فاروقی)**	شمس الرحمٰن فاروقی	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰۔۲۰۲۱، ص ۳۱۶
۳۷	**شہریارؔ: نئے لب ولہجہ کا شاعر**	شمیمہ یاسمین	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۱۵۴
۳۸	شہر غزل کا **شہریارؔ**	عاصم شہنواز شبلی	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹، ص ۱۷۲
۳۹	مجموعہ رباعیات 'جزو بوسیدہ' میں شاعر **صادقینؔ** کی خود کلامی، ژرف نگاہی اور سوال آمیزی کا ایک مختصر جائزہ	مامون ایمن	شمارہ یازدہم، ۲۰۱۸۔۲۰۱۹ص ۲
۴۰	**صباؔ** اکبرآبادی کی مرثیہ نگاری	مامون ایمن	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰، ص ۸۴
۴۱	لکھنوی عہد کے ممتاز شعراء: **صفی لکھنوی** اور ثاقب لکھنوی	احسان حسن لکھنوی	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۳۰
۴۲	اپنی بات **(غالبؔ)**	ناصحہ عثمانی	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۵
۴۳	۱۸۵۷ اور **غالبؔ** کے خطوط	اسلم جمشید پوری	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۲۲
۴۴	پہلی جنگ آزادی اور غالبؔ	ناصحہ عثمانی	شمارہ دہم، ۲۰۱۷۔۲۰۱۸ص ۷۰
۴۵	تفہیم غالبؔ اور شمس الرحمٰن فاروقی	ارشد جمیل	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۱۴۰
۴۶	حالی بحیثیت محقق **غالبؔ** (یادگار غالب کے حوالے سے)	شبنم حمید	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۳۲
۴۷	خطوط غالبؔ کا منظر نامہ	سیدہ نرجس فاطمہ	شمارہ یازدہم، ۲۰۱۸۔۲۰۱۹ص ۸۶
۴۸	زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم (غالبؔ)	محمد شاہد	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۱۸۱
۴۹	شخصی مرثیہ گوئی اور غالبؔ	لئیق رضوی	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۷۹
۵۰	عہد حاضر میں خطوط غالبؔ میں نہاں تاریخی اشارے کی معنویت	صالحہ رشید	شمارہ یازدہم، ۲۰۱۸۔۲۰۱۹ص ۲۹
۵۱	عہد حاضر میں **غالبؔ** کی معنویت	عبدالحق	شمارہ دہم، ۲۰۱۷۔۲۰۱۸ ص ۱
۵۲	**غالبؔ** ایک مکتوب نگار	شبانہ عزیز	شمارہ ششم، ۲۰۱۳، ۲۰۱۴ ص ۶۸

۵۳	**غالبؔ** بحیثیت نثر نگار	چودھری امتیاز احمد	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۱۹۳
۵۴	**غالبؔ** کی آفاقیت	عبدالحفیظ	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۱۴۹
۵۵	**غالبؔ** کی فارسی شاعری میں نشاۃ ثانیہ کے عناصر	عبدالقادر جعفری	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹، ص ۱۰۸
۵۶	**غالبؔ** کی فارسی شاعری	شبانہ عزیز	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۱۴۱
۵۷	غالبؔ کی فارسی مثنوی ''سرمہ بینش''	شبانہ عزیز	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۱۷۰
۵۸	فردفرید غالبؔ: ایک مختصر نفسیاتی جائزہ	مامون ایمن	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۷
۵۹	کلام غالبؔ میں ''تعمیر گھر'' کا تصور	زرینہ بیگم	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۱۵۹
۶۰	کہتے ہیں کہ **غالبؔ** کا ہے انداز بیاں اور	شاذیہ غلام انصاری	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۲۰۳
۶۱	مرزا اسداللہ خاں **غالبؔ**: ظرافت کے آئینہ میں	بشریٰ بانو	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۸۸
۶۲	مرزا اسداللہ خاں غالبؔ اور الہ آباد	صالحہ رشید	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۴۲
۶۳	مرزا غالبؔ اور دبستان میرٹھ کا ادبی شعور نقد	ابراہیم افسر	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۱۰۲
۶۴	موجودہ پُر آشوب دور کے پس منظر میں کلام **غالب** پر نظر ثانی	یوسفہ نفیس	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ص ۶۱
۶۴/۱	غالب کے خطوط میں زندگی کی کہانیاں	طاہرہ پروین	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۹۹
۶۴/۲	غالب کے فارسی خطوط کا مختصر تذکرہ	شبانہ عزیز	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۱۵۷
۶۴/۳	خطوط غالب معلومات کا گنجینہ	امتیاز احمد علی	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۲۱۹
۶۴/۴	خطوط غالب کی ادبی اہمیت	سراج انور محمد میراں	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۲۵۵
۶۴/۵	مرزا غالب کی خطوط نگاری	محمد سفیان احمد	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۲۹۰
۶۵	اسلوب **فیضؔ** میں داخلیت اور خارجیت	مامون ایمن	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۲۳
۶۶	ترقی پسند ادب کے سفیر: **فیض احمد فیضؔ**	عالیہ بیگم	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲، ص ۳۵۹
۶۷	**فیضؔ** کی نثر: ایک غیر جانبدارانہ تجزیہ	اسلم جمشید پوری	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۶۴
۶۸	معاصر میر **قائمؔ چاندپوری**	محمد ارشد رضوی	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۸۶
۶۹	حکیم غلام مولا بخش **قلقؔ میرٹھی** (حیات، شخصیت اور فن)	ابراہیم افسر	شمارہ یازدہم، ۲۰۱۸۔۲۰۱۹ص ۴۸
۷۰	**قلی قطب شاہ** کی شاعری میں ہندوستانی عناصر	زرینہ بیگم	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۴۸
۷۰/۱	عوامی مقبولیت کا شاعر: **کیفی اعظمی**	داؤد احمد	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲، ص ۲۲۵
۷۱	انقلاب کی حقیقت اور **مجازؔ**	علی احمد فاطمی	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۴۱
۷۲	غالب کا چہیتا شاگرد میر مہدی **مجروحؔ دہلوی**	فیروز دہلوی	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۳۱
۷۳	ترقی پسند تحریک کی نمائندہ آواز: **مخدومؔ** کا احتجاجی شعور	زرینہ بیگم	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲، ص ۱۸۹
۷۴	اب تو بھی قلم رکھ دے اے **میرؔ** ستم دیدہ	یوسفہ نفیس	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۱۷۰
۷۵	اپنی بات (**میر تقی میرؔ**)	ناصحہ عثمانی	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۳
۷۶	پیش لفظ (میر تقی میرؔ)	ناصحہ عثمانی	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۱

۷۷	حرف چند (میر تقی میرؔ)	ریحانہ طارق	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۴
۷۸	سرسری تم جہاں سے گزرے (میر تقی میرؔ)	مامون ایمن	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۴۶
۷۹	شیریں زبان شکستہ دل شاعر (میر تقی میرؔ)	لائق فاطمہ نقوی	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۱۲۴
۸۰	میرؔ بحیثیت مورخ	یوسفہ نفیس	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹، ص ۱۸۱
۸۱	میرؔ کا زندہ عجائب گھر	شمس الرحمٰن فاروقی	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۶
۸۲	میرؔ تقی میر کی فارسی شاعری	عبدالقادر جعفری	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۷۱
۸۳	میرؔ کی شاعری میں عظمت	نسیم الدین فریس	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۶۳
۸۴	میرؔ تقی میر دورانحطاط پر	سید عبدالباری	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۵۴
۸۵	میرؔ اور آگرہ	علی احمد فاطمی	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۸۶
۸۶	میرؔ کا معیار عشق	نفیس بانو	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۹۸
۸۷	کلام میرؔ ایک نفسیاتی جھلک	ہما محمود	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۱۱۱
۸۸	تذکرہ نکات الشعراء (میر تقی میرؔ)	فوزیہ بانو	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۱۲۳
۸۹	شیریں زبان، شکستہ دل شاعر (میر تقی میرؔ)	شہناز صبیح	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۱۴۷
۹۰	میرؔ بحیثیت مثنوی نگار	زرینہ بیگم	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۱۵۵
۹۱	ڈراما میر تقی میرؔ	نورینہ پروین	شمارہ سوم، ۲۰۱۰۔۲۰۱۱، ص ۱۸۱
۹۲	کلیدی خطبہ (میر تقی میرؔ)	شمس الرحمٰن فاروقی	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۶
			شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰۔۲۰۲۱، ص ۳۰۸
۹۳	خطبہ مہمان خصوصی (میر تقی میرؔ)	خواجہ اکرام الدین	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۱۳
۹۴	میرؔ کی دلّی اور میر کا غم دوراں	عبدالقادر جعفری	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۱۸
۹۵	شہر کی جمالیات اور میرؔ	عاصم شہنواز شبلی	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۲۷
۹۶	میرؔ کی خیال بندی	احمد محفوظ	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۳۶
۹۷	میرؔ کی شاعری اور ماس کمیونی کیشن	اسلم جمشید پوری	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۴۹
۹۸	مطالعہ میرؔ کی ایک جہت کا خاکہ	سراج اجملی	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۵۹
۹۹	تصوف اور میرؔ کی غزلیہ شاعری	نفیس بانو	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۶۶
۱۰۰	اٹھارہویں صدی کی دلّی کی کہانی میرؔ اور شعرائے معاصرین کی زبانی	یوسفہ نفیس	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۹۷
۱۰۱	تفہیم میرؔ اور ترقی پسند تنقید	ریشماں	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۱۱۸
۱۰۲	میرؔ قیام لکھنؤ کے حوالے سے	شبنم رضوی	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۱۵۲
۱۰۳	میرؔ کا تصور زندگی	ناصحہ عثمانی	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۱۶۲
۱۰۴	ذکر میرؔ پر ایک نظر	شبانہ عزیز	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۱۷۱
۱۰۵	میرؔ اور نظیر کی مزاجی انفرادیت اور موضوعاتی مماثلت	نگینہ جبیں	شمارہ پنجم، ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ ص ۱۷۷

۱۰۶	میرؔ کا شیوہ گفتار	زیبا محمود	شمارہ پنجم،۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۱۸۵
۱۰۷	میرؔ کی غزل گوئی	ایس۔این۔ایس۔ عابدی	شمارہ پنجم،۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۱۸۹
۱۰۸	میرؔ اور دردؔ غم ایک مطالعہ	زرینہ بیگم	شمارہ پنجم،۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۱۹۳
۱۰۹	میرؔ کی زندگی کا عکس ان کی شاعری پر	فرح ہاشم	شمارہ پنجم،۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۲۰۴
۱۱۰	میرؔ کی شاعری میں رجائیت	احسان	شمارہ پنجم،۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۲۱۰
۱۱۱	میرؔ کی واسوخت	نفیس احمد	شمارہ پنجم،۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۲۱۶
۱۱۲	کلام میرؔ میں عشق کی کارفرمائیاں	خدیجہ آئین	شمارہ پنجم،۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۲۲۱
۱۱۳	میرؔ اور دہلوی تہذیب	نورینہ پروین	شمارہ پنجم،۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۲۳۲
۱۱۴	مطالعات میرؔ پر ایک نظر	کائنات انصاری	شمارہ پنجم،۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۲۴۵
۱۱۵	میرؔ کی شاعری میں انسانی اقدار	خالدہ خاتون	شمارہ پنجم،۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۲۵۲
۱۱۶	میرؔ کا تصور عشق	عارفہ بیگم	شمارہ پنجم،۲۰۱۲۔۲۰۱۳ص ۲۵۸
۱۱۷	بے نظیر کے کردار کا تنقیدی مطالعہ (میرؔ حسن کی مثنوی سحر البیان)	لائق فاطمہ نقوی	شمارہ یازدہم،۲۰۱۸۔۲۰۱۹ص ۱۷
۱۱۸	قومی جذبوں کا نقیب: **نوبت رائے نظرؔ**	لئیق رضوی	شمارہ ہشتم،۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۱۱

☆ **تذکرہ ادبا**

۱۱۹	**احمد ندیم قاسمی** کی رجائیت پسندانہ فکر	محمد شاہد	شمارہ چہاردہم،۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص ۳۰۷
۱۲۰	کیوں بھلا دیا گیا مجھ کو؟ **(اوپندر ناتھ اشک)**	شہناز صبیح	شمارہ چہاردہم،۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص ۲۰۰
۱۲۱	**اقبال متین** کی افسانہ نگاری	نورینہ پروین	شمارہ ششم،۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص ۱۱۱
۱۲۲	**بشیر الدین احمد** کا طنز و مزاح	ہما مسعود	شمارہ چہارم،۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۸۱
۱۲۳	**بشیشر پردیپ** کے افسانوں میں سائنسی انداز فکر	احمد عبداللہ	شمارہ ششم،۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص ۱۰۴
۱۲۴	**پریم چند** کے افسانوں میں احتجاجی رویہ	نفیس بانو	شمارہ چہارم،۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۷۳
۱۲۵	میدان عمل اور مہاتما گاندھی کے مثالی گاؤں کا نظریہ **(پریم چند)**	ناصحہ عثمانی	شمارہ ششم،۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص ۷۵
۱۲۶	ایک ہمہ جہت فنکار: **خواجہ احمد عباس**	شمیمہ یاسمین	شمارہ دوم،۲۰۰۹۔۲۰۱۰،ص ۱۷۷
۱۲۷	**بیدی** کے افسانوں کی عظمت	گلشن آرا	شمارہ یازدہم،۲۰۱۸۔۲۰۱۹ص ۱۰۳
۱۲۸	**راجندر سنگھ بیدی** کے افسانوں میں ماں کا تصور	فرح ہاشم	شمارہ ششم،۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص ۱۲۱
۱۲۹	'حجام الہ آباد کے': ایک تجزیہ (راجندر سنگھ **بیدی** کا افسانہ)	عرشیہ سرفراز	شمارہ چہاردہم،۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص ۲۹۵
۱۳۰	افسانہ گرم کوٹ کا تجزیاتی مطالعہ **(راجندر سنگھ بیدی)**	یاسمین فاطمہ	شمارہ ششم،۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص ۱۳۶
۱۳۱	**ٹھاکر پونچھی**: خطہ پیر پنچال کا ایک نامور افسانہ نگار	صائمہ قیوم میر	شمارہ چہاردہم،۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص ۳۱۶

۱۳۲	رشید جہاں اور ترقی پسند تحریک	ڈاکٹر راامتیاز احمد	شمارہ چہاردہم،۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص۲۶۳
۱۳۳	دانش گاہ شبلی	عبدالحق	شمارہ دوم،۲۰۰۹۔۲۰۱۰،ص۳۱
۱۳۴	صالحہ عابد حسین کی ناول نگاری: ساتواں آنگن کی روشنی میں	اسلم جمشید پوری	شمارہ ششم،۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص۳
۱۳۴/۱	صفیہ اختر کی مکتوب نگاری	صبیحہ حمید	شمارہ پنجدہم،۲۰۲۲۔۲۰۲۳،ص۶۲
۱۳۵	ہمہ جہت مجاہد قلم: **عبدالماجد دریابادی**	خالدہ خاتون	شمارہ ششم،۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص۱۲۹
۱۳۶	**عصمت چغتائی** کی افسانہ نگاری: ایک جائزہ	زرینہ بیگم	شمارہ ششم،۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص۸۷
۱۳۷	افسانہ نظارہ درمیاں ہے کا تجزیاتی مطالعہ (**قرۃ العین حیدر**)	اقصی امان	شمارہ ششم،۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص۱۴۲
۱۳۸	**قرۃ العین حیدر** کی تصانیف: تہذیبی المیہ کی داستان	ناصحہ عثمانی	شمارہ،۲۰۰۸۔۲۰۰۹،ص۲۰۰
۱۳۹	قرۃ العین حیدر کا افسانوی سفر	لائق فاطمہ نقوی	شمارہ ششم،۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص۵۴
۱۴۰	**قرۃ العین حیدر** کے فکشن پر ایک نظر	اسلم جمشید پوری	شمارہ دہم،۲۰۱۷۔۲۰۱۸ص۳۶
۱۴۱	ترقی پسندی اور رومانیت کا حسین امتزاج: کرشن چندر کے افسانے	اسلم جمشید پوری	شمارہ چہاردہم،۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص۶۰
۱۴۱/۱	تاریخ نویسی میں مکتب ادب کی اہمیت: **مرزا مظہر جان جاناں** کے خطوط کے خصوصی حوالہ کے ساتھ	تبسم نگار	شمارہ پنجدہم،۲۰۲۲۔۲۰۲۳،ص۲۲۸
۱۴۲	تہذیبوں کا زوال ایک تلخ حقیقت (**مشرف عالم ذوقی**)	فرح ہاشم	شمارہ ہشتم،۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص۸۳
۱۴۳	**ممتاز حسین** کے افسانوں کا تنقیدی و تجزیای مطالعہ	عمیر حسامی	شمارہ چہاردہم،۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص۳۲۲
۱۴۴	**نیر مسعود** اور قاری	ریشماں پروین	شمارہ ششم،۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص۳۱
۱۴۵	ادیب کے فرائض	رابندر ناتھ ٹیگور	شمارہ سیزدہم،۲۰۲۰۔۲۰۲۱ پشت سرورق
۱۴۶	اردو کے مشہور ترقی پسند ریڈیائی ڈرامہ نگار	جوہی بیگم	شمارہ چہاردہم،۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص۲۳۴
۱۴۷	ترقی پسند تحریک اور چند اہم ترقی پسند ناول نگار	ارشاد سیانوی	شمارہ چہاردہم،۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص۱۷۱
۱۴۸	ترقی پسند مصنفین	جواہر لال نہرو	شمارہ چہاردہم،۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص۱۰

☆ **تذکرہ مشاہیر**

۱۴۹	مولانا آزاد اپنے خطبات کے آئینے میں	صفت زہرا	شمارہ دہم،۲۰۱۷۔۲۰۱۸ص۱۲۵
۱۵۰	مولانا آزاد کی انقلابی فکر کا تشکیلی دور	عبدالحق	شمارہ،۲۰۰۸۔۲۰۰۹،ص۲۵
۱۵۰/۱	غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ	معراج الدین خاں	شمارہ پنجدہم،۲۰۲۲۔۲۰۲۳،ص۲۲۷
۱۵۱	جوہر بحیثیت مجاہد آزادی	بشری بانو	شمارہ دہم،۲۰۱۷۔۲۰۱۸ص۶۰
۱۵۲	مولانا محمد علی جوہر کا صحافتی نقطہ نظر	کائنات انصاری	شمارہ دہم،۲۰۱۷۔۲۰۱۸ص۱۰۱
۱۵۲/۱	مولانا محمد علی جوہر کی خطوط نگاری	اعظم انصاری	شمارہ پنجدہم،۲۰۲۲۔۲۰۲۳،ص۵۰
۱۵۳	سرسید اور صحافت	صدیقہ جابر	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۱۷۰
۱۵۴	میدان عمل اور مہاتما گاندھی کے مثالی گاؤں کا نظریہ (**پریم چند**)	ناصحہ عثمانی	شمارہ ششم،۲۰۱۳۔۲۰۱۴ ص۷۵

☆ تذکرہ ناقدین

۱۵۵	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک اور احتشام حسین	بشریٰ بانو	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱_۲۰۲۲، ص ۱۵۵
۱۵۶	حالی بحیثیت محقق غالب (یادگار غالب کے حوالے سے)	شبنم حمید	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹_۲۰۲۰ ص ۳۲
۱۵۷	اپنی بات (شمس الرحمٰن فاروقی)	ناصحہ عثمانی	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱ ص ۱۷
۱۵۸	اردو ادب کے ٹرینڈ سیٹر: شمس الرحمٰن فاروقی	محمد کاظم	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۱۲۰
۱۵۹	پیغام (شمس الرحمٰن فاروقی)	تزئین احسان اللہ	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱
۱۶۰	تاثرات (شمس الرحمٰن فاروقی)	عبدالحق	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱
۱۶۱	تاثرات (شمس الرحمٰن فاروقی)	شبنم حمید	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱
۱۶۲	تاثرات (شمس الرحمٰن فاروقی)	عارف نقوی	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱
۱۶۳	تاثرات (شمس الرحمٰن فاروقی)	ریحانہ طارق	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱
۱۶۴	تاثرات (شمس الرحمٰن فاروقی)	عاصم شہنواز شبلی	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱
۱۶۵	تفہیم غالب اور شمس الرحمٰن فاروقی	ارشد جمیل	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹_۲۰۲۰ ص ۱۴۰
۱۶۶	جدیدیت کے مثبت و منفی پہلو اور شمس الرحمٰن فاروقی	اسلم جمشید پوری	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۶۴
۱۶۷	خراج عقیدت (مرحوم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب): منظوم	زرینہ بیگم	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۳۱۹
۱۶۸	شمس الرحمٰن فاروقی اور تفہیم میریات	بشریٰ بانو	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۱۱۲
۱۶۹	شمس الرحمٰن فاروقی اور کئی چاند تھے سرآسماں	احتشام عباس حیدری	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۱۰۳
۱۷۰	شمس الرحمٰن فاروقی بنام رشید حسن خاں	ابراہیم افسر	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۱۵۸
۱۷۱	شمس الرحمٰن فاروقی چند باتیں چند یادیں	محمد اقبال لون	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۲۶۲
۱۷۲	شمس الرحمٰن فاروقی سے گفتگو	محمد مجاہد سید	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۱۳۵
۱۷۳	شمس الرحمٰن فاروقی سے مفصل گفتگو	محمد مجاہد سید	شمارہ دوم، ۲۰۰۹_۲۰۱۰، ص ۶
۱۷۴	شمس الرحمٰن فاروقی کی اکبر شناسی	علی احمد فاطمی	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۲۰
۱۷۵	شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید کے امتیازی پہلو	احمد محفوظ	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۴۵
۱۷۶	شمس الرحمٰن فاروقی: شخص، شاعر اور نقاد	سراج اجملی	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۳۵
۱۷۷	اک دل فگار اٹھا، اک دل فگار رویا (شمس الرحمٰن فاروقی)	لئیق رضوی	شمارہ دوم، ۲۰۰۹_۲۰۱۰، ص ۷۶
۱۷۸	نقد فاروقی کا انفراد اور شعر شور انگیز پر سوالات	سلمان عبدالصمد	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰_۲۰۲۱، ص ۲۱۵
۱۷۹	ترقی پسند فکر کی ایک معتبر آواز: سید محمد عقیل رضوی	طاہرہ پروین	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱_۲۰۲۲، ص ۲۱۹
۱۸۰	کلیم الدین احمد: ایک نفسیاتی جائزہ	شیوبیہ ترپاٹھی	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱_۲۰۱۲ ص ۱۳۴
۱۸۲	اپنی بات (محمود الٰہی)	ناصحہ عثمانی	شمارہ، ۲۰۰۸_۲۰۰۹، ص ۷
۱۸۳	ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی بطور محقق	گیان چند جین	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ _۲۰۱۵ ص ۵

۱۸۴	**محمود الٰہی**: ایک شخصیت ایک دبستان	محمد حسن	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹، ص ۱۷
۱۸۵	ہے میرے تصرف میں یہی مسند ارشاد (**محمود الٰہی**)	محمد حسن	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۴۴
۱۸۶	پروفیسر **محمود الٰہی**: ایک دبستان	عبدالحق	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۵۰
۱۸۷	پروفیسر محمود الٰہی لالہ رست از فیض او دکو ہسار	عبدالحق	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۶۰
۱۸۸	پروفیسر محمود الٰہی باز یافت کی روشنی میں	بشری بانو	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۶۸
۱۸۹	پروفیسر محمود الٰہی تحقیق کے آئینہ میں	فوزیہ بانو	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۸۵
۱۹۰	عکس خطوط محمود الٰہی	محمود الٰہی	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۱۴۹
۱۹۱	محمود الٰہی کی قصیدہ شناسی	فرح ہاشم	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۱۰۳
۱۹۲	محمود الٰہی اور خط تقدیر	محمد شمس الدین	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۱۰۹
۱۹۳	نظم بطور خراج عقیدت (محمود الٰہی)	زرینہ بیگم	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۴
۱۹۴	ادبی سفر: میری تحقیق و تنقید کا (**محمود الٰہی**)	محمود الٰہی	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۱۴۰

☆اردو تنقید: اردو شاعری

۱۹۵	ترقی پسند تحریک اور اردو غزل	یعقوب یاور	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲، ص ۹۲
۱۹۶	ترقی پسند تحریک اور اردو نظم (ایک مجموعی جائزہ)	عبدالحفیظ	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲، ص ۲۰۷
۱۹۷	ترقی پسند تحریک اور جدید فارسی شاعری کے رجحانات	صالحہ رشید	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲، ص ۱۲۲
۱۹۸	شاعری	محمود الٰہی	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۱۴۶
۱۹۹	علم طب اور اردو شاعری	شمس الرحمٰن فاروقی	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹، ص ۷

☆اردو تنقید: اردو نثر

۲۰۰	اپنی بات (ترقی پسند ادب)	ناصحہ عثمانی	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲، ص ۷
۲۰۱	اپنی بات (اردو زبان و ادب)	ناصحہ عثمانی	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹، ص ۱
۲۰۲	اردو ادب میں سفر نامہ جرمنی میں دس روز کے خصوصی حوالے	فرح ہاشم	شمارہ دہم، ۲۰۱۷۔۲۰۱۸ ص ۹۳
۲۰۳	اردو داستان اور موجودہ تہذیب	ناصحہ عثمانی	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰، ص ۱۴۰
۲۰۴	اردو کی دو داستانیں سب رس اور باغ و بہار: ایک تجزیاتی مطالعہ	اسلم جمشید پوری	شمارہ یازدہم، ۲۰۱۸۔۲۰۱۹ ص ۱۳
۲۰۵	اردو ڈراما اور انارکلی	محمود الٰہی	شمارہ ہفتم، ۲۰۱۴ ۔۲۰۱۵ ص ۱۲۲
۲۰۶	اردو ڈراما اور قومی یکجہتی	شہناز صبیح	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰، ص ۱۰۳

۲۰۷	اردو ناول کے سفر میں توبتہ النصوح کی معنویت	شہاب الدین	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹،ص ۱۲۳
۲۰۸	افسانہ میری موت کا تحقیقی تجزیہ	شمیمہ یاسمین	شمارہ ششم، ۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص ۹۸
۲۰۹	تاریخ کے تناظر میں کئی چاند تھے سر آسماں	یوسفہ نفیس	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰۔۲۰۲۱،ص ۱۲۳
۲۱۰	ترقی پسند ادب اور اردو ڈراما	شبنم حمید	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص ۱۰۷
۲۱۱	ترقی پسند تحریک اور اردو ناول	منظور حسین	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص ۳۵۳
۲۱۲	ترقی پسند افسانوں میں عورت کے کردار کی تصویر کشی	زرینہ بیگم	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰،ص ۱۵۴
۲۱۳	ترقی پسند تنقید اور تنقید کا نیا منظر نامہ	علی احمد فاطمی	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص ۳۱
۲۱۴	تذکروں کی تنقیدی اہمیت	بشری بانو	شمارہ ششم، ۲۰۱۳،۲۰۱۴ ص ۲۳
۲۱۵	تحریک آزادی اور اردو ناول	معین الدین جینا بڑے	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹،ص ۷۹
۲۱۶	تخلیقیت کی اخلاقیات	سید عبدالباری	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰،ص ۴۸
۲۱۷	ساحری، شاہی، صاحب قرانی: ایک مطالعہ	ناصحہ عثمانی	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰۔۲۰۲۱،ص ۱۳۵
۲۱۸	طلسم ہوشربا کا مختصر تنقیدی مطالعہ	ناصحہ عثمانی	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص ۱۰۳
۲۱۹	فن داستان پر ایک نظر	ناصحہ عثمانی	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۳۶
۲۲۰	کئی چاند تھے سر آسماں: ایک تجزیہ	شاذیہ غلام انصاری	شمارہ سیزدہم، ۲۰۲۰۔۲۰۲۱،ص ۲۷۱
۲۲۱	لکھنؤ کی تہذیب وثقافت کا عکاس ناول: امراؤ جاں ادا	اسلم جمشید پوری	شمارہ نہم، ۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص ۹۱
۲۲۲	معکوس ترجمہ نگاری	خان حسنین عاقب	شمارہ یازدہم، ۲۰۱۸۔۲۰۱۹ص ۶۲
۲۲۳	ناول لفٹ کے تعلیمی اور سماجی سروکار	نفیس بانو	شمارہ ششم، ۲۰۱۳۔۲۰۱۴ ص ۱۳
۲۲۴	ناول معصومہ اشترا کی ادب کا تخلیقی مظہر	محبوب ثاقب	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱۔۲۰۲۲،ص ۱۴۱
۲۲۵	ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور اردو افسانہ	احمد طارق	شمارہ ششم، ۲۰۱۳۔۲۰۱۴ ص ۴۱

☆اردو زبان

۲۲۶	اپنی بات (اردو زبان)	ناصحہ عثمانی	شمارہ دہم، ۲۰۱۷۔۲۰۱۸ص۔ شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص
۲۲۷	اتر پردیش میں اردو	محمد عبدالقادر	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰،ص ۹۳
۲۲۸	اردو زبان اور ہندوستان کا دستور	محمد عبدالقادر	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹،ص ۱۳۶
۲۲۹	جموں کشمیر میں اردو کے ابتدائی آثار	رضوانہ شمسی	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص ۲۳

☆صحافت

۲۳۰	ابلاغ وترسیل میں برقی صحافت کے اہم ذرائع ریڈیو اور ٹیلی ویژن	فرح ہاشم	شمارہ چہارم،۲۰۱۱۔۲۰۱۲ص۱۶۴
۲۳۱	اردو میں ماس میڈیا کی موجودہ صورت حال	عبدالحق	شمارہ،۲۰۰۸۔۲۰۰۹،ص۴۰
۲۳۲	اودھ پنچ کی ادبی وصحافتی خدمات	فرح ہاشم	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۱۶۴
۲۳۳	افق کی صحافتی خدمات	زرینہ بیگم	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۱۱۷
۲۳۴	افق کی صحافتی وادبی خدمات	ارشاد احمد	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۶۶
۲۳۵	انیسویں صدی کا ادبی اور صحافتی سفر	ریحان حسن	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۳
۲۳۶	انیسویں صدی کا ادبی اور صحافتی سفر: ایک تجزیہ	شمشاد بی	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۴۳
۲۳۷	انیسویں صدی کا لکھنؤ: تاریخ، ادب، صحافت کے آئینہ میں	سفینہ ساوی	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۲۳۹
۲۳۸	انیسویں صدی کی صحافت میں 'تاریخ بغاوت ہند' کا حصہ	نزہت فاطمہ	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۱۵۷
۲۳۹	انیسویں صدی کے ادبی وصحافتی سفر کا ایک راہی: دوارکا پرشاد افق	نفیس بانو	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۷۵
۲۴۰	انیسویں صدی کے صحافتی سفر پر ایک نظر	زینت رضا	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۱۵۲
۲۴۱	انیسویں صدی میں ادب وصحافت ایک تعارف	شاہد خان	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۱۴۴
۲۴۲	انیسویں صدی میں اردو صحافت	ابرار رحمانی	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۳۵
۲۴۳	نیسویں صدی میں اردو صحافت	روپہلا ثاقب	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۲۲۴
۲۴۴	انیسویں صدی میں اردو صحافت کی سمت ورفتار	سلمان عبدالصمد	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۲۱۷
۲۴۵	تہذیب الاخلاق کی ادبی وسماجی خدمات	رضوانہ شمسی	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۱۳۰
۲۴۶	تہذیب نسواں کی خدمات	نزہت فاطمہ	شمارہ ہشتم ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ص۱۰۲
۲۴۷	دبستان لکھنؤ کا ادبی وصحافتی منظر نامہ موجودہ تناظر میں	ندیم اشرف	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۱۰۹
۲۴۸	دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے (منشی دوارکا پرشاد لکھنوی)	عاصم شہنواز شبلی	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۴۳
۲۴۹	دوارکا پرشاد افق: ادب وصحافت کے آئینے میں	عرشیہ سرفراز	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۲۰۵
۲۵۰	سرزمین دکن میں اردو صحافت	جوہی بیگم	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۱۳۶
۲۵۱	سرسید اور صحافت	صدیقہ جابر	شمارہ نہم،۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص۱۷۰
۲۵۲	شب خون: جدیدیت کا علمبردار	لئیق رضوی	شمارہ سیزدہم،۲۰۲۰۔۲۰۲۱،ص۸۸
۲۵۳	شمس الرحمٰن فاروقی بحیثیت ادبی صحافی 'شب خون' کے حوالے سے	ارشد جمیل	شمارہ سیزدہم،۲۰۲۰۔۲۰۲۱،ص۲۳۵

۲۵۴	لکھنؤ میں اردو اخبارات کی روایت اور نظم اخبار	محمد افضل	شمارہ نہم، ۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص ۱۸۴
۲۵۵	مرقوم الفاظ کی پرواز (رسالہ نقش نو)	یوسف نفیس	شمارہ دہم، ۲۰۱۷۔۲۰۱۸
۲۵۶	منشی دواریکا پرشاد ایک منفرد صحافی	وضاحت حسین رضوی	شمارہ نہم، ۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص ۳۰
۲۵۷	منظوم صحافت کے موجد افق لکھنوی	لئیق رضوی	شمارہ نہم، ۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص ۸۵
۲۵۸	ہندوستان میں فارسی صحافت (انیسویں صدی میں)	عابدہ	شمارہ نہم، ۲۰۱۶۔۲۰۱۷ ص ۱۹۹

☆اردو تحقیق

۲۵۹	معاصر تحقیق وتدوین کے مسائل	نسیم احمد	شمارہ، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹، ص ۵۳

☆تاریخ اردو ادب

۲۶۰	اردو ادب اور مغلیہ دور کے شہری مراکز	یوسف نفیس	شمارہ دوم، ۲۰۰۹۔۲۰۱۰، ص ۱۰۹
۲۶۱	اردو میں ادب اطفال: ایک جائزہ	نازیہ عرشی	شمارہ چہارم، ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ ص ۱۷۱
۲۶۲	۱۹ویں صدی کا ادبی لکھنؤ اور منشی دوارکا پرساد افق	بشری بانو	شمارہ ہشتم ۲۰۱۵۔۲۰۱۶ ص ۱۷

☆مکتوبات

۲۶۲/۱	۱۸۵۷ اور **غالب** کے خطوط	اسلم جمشید پوری	شمارہ دوازدہم، ۲۰۱۹۔۲۰۲۰ ص ۲۲
۲۶۲/۲	اردو میں خطوط نگاری کی روایت	عبدالحفیظ	شمارہ پجند ہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۱۹۱
۲۶۲/۳	اردو میں مکتوب نگاری: آغاز وارتقاء اور زوال	اسلم جمشید پوری	شمارہ پجند ہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۱۴
۲۶۲/۴	کبرالہ آبادی فن خطوط نویسی کے آئینے میں	شیخ عمران	شمارہ پجند ہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۷۰
۲۶۲/۵	انشائے رشیدی	عبدالحق	شمارہ پجند ہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۷
۲۶۲/۶	بشیرالدین احمد کی ادبی خدمات	ہما مسعود	شمارہ پجند ہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۳۵
۲۶۲/۷	حسرت موہانی خطوط کے آئینے میں	فرح ہاشم	شمارہ پجند ہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۲۱۰
۲۶۲/۸	خطوط اقبال میں تصوف کے مباحث	طالب اکرام	شمارہ پجند ہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۱۴۲
۲۶۲/۹	خطوط غالب کی ادبی اہمیت	سراج انور محمد میراں	شمارہ پجند ہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۲۵۵
۲۶۲/۱۰	خطوط غالب معلومات کا گنجینہ	امتیاز احمد علی	شمارہ پجند ہم، ۲۰۲۲۔۲۰۲۳، ص ۲۱۹

۲۶۲/۱۱	خطوط نگاری کی روایت	اقصی امان	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۲۸۱
۲۶۲/۱۲	سرسید کا خواب اور ان کی کاوشیں	محمد فرحان دیوان	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۸۱
۲۶۲/۱۳	صفیہ اختر کی مکتوب نگاری	صبیحہ سید	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۶۲
۲۶۲/۱۴	غالب کے خطوط میں زندگی کی کہانیاں	طاہرہ پروین	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۹۹
۲۶۲/۱۵	غالب کے فارسی خطوط کا مختصر تذکرہ	شبانہ عزیز	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۱۵۷
۲۶۲/۱۶	غبار خاطر کا تنقیدی جائزہ	معراج الدین خاں	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۲۲۷
۲۶۲/۱۷	مجاہدین آزادی کے کچھ اہم تاریخی خطوط	نزہت فاطمہ	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۱۷۴
۲۶۲/۱۸	مرزا غالب کی خطوط نگاری	محمد سفیان احمد	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۲۹۰
۲۶۲/۱۹	مکتوب نگاری اور بھوپال	یسری راحت	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۲۸۷
۲۶۲/۲۰	مولانا محمد علی جوہر کی خطوط نگاری	اعظم انصاری	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۵۰
۲۶۲/۲۱	نکتہ داں نکتہ سنج، نکتہ شناس: پروفیسر محمود الٰہی (خطوط محمود الٰہی)	بشری بانو	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۱۰۸

☆ **تاریخ ہند**

۲۶۳	۱۸۵۷ اور غالب کے خطوط	اسلم جمشید پوری	شمارہ دوازدہم ۲۰۱۹-۲۰۲۰ ص ۲۲
۲۶۴	۱۸۵۷ کی تحریک آزادی اور مولانا باقر	عباس رضا نیر	شمارہ، ۲۰۰۸-۲۰۰۹، ص ۱۴۹
۲۶۵	اردو ادب اور مغلیہ دور کے شہری مراکز	یوسف نفیس	شمارہ دوم، ۲۰۰۹-۲۰۱۰، ص ۱۰۹
۲۶۶	انیسویں صدی کی صحافت میں 'تاریخ بغاوت ہند' کا حصہ	نزہت فاطمہ	شمارہ نہم، ۲۰۱۶-۲۰۱۷ ص ۱۵۷
۲۶۷	پہلی جنگ آزادی اور غالب	ناصحہ عثمانی	شمارہ دہم، ۲۰۱۷-۲۰۱۸ ص ۷۰
۲۶۷/۱	تاریخ نویسی میں مکتب ادب کی اہمیت: مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط کے خصوصی حوالے کے ساتھ	تبسم نگار	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۲۳۸
۲۶۷/۲	مجاہدین آزادی کے کچھ اہم تاریخی خطوط	نزہت فاطمہ	شمارہ پنجدہم، ۲۰۲۲-۲۰۲۳، ص ۱۷۴

☆ **سماجیات**

۲۶۸	ترقی پسند تحریک اور تانیثی مسائل (منظر اور پس منظر)	نفیس بانو	شمارہ چہاردہم، ۲۰۲۱-۲۰۲۲، ص ۱۳۲
۲۶۹	لکھنؤ کی عزہ داری اور اس سے وابستہ چند پہلو	کائنات انصاری	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵-۲۰۱۶ ص ۱۲۵
۲۷۰	ہندوستان کے مسلم معاشرہ پر تصوف کے اثرات	صدیقہ جابر	شمارہ ہشتم، ۲۰۱۵-۲۰۱۶ ص ۹۱

☆☆☆

اشاریہ مضمون نگار

ابرار رحمانی۔۲۴۲،

ابراہیم افسر۔۳۲،۶۳،۶۹،۱۷۰،

اثر، محمد علی۔۲۲،

احسان۔۱۱۰،

احسان حسن لکھنوی۔۲۳،۴۱،

احمد طارق۔۲۲۵،

احمد عبداللہ۔۱۲۳،

احمد محفوظ۔۹۶،۱۷۵،

ارشاد احمد۔۲۳۴،

ارشاد سیالوی۔۱۴۷،

ارشد جمیل۔۲،۴۵،۱۶۵،۲۵۳،

اسلم جمشید پوری۔۴۳،۶۷،۹۷،۱۳۴،۱۴۰،۱۴۱،۱۶۶،۲۲۱،۲۶۳،

اقصیٰ امان۔۱۳۷،

اکرام الدین، خواجہ۔۹۳،

امتیاز احمد چودھری۔۵۳،

بشریٰ بانو۔۵،۶۱،۱۵۱،۱۵۵،۱۶۸،۱۸۸،۲۶۲،

تزئین احسان اللہ۔۱۵۹،

توقیر احمد خاں۔۱۹،

ٹیگور، رابندر ناتھ۔۱۴۵،

جوہی بیگم۔۱۴۶،۲۵۰،

حیدری، ای۔اے۔۲۴،۱۶۹،

خالدہ خاتون۔۳۳،۱۱۵،۱۳۵،

خدیجہ آئین۔۱۱۲،

داؤد احمد۔۱/۷۰،

رشدی قدسیہ۔۱۱،

رضوانہ سمشی۔۲۲۹،۲۴۵،

رضوی، محمد ارشد۔۶۸،

رضوی، وضاحت حسین۔۲۵۶،

رضیہ کاظمی ۔۲۶،
رو پہلا ثاقب ۔۲۴۳،
ریحان حسن ۔۲۳۵،
ریحانہ طارق ۔۷۷،۱۶۳،
ریشماں ۔۱۰۱،
ریشماں پروین ۔۴۴
زرینہ بیگم ۔۳،۲۰،۲۵،۳۵،۵۹،۷۰،۷۳،۹۰،۱۰۸،۱۳۶،۱۶۷،۱۹۳،۲۱۲،۲۳۳،
زیبا محمود ۔۱۰۶،
زینت رضا ۔۲۴۰،
سراج اجملی ۔۹۸،۱۷۶،
سراج انور محمد میراں ۔۴/۶۴،۹/۲۶۳،
سفیان احمد، محمد ۔۵/۶۴،۱۸/۲۶۲،
سفینہ ساوی ۔۲۱،۲۳۷،
سلمان عبدالصمد ۔۱۷۸،۲۴۴،
شاذیہ غلام انصاری ۔۶۰،۲۲۰،
شاہد خاں، محمد ۔۱۳،۲۴۱،
شبانہ عزیز ۔۱۷،۲۷،۵۲،۵۶،۵۷،۱۰۴،
شبلی، عاصم شہنواز ۔۳۸،۹۵،۱۶۴،۲۴۸،
شبنم حمید ۔۴۶،۱۵۶،۱۶۱،۲۱۰،
شبنم رضوی ۔۱۰۲،
شمشاد بی ۔۲۳۶،
شمیمہ یاسمین ۔۳۷،۱۲۶،۲۰۸،
شہاب الدین ۔۲۰۷،
شہناز صبیح ۔۲۹،۸۹،۱۲۰،۲۰۶،
شیخ عمران ۔۱/۲۰،۴/۲۶۳،
شیو یہ ترپاٹھی ۔۱۸۰،
صالحہ رشید ۔۵۰،۶۲،۱۹۷،
صالحہ صدیقی ۔۳۴،
صائمہ قیوم میر ۔۱۳۱،
صبیحہ حمید ۔۱/۱۳۴،

صبیحہ سید۔۱۳/۲۶۳،
صدیقہ جابر۔۱۵۳،۲۵۱،۲۷۰،
صفت زہرا۔۱۴۹،
طالب اکرام محمد۔۱۰،۱۸،
طاہرہ پروین۔۱۷۹،
عابدہ۔۲۵۸،
عابدی، ایس۔این۔ایس۔۱۰۷،
عارف نقوی۔۱۶۲،
عارفہ بیگم۔۱۱۶،
عاقب، خان حسنین۔۲۲۲،
عالیہ بیگم۔۶۶،
عبدالباری، سید۔۸۴،۲۱۶،
عبدالحفیظ۔۱۹۶،
عبدالحق۔۸،۵۱،۱۳۳،۱۵۰،۱۶۰،۱۸۶،۱۸۷،۲۳۱،
عبدالرحمٰن۔۹،
عبدالقادر جعفری۔۱۵،۲۸،۵۵،۸۲،۹۴،
عرشیہ سرفراز۔۱۲۹،۲۴۹،
عصمت نیلوانصاری۔۱،۷،
عمیر حسامی۔۱۴۳،
فاروقی، شمس الرحمٰن۔۳۰،۳۶،۸۱،۹۲،۱۹۹،
فاطمی، علی احمد۔۷۱،۸۵،۱۷۴،۲۱۳،
فرح ہاشم۔۱۰۹،۱۲۸،۱۴۲،۱۹۱،۲۰۲،۲۲۰،۲۳۲،
فرحان دیوان، محمد۔۱/۱۵۳،۱۲/۲۶۳،
فریس، نسیم احمد۔۸۳،
فوزیہ بانو۔۴،۸۸،۱۸۹،
فیروز دہلوی۔۷۲،
کائنات انصاری۔۱۱۴،۱۵۲،۲۶۹،
گلشن آرا۔۱۲۷،
لائق فاطمہ۔۳۱،۷۹،۱۱۷،۱۳۹،
لون، محمد اقبال۔۱۷۱،

لئیق رضوی۔۴۹، ۱۱۸، ۱۷۷، ۲۵۲، ۲۵۷،
مامون ایمن۔۳۹، ۴۰، ۵۸، ۶۵، ۷۸،
محبوب ثاقب۔۲۲۴،
محمد حسن۔۱۸۴، ۱۸۵،
محمد شاہد۔۴۸، ۱۹۹،
محمد شمس الدین۔۱۹۲،
محمد عبدالقادر۔۲۲۷، ۲۲۸،
محمد کاظم۔۱۵۸،
محمد مجاہد سید۔۱۷۲، ۱۷۳،
محمود الٰہی۔۱۴، ۱۹۰، ۱۹۴، ۱۹۸، ۲۰۵،
معین الدین جینا بڑے۔۲۱۵،
منظور حسین۔۲۱۱،
نازیہ عرشی۔۲۶۱،
ناصحہ عثمانی۔۴۲، ۴۴، ۷۵، ۷۶، ۱۰۳، ۱۲۵، ۱۳۸، ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۸۲، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۳، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۶، ۲۶۷،
ندرت محمود۔۱۲، ۱۶،
ندیم اشرف۔۲۴۷،
نرجیس فاطمہ، سیدہ۔۴۷،
نزہت فاطمہ۔۲۳۸، ۲۴۶، ۲۶۶،
نسیم احمد۔۲۵۹،
نشیط، سید یحیٰ۔۶،
نفیس احمد۔۱۱۱، ۱۱۳، ۱۲۱،
نفیس بانو۔۸۶، ۹۹، ۱۲۴، ۲۲۳، ۲۳۹، ۲۶۸،
نگینہ جبیں۔۱۰۵،
نورینہ پروین۔۹۱،
نہرو، جواہر لال۔۱۴۸،
نیرّ، عباس رضا۔۲۶۴،
ہما محمود۔۸۷، ۱۲۲،
ہما مسعود۔۱/۱۲۲، ۶/۲۶۳،
یاسمین فاطمہ۔۱۳۰،
یسری راحت۔۱۹/۲۶۲،

یعقوب یاور۔۱۹۵،
یوسفہ نفیس۔۶۴،۷۴،۸۰،۱۰۰،۲۰۹،۲۵۵،۲۶۰،۲۶۵،

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلباء کو وظائف ☆ اشاعت کتب ☆ صوبے کے رجسٹر ڈ عوامی کتب خانوں / دار لمطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو ادباء کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو کتب پر انعامات ☆ مسودات کی طباعت کے لئے مالی امداد ☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد ☆ اردو کتابت اسکول ☆ اردو کوچنگ سینٹر ☆ اردو کمپیوٹر سینٹر ☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی ''اکادمی'' اور ماہانہ ''خبر نامہ'' کی اشاعت ☆ سیمینار سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد ☆ قلیتی طلباء کو سول سروسیز کی کوچنگ کے لئے اردو آئی۔اے۔ایس اسٹڈی سینٹر واقع 'پارہ' موہان روڈ، لکھنو ☆ بچوں کا رسالہ ''باغیچہ'' کی اشاعت، اردو ماس کمیونیکیشن اینڈ میڈیا سینٹر، واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر لکھنو ☆ ☆ ☆

اتر پردیش اردو اکادمی کی اہم مطبوعات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت	نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت
۱۔	ساغر خیامی	ناشر نقوی	215/=	۲۱۔	تنقیدی نظریات (دوم)	سید احتشام حسین	183/=
۲۔	مظہر امام	امام اعظم	208/=	۲۲۔	توبۃ النصوح	ڈپٹی نذیر احمد	92/=
۳۔	انتظار شناسی	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	270/=	۲۳۔	گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ	عشرت علی صدیقی	107/=
۴۔	پیغام آفاقی	خان محمد آصف	224/=	۲۴۔	ابن الوقت	ڈپٹی نظیر احمد	126/=
۵۔	سالک لکھنوی	پروفیسر منظر حنفی	216/=	۲۵۔	بادشاہ نصیر الدین	مرزا وجاہت حسین	42/=
۶۔	متین طارق باغپتی	ڈاکٹر زکی طارق	216/=	۲۶۔	حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	100/=
۷۔	پروفیسر قمر رئیس	پروفیسر توقیر احمد خان	245/=	۲۷۔	ناٹک ساگر	نور الٰہی و محمد عمر	163/=
۸۔	ڈاکٹر اسعد بدایونی	حسیب سوز	245/=	۲۸۔	تنقید اور عملی تنقید	سید احتشام حسین	183/=
۹۔	حفیظ میرٹھی	ڈاکٹر تابش مہدی	245/=	۲۹۔	پنجاب میں اردو	محمود شیرانی	150/=
۱۰۔	عابد سہیل	ڈاکٹر صبیحہ انور	245/=	۳۰۔	انتخاب مضامین سید سلیمان ندوی	مرتبہ صباح الدین عبد الرحمٰن	30/=
۱۱۔	جوگیندر پال	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	287/=	۳۱۔	انتخاب کلام فراق گورکھپوری	مرتب ڈاکٹر افغان اللہ خاں	86/=
۱۲۔	تعلیم نسواں	نسرین احمد	170/=	۳۲۔	عصمت شناسی	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	248/=
۱۳۔	معیاری نثر و نظم (اول)	حامد ندیم	73/=	۳۳۔	ادب پارے نثر	سید احتشام حسین	45/=
۱۴۔	معیاری نثر و نظم (دوم)	حامد ندیم	85/=	۳۴۔	ادب پارے نظم	سید احتشام حسین	45/=
۱۵۔	مثنوی سحر البیان	میر حسن	108/=	۳۵۔	منتخب غزلیں	مجلس مشاورت	65/=
۱۶۔	مثنوی گلزار نسیم	دیا شنکر نسیم	70/=	۳۶۔	منتخب نظمیں	مجلس مشاورت	60/=
۱۷۔	اعتبار نظر	سید احتشام حسین	105/=	۳۷۔	ملک زادہ منظور احمد	انور جلال پوری	263/=
۱۸۔	انیسیات	سید مسعود حسن رضوی	91/=	۳۸۔	کلیم عاجز	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	173/=
۱۹۔	پریم چند رنئے ناظر میں	پروفیسر علی احمد فاطمی	80/=	۳۹۔	ندا فاضلی	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/=
۲۰۔	تنقیدی نظریات (اول)	سید احتشام حسین	196/=	۴۰۔	سید حامد	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	140/=

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لئے رابطہ کریں:
سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر لکھنو۔226010
فون نمبر۔0532-4022924 سیلس ڈپو موبائل:7081007078
E-mail:upurduakademi3@gmail.com

ISSN 2320-3781

Naqsh-e-Nau

Published by : Dept. of Urdu
Hamidia Girls' Degree College, Prayagraj
University of Allahabad